کامریڈ رگھوناتھ گھئی کے نام

TANAZUR

Est. 1977. R.No.40608/83

تناظر

عصری ادب، آرٹ اور کلچر کا باشعور ترجمان

شمارہ
۳۲-۳۱

رگھوناتھ گھئی

कौमी काउन्सिल बराए फरोग-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

M.O.HRD, Dept. of Secondary & Higher Education, Govt. of India, West Block-1, R.K. Puram, N.Delhi-66.

Ph.: 6109746, 6169416 Fax: 6108159 E-mail:urducoun@ndf.vsnl.net.in

قومی اردو کونسل کی نئی مطبوعات

بھارت کا آئین	کلیات پریم چند	بھارت 2001
(تیسرا ایڈیشن) آئین ہند کی مکمل تفصیلات ترمیم و اضافہ کے ساتھ۔ صفحات: 480، قیمت: 125 روپے	(22 جلدوں پر مشتمل) مرتب: مدن گوپال چودہ جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں چودہ جلدوں کی قیمت: 2061 روپے	حوالہ جاتی سال نامہ مرتب: قومی اردو کونسل صفحات: 865، قیمت: 250 روپے
ہندستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں	**ہندستان کا نظام جمال بدھ جمالیات سے جمالیات غالب تک**	**جان کمپنی سے جمہوریہ تک جدید ہندستان کی کہانیاں**
گوپی چند نارنگ صفحات: 364، قیمت: 200 روپے	(جلد اول تا سوم) شکیل الرحمن مکمل سیٹ کی قیمت: 1311 روپے	مشیر الحسن صفحات: 345، قیمت: 114 روپے
جامع تاریخ ہند	**تاریخ تحریک آزادی ہند**	**مسلم قانون**
(عہد سلطنت) محمد حبیب۔ خلیق احمد نظامی صفحات: 1000، قیمت: 306 روپے	(جلد اول تا چہارم) تارا چند مکمل سیٹ کی قیمت: 794 روپے	(جلد اول) سید امیر علی صفحات: 762، قیمت: 265 روپے
فرہنگ اصطلاحات ترسیل عامہ	**مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت**	**پریم چند سوانح با تصویر**
مرتب: قومی اردو کونسل صفحات: 154 قیمت: 62 روپے	ابوالکلام قاسمی صفحات: 382 قیمت: 124 روپے	کمل کشور گوئنکا صفحات: 104 قیمت: 54 روپے
تشریحی تصاویر اشکال عظام	**قومی زبان**	**اردو خوش نویسی**
حکیم کبیر الدین صفحات: 312، قیمت: 66 روپے	زیڈ۔ اے۔ احمد صفحات: 253، قیمت: 76 روپے	انیس چشتی۔ انیس صدیقی صفحات: 136، قیمت: 105 روپے
زراعتی انکشافات	**مسلمانوں کے سیاسی افکار اور ان کا انتظام حکومت**	**انیس (سوانح)**
محمد شفیع صفحات: 260، قیمت: 192 روپے	ہارون خان شیروانی صفحات: 290، قیمت: 82 روپے	نیر مسعود صفحات: 472، قیمت: 174 روپے

نوٹ: اس کے علاوہ اصطلاحات، ادبیات، تاریخ، سائنس، طب، بچوں کے ادب پر بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ طالب علموں و اساتذہ کے لئے 40% رعایت۔

تناظر، دہلی

[اُردو اینتھالوجی]

عصری ادب آرٹ اور ثقافت کا باشعور ترجمان

خصوصی شمارہ کامریڈ رگھوناتھ گھئی کے نام

مدیران

بلراج ورما، قمر جمالی، محمود حامد

منتظم بھگتی ورما

پبلشر

تناظر پبلی کیشنز، 24 ڈی پاکٹ 3، میور وِہار فیز ا دہلی ۔ 91

[مشمولات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ یہ جریدہ ہر قسم کی جماعتی سیاسیات سے پاک ہے]

اشاعت 2002ء

شمارہ : 31

کمپوزنگ : محمد اسلام خاں

طباعت : کتابی دنیا دہلی۔٦

ناشر : تناظر پبلی کیشنز، 24 ڈی پاکٹ 3، میور وہار فیز ا دہلی۔ 91

ٹیلی فون : 2712319

خط و کتابت اور مضامین بھیجنے کا پتہ

ادارہ تناظر

ترسیل زر کا پتہ : منیجر تناظر پبلی کیشنز

قیمت : 200 روپے

بیرون ممالک : امریکی ڈالر 10 برطانوی پاؤنڈ 5

Printed by :
Kitabi Duniya
1555,Gali Nawab Mirza,Turkman Gate, Delhi-6 (INDIA)
E-mail:kitabiduniya@rediffmail.com
Phone:-3288452

ترتیب

تقریظ، تنقید و تحقیق

انشائیے

تنقیدی مطالعے

اپنی بات

زِندگی کا دارو مدار دراصل ان ہی دو لفظوں پر ہے۔ ● سکون اور ● تحرک

سکون اور تحرک دو ایسے ضدین ہیں جیسے ''زمین و آسمان''، ''تاریکی و روشنی''، ''خیر و شر'' یا نر اور مادّہ۔ زندگی کا دارومدار دراصل ان ہی دو لفظوں پر منحصر ہے۔ خالق کائنات نے زمین و آسمان بنائے اور ان کی رفاقت کے لیے یہ سارے وسیلے، یہ پیڑ، یہ پہاڑ، دریا اور آتش فشاں بنائے تا کہ تخلیق میں ترتیب کا ایک سلسلہ جڑا رہے۔ جس دن یہ باہمی ربط ٹوٹے گا سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ سکون و تحرک کی ساری نشانیاں مٹ جائیں گی، شناخت اور تخصیص کی سب علامتیں ٹوٹ جائیں گی۔ سب کچھ پھر ایک جیسا ہو گا۔ نہ زمین و آسمان نہ تاریکی نہ روشنی، نہ خیر و شر، نہ نر اور مادہ۔

بس باقی اللہ اور سب ہُو ....

ابتدا میں جب سکون، تحرک دونوں ایک ضابطے کی صورت منضبط نہیں تھے تو کچھ بھی نہ تھے... دراصل کائنات کو وجود میں لانے کے لیے ہی ان ضوابط کی تشکیل ہوئی... قدیم یونانی فلسفے میں اس بات کی گواہی ملتی ہے کہ ابتدائے آفرینش میں نر اور مادہ کی تخصیص سے پہلے دوجنسیت ہی عالم وجود میں تھی۔ خود (Herma Phrodit) ترکیب یونانی دیوتا (Herma) اور دیوی (Aphroditi) کے ناموں کا مرکب ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ''دوجنسیت'' زندگی کا وہ زمانہ تھا جب جسم خود ہی طالب، اور خود ہی ''مطلوب'' تھا یہی فلسفہ ہمیں ہندو دیومالائی قصوں میں ملتا ہے۔ خاص طور پر جب شیوا اور وشنو کی

شکتیوں کا ذکر ہوتا ہے تو یہ بات اور واضح نظر آتی ہے کہ دیوتا بیک وقت نر بھی تھے اور مادہ بھی۔ مثلاً ایلی فنٹا کے مندر میں شیو کا جو بت ہے اس کے تین چہرے ہیں۔ ایک مردانہ ،دوسرا نسوانی اور تیسرا دو صفات سے ماورا۔

سائنسی حوالے سے یہ بھی ثبوت مل چکا ہے کہ ابتدا میں نر اور مادہ ایک ہی جسم میں موجود تھے۔ جب الگ ہوئے تو انھیں برہنگی کا احساس ہوا۔ دونوں نے خود کو الگ ''اکائی'' مانا۔

''سکون''،''تحرک'' کی طرف مائل ہوا...پھر ہلچل ہوئی...حرکت نے رحمت کی بوندیں برسائیں...زمین نے اسے اپنے اندر جذب کیا...ہری بھری کونپلیں پھوٹیں...اور...

یہ جہان...

جہاں آباد ہو گیا۔

اس تمہید سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ''سکون'' اور ''تحرک'' جب تک ایک دوسرے میں ضم تھے ''سکوت'' تھا۔

الگ ہوئے...تو زندگی کا وجود ہوا۔ لہٰذا سکون و تحرک، خیر و شر دراصل زندگی کا منبع ہوئے...

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ زندگی جو پچھلی صدیوں سے ہمارے ساتھ چل رہی ہے اپنی تمام تر تبدیلیوں، رعنائیوں اور ورثوں کے ساتھ، جس میں بلاشبہ ''زبان'' بھی ایک ورثہ ہے، اور جو مسلسل تغیر پذیر ہونے کے باوجود اپنا ایک مسلم وجود رکھتی ہے۔

کیا وہ اچانک اپنے جسم سے الگ ہو جائے گی...؟

یا پھر...

''سکون'' اور ''تحرک'' کی آمیزش کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگا...؟

شہر، گلیوں، بازاروں میں آویزاں تختوں پر اب نام کم اور مخفف Abbriviation زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔

کمپیوٹر کے عہد میں لفظ صورت بدل چکے ہیں۔ اب ہم چوہے کو Mouse، دانت کاٹنا کو Bite تقریر یا نطق کو Speech، چشمے یا فوارے کو Fount نہیں کہتے۔

تو کیا یہ مان لیں کہ ''سکون'' پھر سے مائل بہ ''تحرک'' ہے...؟؟؟؟

——— قمر جمالی

ماتمی قرارداد بروفاتِ حسرت آیات جنابِ رگھوناتھ گھئی ناتھ

ہم جملہ اراکینِ حلقۂ تشنگانِ اَدب نئی دہلی، اُردو زُبان سے بے حد پیار کرنے والے، مشہور ادیب و شاعرِ جنابِ رگھوناتھ گھئی ناتھ صاحب کی وفاتِ پُر ملال پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ اُن جیسے عالم، محبِ زباں اور ایک نیک دِل اِنسان کی وفات سے، اُردو شعر و ادب کی دُنیا کو ایک بہت بڑا نقصان ہوا ہے اور محبانِ شعر و ادب میں سے ایک خاص اور اہم فرد کی نفی ہوئی ہے۔

جناب رگھوناتھ گھئی صاحب کی قیادت میں اُردو کی ایک چھوٹی سی انجمن ''شامِ یاراں'' کے بہت سے پروگرام ہوئے اور اُن کے دولت کدہ پر، دُوسرے ہفتہ کے روز ہر ماہ کئی سال تک جھنڈے والان نئی دہلی میں باقاعدہ نشستیں منعقد ہوتی رہیں اور دہلی اور گرد و نواہ کے بہت سے بڑے ادیب اور شاعر اِن نشستوں میں شرکت فرماتے رہے۔ گھئی صاحب کے جھنڈے والان والی رہائش گاہ کی نشستیں جب تک وہ وہاں رہے، ہوتی رہیں۔

گھئی صاحب 15 راکتوبر کی صُبح کو اِس دارِ فانی سے کُوچ کر گئے اُن کی عُمر ۸۴ سال تھی لیکن تادمِ حیات ہر طرح سے ٹھیک تھے کہ اچانک دِل کا دورا پڑا اور بس وہ منحوس گھڑی آ گئی۔

ہم دُعا گو ہیں کہ خدائے برتر اُن کی آتما کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے کر اُنہیں امر شانتی پردان کرے اور لواحقین کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی شکتی دے اور ہمارے دِلوں میں اُن کا احترام اور اُن کی یاد برقرار رکھے۔ آمین،

سیمابؔ سُلطانپوری

جنرل سکریٹری حلقۂ تشنگانِ ادب

نئی دہلی

اُردو کا بھر تری ہری

چل بسا چھوڑ کر مُجھے تنہا
حُسنِ مِعیار برتری تھا وہ

درحقیقت تھا ایک دانشور
لگتا تھا مردِ سرسری تھا وہ

یار یاروں کا دلِ فِگاروں کا
شوق کی جلوہ گُستری تھا وہ

تھا رگھوناتھ اہلِ دِل کے ساتھ
عشق کا نازِ دِلبری تھا وہ

کرشن موہن نے یہ کیا محسوس
اُردو کا بھرتری ہری تھا وہ

کرشن موہن

سوورگیہ رگھوناتھ گھئی

شامِ یاراں کا موجد و خاتم

ادب نواز
اَدیبوں کا محسنِ یکتا
جو سب کی راہ میں پلکیں بچھائے رہتا تھا
کہیں نہ کیوں اُسے الفاظِ خوب و دیگر میں
اس ایک محفلِ رنگیں کا مُوجد و خاتم
جسے پکارتے آئے ہیں، ''شام یاراں''، ہم:
سوا گتوں کی وہ منزل
ضیافتوں کی بساط
جو اہتمام سے اکثر سجائی جاتی تھی
ہرے درختوں کے اک خوشگوار پہلو میں
برنگِ گوشۂ صد عافیت، یعنی
بلند و بالا عمارت کے سبز آنگن میں
جو فخر و نازشِ تعمیر تھی
خدا رکھے
ضرور گرد و نواح ہائے جھنڈے والاں میں
وہ خاندانی شرافت،
وجاہتِ شخصی
عیارِ اعلیٰ کی تربیت، تعلیم
مہاجرین کے انبوہ میں، یکتا

اُدھر وطن کی ہری اور بھری
سرزمینِ جدّی سے
وقار و وضع سے بھرپور ساتھ لایا تھا
تو لازمی تھا
اِدھر کی فضائے رنج و محن کش مکش کے چکر میں
ہوش و حواس سے
جوش و خروش سے گویا
وہ اجتہاد سے اور پُورے اعتماد کے ساتھ
بھری سماج میں، بے خوف، باریاب ہوا
اور کامیاب ہوا
دل و دماغ کی ثروت
جو اس کے ذاتی، خداداد اختیار میں تھی
ثقافتی رُخ و رجحان کے تقاضوں سے
متاعِ شعر و ادب کے لطیف پیکر میں آشکار ہوئی
مشاہدات فراواں کہ تجربات وسیع
قدم قدم پہ جو اس کے سفر میں ساتھ رہے
بساطِ نظم خصوصاً کلام میں اس کے
ہمہ جہات، رُخِ فکر و فلسفہ کے ساتھ
اسی کی نذر ہوئی، نثار ہوئی
خیالِ حسن میں کیا کیا نہ رنگِ عشق بھرے!
اگر غزل سے بھی چشمک کبھی کبھار ہوئی۔
اب اکتسابِ علوم و فنون کو دیکھیں
تو کہنا پڑتا ہے

جہاں، گرفت میں اس کی تھی ادبیاتِ انگریزی
وہاں، شغف میں تھی اس کے زبانِ سنسکرت
کہ جس کے شعری ادب میں تھی فکریات کی پونجی
اُسے مثال کی صورت نمایاں کرنے کو
قلم اٹھایا تھا اس نے
تو کچھ بھرتری ہری کے شعروں کو
برنگِ ترجمہ اشعارِ اُردو میں ڈھالا
بطور سعی، جمیل
وہ یادگار اضافہ رہے گی، اے یارو
ادب میں اُردو کے
اور اُس کی یاد بھی رہ رہ کے ہم کو آئے گی
جسے ہم احترام سے محبت میں
پکارا کرتے تھے اور تا زندگی پکاریں گے:۔
کفیل جود و سخا
پیارا رگوناتھ گھئی، پیارا رگھوناتھ گھئی
ادب نواز
ادیبوں کا محسن و مشفق۔

رام پرکاش راھی

Best Compliments From :
Mujtaba Husain

Raghu Nath Ghai --- My friend

A Tribute

All, all are gone, those old familiar faces --- so wrote Robert burn, the great English poet.
Apparently simple lines but replete with deep feelings and a sense of nostalgia. They strike a pathetic note, impart a sense of inevitability and and touch upon the brute reality of life.
As I heard about Raghu Nath's passing away, the news gave my heart a wrench. Another good friend gone. Only a couple of days before his death he had talked to me on the phone on diverse subjects, grave and gay, trivial and full of levity laced with sordonic humour. Did he have a premonition of what was coming and wanted to unburden his mind of thoughts seething his mind, for the last time? And now he was no more.
As another English poet had said, whom God loves die young. He did not mean that their lives were nipped in the bud but that though they ran the full span of life yet they remained young at heart and in spirit. Though Raghunath shed his mortal coils full of years yet his mind was full of the vigour of life till the last moment, as I am told --- an endowment given to few.
What constitutes good life? It is a question open to many answers. As Dr. Radhakrishnan had said in his lecture, Man's Unborn soul, life constitutes the art and science of living. It is like a candle burning in the stillness of night, silently and unflickeringly, shedding light around, lighting one candle and then another in the process of burning down, without haste without rest.
Did Raghunath conform to this criterion? For he was an ordinary

mortal like you and me. He was by no means a public figure or the run of the so-called leader who serves himself more than the people whom he professes to serve. Raghunath belonged to a different category altogether. He served the people silently, unobtrusively, as a matter of dharma without trying to steal the limelight and quietly discharging his debt to the society to which he belonged. The huge gathering that assembled at his kriya ceremony bore ample testimony to his qualities of head and heart I came to know Raghu Nath rather perfunctorily to begin with, sixty years ago when we were doing M.A. in English literature at the Forman Christian College, Lahore. In the college library a section had been set apart for post graduate students and I found Raghu Nath poring over books. I was then the editor of folio the college magazine. Once Raghunath rather diffidently gave me a piece of his writing for scrutiny for publication in the magazine. The article duly appeared in the magazine. I found the glimmerings of good writing in it which eventually came true in the long run. After that we often had close encounters which set him apart from others.

At that time F.C. College was among the leading colleges of Northern India, older than and equally famous as the St. Stephens of Delhi. Our college had contributed three vice chancellors to the punjab university, no mean achievement. One of them Dr. J.C.R. Ewing was knighted by the British government. Another, Dr. E.D. Lucas was known all over India as a great educationist. In later years, his son'-in-law served as the American ambassador to India. Another principal of the college, Dr. S.K. Datta was very close to Pt. Nehru and as rumours went was tipped to be the first health minister of independent india. He belived that a good college building did not matter so much as a

good laboratory, a good library and and an Assembly Hall where students congregated to listen to illustrious personages and exchange notes to widen their mental horizon. I am dwelling on this at some length to show that Ghai was a product of this Alma Mater and had imbided the qualities set forth by the college to good measure.

Then we drifted apart on the highways of life seeking our own ways to make good in life. It was long after that we met again in the last phase of our lives. We incidentally met at a literary function. "Jai Ratan, is it you;" he said with great effusion. I also responded with equal alacrity. Once again old memories were revived. Though it was rather late in the day hence forth it became a matter of literary give and take.

He gave me a copy of his book on Bhartari hari, LAMAT-E-BASEERAT a remarkable book for its quintessence of life and epitomising eternal values which were so dear to Ghai and by which he tried to stand by all his life. Bhartari Hari had a special meaning for Ghai.

What I am writing is not an assessment but a tribute to a good friend and a magnonimous soul, verging on adulation. For a lesser talent to sit in judgement on a superior person would be an exercise in futility. My praise may sound high falutin, devoid of criticism. Raghunath may have flaws --- which mortal has not? But his inherent goodness overshadows all his faults and that is what he will be remembered by most --- goodness of heart.

There is so much good in the worst of us,
And so much bad in the best of us
That it hardly becomes any of us
To talk ill about the rest of us.

Jai Ratan

ایک نوٹ

مدت ہوئی میرے عزیز سبھاش (Lt. Col. S.C. Khuller of DehraDun) نے مجھے معروف فلسفی LAO TZU کی ایک دستاویز سے روشناس کرایا تھا جس میں اُس عظیم مفکر نے عام انسان کی زندگی میں مستی و سرشاری لانے کے لئے چند اقوال تجویز کئے تھے۔

Five STEPS TO HAPPINESS

1. BE THE LAST
2. DON'T BE COMPETITIVE
3. DON'T TRY TO PROVE YOUR WORTH. THERE IS NO NEED
4. MOVE IN THE WORLD AS IF YOU ARE NOT
5. REMAIN USELES AND ENJOY.

رگھو بھائی کو یہ اقدام خاص طور پر پسند آئے تھے۔ یہ غالباً اُن کا اپنا نظریہ حیات بھی تھا۔ میرے ساتھ اپنی گفتگو میں وہ اسی قسم کی باتیں کیا کرتے تھے۔

وہ بہت سوچتے تھے۔ انہوں نے بہت لکھا اور جو لکھا خوب تھا۔ مگر میرے یار نے شہرت کے میدانِ کارزار میں کودنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ میرے جریدے کے لئے بھی انھوں نے میرے بار بار اسرار کرنے پر ہی لکھا۔

لمعاتِ بصیرت جو اُن کی کئی سالوں کی محنت کا ثمرہ تھا، میرے اسرار پر ہی انہوں نے ہمارے قومی ادارے ترقی اُردو بیورو نئی دہلی سے چھپوائی۔

ایک اچھے شاعر مفکر اور انشا پرداز ہوتے ہوئے بھی وہ تاحیات گوشہ نشین فقیر کی طرح جئے، اور آگے بڑھ کر اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا کو کبھی مشتہر کرنا ضروری نا سمجھا۔

شاعری کی چند کتابوں سے انھوں نے اپنی پسند کے مختلف اشعار کا انتخاب کیا تھا۔ جو لمعاتِ بصیرت کے اقتباسات ہی کے ساتھ اس شمارے میں جمع کر دیا گیا ہے۔

بلراج ورما

لمعاتِ بصیرت سے

اقتباسات

(۱)

کسی ملک کی عوامی زندگی اور کلچر سے جُڑے ادیبوں کی گوں ناگوں باتیں اکثر کہاوتیں بن جایا کرتی ہیں۔ ہندی کے معروف شاعر سوامی تُلسی داس کی چوپائیاں اور دوہے جابجا ہر خاص و عام کی زبان سے کہاوتوں کی صورت سُنے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت سنسکرت کے عظیم شاعر مہاراج بھرتری ہری کے بارے میں بھی صادق آتی ہے۔اُن کی معرُوف تصنیف ''شتک تریئم'' کے نیتی شتک ''شنگار شتک'' اور ''وَیراگیہ شتک'' کے شلوک سنسکرت جاننے اور سمجھنے والوں کے مُنھ سے اِس طرح نکلتے ہیں۔ جیسے کہ وہ روزمرّہ بول چال کا حِصّہ ہوں دھرم' اور فلسفہ بھارتیہ عالموں کے خاص الخاص موضوع رہے ہیں۔صداقت کی کھوج اور انسانی زندگی کی حقیقتوں اور گُتھیوں کو سُلجھانے۔سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے کی کوششوں میں لگا رہنا ہی ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ چار وید۔ چھ درشن۔اُپنشد اور گیتا میں ویدک فلسفے کا نچوڑ ملتا ہے۔

بھرتری ہری کے ''سنسکرت سے براہ راست'' منظوم اردو ترجمہ غیر معمولی معرکہ کا کام ہے۔جس کے لیے جناب رگھوناتھ گھئی صاحب کو ''شتک تریم'' کے پہلے مترجم ہونے کا فخر حاصل ہوگا۔ ساتھ ہی بھرتری ہری کی شاعری کو خاص و عام تک پہنچانے کی قدر و منزلت بھی۔

ڈاکٹر کرن سنگھ

۱۔ نیائے مارگ چانکیہ پوری۔نئی دہلی۔۲۱

(۲)

بھرتری ہری سنسکرت کے عظیم شاعر ہی نہیں اعلا درجے کے محقق ،قواعد داں اور فلسفی بھی تھے۔ کتابوں کی شکل میں دو بیش بہا خزینے ''واک پدیتہ'' اور ''شتک تریئم'' ان کے نام سے منسوب ہیں۔ ''واک پدتیہ'' سنسکرت زبان پر عالمانہ ریسرچ کی کتاب ہے۔اور شتک تریئم'' ان کا معروف شعری مجموعہ ہے۔ جسے دنیا کا ایک بڑا ادبی شاہکار مانا گیا ہے۔اِس میں اِنسانی زندگی کے تقریباً ہر

موضع پر شلوک ملتے ہیں اور ہر شلوک زندگی کی کسی نہ کسی عظیم سچائی کو بڑے اثر انگیز طریقے سے بیان کرتا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ اُردو اور ہندی کے علاوہ انگریزی فرانسیسی۔ لاطینی۔ ڈچ اور یونانی زبانوں میں بھی کیا جا چکا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں کی تصانیف میں "شتک ترئیم" کا اثر نمایاں ہے۔ اردو کے ممتاز شعراء ڈاکٹر محمد اقبال اور تلوک چند محروم بھی "شتک ترئیم" سے بہت متاثر تھے۔ لہذا میں نے اِس کتاب کے منظوم اُردو ترجمے کو "لمعات بصیرت" کا نام دینا ہی موزوں سمجھا ہے۔

منظوم ترجمہ

مہاراج بھرتری ہری کے شلوکوں کو ہندی یا اُردو میں منظوم ترجمہ کرنے کا خیال میرے دل میں تب آیا تھا۔ جب میں گارڈن۔ امریکن مشن کالج راولپنڈی میں طالب علم تھا۔ بھرتری ہری کے تینوں شتکوں سے کُچھ چیدہ شلوک ہمارے نصاب کی کتابوں میں شامل تھے۔ مجھے وہ اتنے دلچسپ لگے کہ پڑھتے پڑھتے ایک شلوک کا ہندی ترجمہ میری نوکِ قلم پر نمودار ہو کر صفحۂ قرطاس پر بکھر گیا۔

ورکشوں میں جب پھل لگتا ہے نمر بھاؤ آجاتا ہے
جل سے جب بھرپُور ہو بادل پرتھوی پر جُھک جاتا ہے
ہونے پر دھنواں گنی جن گرورہت ہوجاتے ہیں
سنت جنوں کی یہ نیتی شری بھرتری ہری بتلاتے ہیں

مگر وہ دیش کی غلامی کا زمانہ تھا۔ جب ہر شوق روٹی روزی کی شدید ضروریات کے نیچے اکثر دب کر رہ جاتا تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد روزی روٹی کمانے میں اس قدر مشغول ہو کر رہ گیا کہ ہر قسم کے ذوق وشوق لوہے کی مشینوں ہی میں اُلجھ کر رہ گئے۔ پھر ملک کا بٹوارہ ہوا در بدر کی ٹھوکروں مصیبتوں اور شدید جدوجہد کا شکار رہا۔ اب جبکہ ماحول سازگار ہے اور فکر معاش سے بھی نجات حاصل ہے تو "شتک ترئیم" کا ترجمہ ہندی کویتا کی بجائے اُردو نظم میں مکمل کرنے میں کامیاب ہو سکا ہوں۔ یہ ترجمہ میں نے دسمبر ۱۹۹۱ء میں شروع کر کے جون ۱۹۹۳ء میں ختم کیا۔ مجھے پتا نہ تھا کہ بھری تری ہری کا اُردو منظوم ترجمہ اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے۔ جو جناب امتیاز الدین خاں صاحب نے اُتر پردیش اُردو اکیڈمی لکھنؤ کے لیے تقریباً دس سال پہلے شائع کر دیا تھا۔ جناب امتیاز الدین کے ترجمہ کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ یہ ترجمہ انھوں نے سنسکرت کے شلوکوں سے سیدھا اُردو

میں نہیں کیا۔ بلکہ جناب ونکٹ راؤ کے ہندی نثری ترجمہ سے کیا ہے۔لہذا اُن کے ترجے اور میرے ترجے میں فرق لازمی ہے۔ میں نے ہر شلوک کو اوریجنل سنسکرت سے پڑھنے اور سمجھ لینے کے بعد ہی اُسے اُردو میں نظم میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ بغیر کسی اور ترجمہ کی مدد کے سنسکرت سے سیدھا اردو میں نظم کرنے میں مجھے کسی خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ میرے لئے یہ کام اتنا دلچسپ اور مرغوبِ طبع تھا کہ میں نے تقریباً ڈیڑھ سال کے اندر اندر اس کی پریس کاپی تیار کر لی تھی۔ دراصل کسی اور زبان سے منظوم ترجمہ کرنے کا کام مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ جب کوئی مضمون طبیعت پر حاوی ہو جاتا ہے تو نظم ایک چشمے کی صُورت پھوٹ کر نکلتی ہے۔ اِس کے برعکس اگر یہی کام محض کسی ایما پر یا ضرُورت سمجھ کر کیا جاتا ہے۔تو وہ نہ تو جلد مکمل ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس میں جدّت اور خوبصورتی پیدا ہو سکتی ہے۔

''لمعات بصیرت'' منظوم مکمل کرنے میں میں نے اپنے مہربان دوست اور اردو کے برگزیدہ شاعر جناب کرشن موہن کا بغایت ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں مجھے ہر لحاظ سے ہمت دی اور اپنے بیش قیمت مشوروں سے مستفید کرتے رہے۔ اِس کے علاوہ میں ''تناظر'' کے مدیر و پبلیشر اور معروف افسانہ نگار جناب بلراج ورما صاحب کا بھی شکر گزار ہوں۔ انھوں نے اسے کتابی صُورت میں آپ کے سامنے پیش کرنے کی ہر ممکن طریقے سے میری مدد کی۔

اب ''لمعات بصیرت'' اُردو منظوم آپ کے سامنے ہے۔بغور مطالعہ کے بعد اگر آپ اس سے کُچھ حاصل کر سکیں گے تو میں سمجھوں گا کہ ڈیڑھ ہزار سال تک وقت کے اندھیرے غار میں چُھپے ہوئے اِس خزینے کو کھود نکالنے اور آج کی عام فہم رائج زبان میں آپ کی خدمت میں پیش کرنے میں مَیں نے جو محنت کی ہے وہ بے کار نہیں گئی۔

مشرق و مغرب میں۔ماضی حال و مستقبل میں تو
ذرّے ذرّے میں فروزاں تیرا جلوہ آشکار
گیان سے تیرا فقط احساس کر سکتے ہیں ہم
ہوں تیری خدمت میں حاضر میں حزین و اشک بار

رگھوناتھ گھنی

عقیدت

راج رِشی بھرتری کو سمرن کرتے ہی ہم سب اُن کے نام اور کام کی یادوں میں آتم وِبھور ہو کر شردھا سے مستک جھکا لیتے ہیں۔ اُن کا جیون ایشور بھگتی، تیاگ اور مانو کلیان کی ساری جانی مانی کسوٹیوں پر پُورا اُترتا ہے۔

پریم مانو من کی وہ سُریلی انوبھوتی ہے جس سے تاثیر و تاثر کی ساری شکتیاں (جن کا تعلق دل ذہن بدن یا آتما سے ہے) مسرّت و شادمانی سے مخمور ہو اُٹھتی ہیں۔

محبت اپنے آپ میں ستیم، شیوم سُندرم کی وہ انوکھی انوبھوتی ہے جسے فراموش کر کے آدمی کا کوئی جذبہ ولولہ ارادہ کام یا قصد پورا نہیں ہو سکتا۔ من پیار سے پیڑت ہو تو اپنے عروج وعزم سے ہی نہیں اپنی دیگر چھوٹی بڑی تمام بھاوناؤں سے بھی کنارا کش ہو جاتا ہے، اور کُچھ اِس طرح ویراگیہ سے ہمکنار ہونے لگتا ہے کہ اُسے کُچھ بھی اچھا یا اپنا نہیں لگتا۔ پریم پریت وہ شکتی ہے جس کے بغیر مانو من کو سب کُچھ آدھا ادھورا نامکمل اور بے معنی لگتا ہے۔

من کے ہارے ہار ہے من کے جیتے جیت

مرحوم رگھوناتھ جی مدتوں یوگی بھرتری ہری کے جیون اور فکر وفن کی کھوج اور سمجھ میں لین رہے ۔اُنہوں نے یوگی راج سے زندگی کا بھرپور درس نا صرف خود لیا بلکہ اپنی سہج سرل اور سرس بھاشا میں ہمیں بھی اُس کا خاصا گہرا دیدار کرا دیا۔

ہم ہمیشہ اُن کے ابھاری رہیں گے۔

مُکتی ورما

(ہندی گرنتھ مہاراج بھرتری کرت شتک ترئیم سے انوواد)

کلدیپ گوہرؔ

بیادِ محترم رگھوناتھ گھئی ناتھؔ

مُروّت اور انساں دوستی رگھوناتھ صاحب کی
یہ دولت باعث اعزاز تھی رگھوناتھ صاحب کی

ہمیشہ ہی جواں تھا اُن میں جذبہ دردمندی کا
رہے گی یاد بندہ پروری رگھوناتھ صاحب کی

رہے تا زندگی وہ بادۂ عرفاں کے متوالے
بنامِ معرفت تھی مےکشی رگھوناتھ صاحب کی

نشستیں ''شامِ یاراں'' کی بخوبی یاد ہیں ہم کو
سحر آگیں تھی جس میں شاعری رگھوناتھ صاحب کی

بہت شعرا نے موضوعِ تصوّف پر لکھا لیکن
کری تسلیم سب نے برتری رگھوناتھ صاحب کی

سخن سے اُن کے ظاہر ہے طلسم اُن کی ذہانت کا
ہے آئینہ کبھی پر آگہی رگھوناتھ صاحب کی

صحافت ہو، تجارت ہو کہ علم و فن کی خدمت ہو
تھی ہر پہلو سے روشن زندگی رگھوناتھ صاحب کی

تڑپ اُٹھتے ہیں گوہرؔ اہلِ فن، جب یاد آتی ہے
وہ اندازِ بیاں میں دلکشی رگھوناتھ صاحب کی

□□

مختصر تعارف رگھوناتھ گھئی

گوئٹے نے کہیں، غالباً فائسٹ سے کہلوایا ہے کہ آدمی کو پورے اور مستقل طور پر اپنے وجود پر قابض اور فتح مندر رہنے کے لیے زِندگی کے سارے شب و روز نئے سِرے سے اپنی ذات کی کھوج میں لگاتار جاری ساری رکھنے چاہئیں۔

مہاراج بھرتری ہری مدتوں اِسی تلاش میں مستعمل رہے۔ اُن کا نام اور کلام انسان کی تلاش کی غیر ہموار وادیوں کا ایک طویل سفر ہے، یہ وادیاں کبھی بڑی ٹیڑھی ترچھی تو کبھی ہموار بانکی اور البیلی تھیں۔ اس عمیق سفرنامے کو ہم اُن کے نیتی شِدگار اور ویراگیہ شتک میں پڑھتے آئے ہیں اور ہر بار بھرپور شردھا سے آتم وبھور ہو کر ستیم، شیوم، سندرم کی اٹل سچائی کو، ایک مخصوص حد تک ہی سہی، کُچھ نہ کُچھ سمجھنے بھی لگے ہیں۔

رگھوناتھ گھئی نے مہاراج بھرتری ہری کے نیتی شتک، سنگار شتک اور ویراگیہ شتک کا سیدھا سنسکرت سے منظور اُردو ترجمہ کیا ہے جسے ہمارے قومی ادارے ترقی اُردو بیورو نے بہ عنوان لمحاتِ بصیرت اپنے اشاعتی پروگرام ہی کی ایک کڑی کے طور پر شائع کیا ہے۔

اِس مختصر مگر ہر اعتبار سے معتبر اور عظیم کتاب کے بارے میں رگھوناتھ گھئی اپنے پیش لفظ میں فرماتے ہیں کہ یہ کلام اُن کی برسوں کی کھوج اور لگن سے ہی ممکن ہو سکا ہے۔ اس

سلسلے میں اُن کے مندرجہ بالا اشعار کو میں لمعات بصیرت میں شامل ان کی معروضات سے بھی زیادہ اہم سمجھتا ہوں:

کھود کر لایا ہوں کچھ ہیرے وقت کی کھان سے
سخت چٹانوں کی تہہ میں دُور تک پھیلے ہوئے

اب بھی اُتنے ہی درخشاں، ضوفشاں، جلو کناں
وقت کی تاریکیوں میں راہ دِکھلاتے ہوئے

آج اُس چٹان کی تہہ میں تمھیں لے جاؤں گا
اور واں اِس سیمیائی معجزہ دِکھلاؤں گا

ایک رُوحِ پاک سے تم کو وہاں ملواؤں گا
زندگی جینے کا سچّا راستہ دِکھلاؤں گا

جان لوگے اُس کو گر تم زِندگی میں ایک بار
زندگی کی ہر ادا پاؤ گے یکسر ساز گار

میں اِن اشعار کو رگھوناتھ کا منظوم پیش لفظ سمجھتا ہوں۔ اِن کے علاوہ مرحوم کی اہلیہ محترمہ مسز راج رانی گھئی صاحبہ نے بھی ان کے غیر مطبوعہ کلام سے چند غزلیں اور نظمیں چن کر بھجوائی ہیں۔ یہ غزلیں اور نظمیں ان کے دونوں بیٹوں اور بہو رانی صاحبہ کا انتخاب بھی کہی جاسکتی ہیں۔ تناظر کے اِس خصوصی شمارے میں یہ نظمیں شامل ہیں۔

''لمعاتِ بصیرت'' کے ویراگیہ شتک کے ایک سو(۱۰۰) شلوکوں کو بھی ہم نے اس گوشے میں شامل کردیا ہے۔ ناتھ بھائی اسے کتاب کا نسبتاً زیادہ اہم حصہ سمجھتے تھے، اس لیے کہ وہ دانائے راز تھے اور جان گئے تھے کہ وہ ویراگی زیادہ اور دُنیادار کم تھے۔

مجھے اعتراف ہے کہ ۸۰ سال کی عمر تک پہنچ کر بھی میں ویراگیہ سے ابھی تک کوسوں دُور ہوں اور آج بھی اپنے آپ کو زِندگی کے ویرانوں کے دَلدل میں جکڑا پاتا ہوں۔

ابھی تک یوں کیچڑ میں پھنسا رہنے کے باوجود کبھی کبھار اُنچے آسمانوں میں پلکیں جھپکائے بغیر چمکتے دمکتے ستاروں کو دیکھنے کی جرأت کرلیتا ہوں۔ یہ کسی قسم کی طفلانہ ضد یا ہٹ دھرمی نہیں بلکہ وہ پیارا سا دھیما سا اثر ورسوخ ہے جو مجھے ناتھ کی محبتوں بھری اچھی اور پاکیزہ شاعری برائے رحم وکرم برابر بخشتی رہتی ہے۔

میں خود شاعر نہیں ہوں مگر ''لمعاتِ بصیرت'' سے مجھے زِندگی کا درس ملا ہے۔

—بلراج ورما

وَیراگیہ شتک

[۱]
مناجات شنکر

جن کے ماتھے کا ہے گہنا چودھویں کا ماہتاب
ذکر ہی سے جن کے مٹ جاتا ہے بدکاری کا نام
اک نظر سے جن کی جل کر مَر مٹا تھا کام دیو
ایسی شمع نور شِو جی کو مرا جھک کر سلام

[۲]
ہوش کی آگ

در بدر کی خاک چھانی ، ہر ولایت میں گیا
حرصِ زر میں اپنی عِزت آبرو تک بیچ دی
عمر بھر بد خو لئیموں کا رہا خدمت گزار
عمر بھر دل کو ہوس کی آگ تڑپاتی رہی

[۳]
لالچ کا نتیجہ

دُور دیشوں میں گیا، ہمراز خویشوں میں رہا
جُستجو میں زر کی کھودا کوہساروں کو کبھی
جا کے مَرگھٹ میں بھی جپ تپ میں گزارے رات دن
پھر بھی تسکیں مل نہ پائی زر کے ماروں کو کبھی

[۴]
ذلالت

تلخ جملے سن کے بھی خاموش رہ جاتا ہوں میں
دل میں روتا ہوں مگر چہرے سے مُسکاتا ہوں میں
یا وہ گو یوں سے بھی ہوتا ہوں بہ عزت ہم کلام
زر کی خاطر ہر ذلالت کو روا پاتا ہوں میں

[۵]
اگیان

گل پہ شبنم کی طرح ہے ایک پل یہ زندگی
ایک پل جینے کی خاطر ہر گنہہ کر تا رہا
بیچ ڈالا چند ٹکڑوں کے لئے اپنا ضمیر
اور خدا سے بے نیازی کا گلہ کر تا رہا

[۶]
صلے کا چاہ

مِٹ چکے ہیں ہم مگر ہیں حسرتیں دِل میں ابھی
ہے جواں حرص و ہوس گو زندگی کی شام ہے
وقت خود مٹتا نہیں ہم کو مٹا دیتا ہے یہ
زِندگی اِنسان کی حِرص و ہَوس کا نام ہے

[۷]
حسرتیں

بے غرض جب تپ عقیدت سے ہی ملتی ہے جزا
ہو صلے کی چاہ تو نیکی میں نیکی کچھ نہیں
فطرتاً مرغوب کار نیک ہیں دل کو اگر
تو وَلی ہے تجھ کو جو خواہش صلے کی کچھ نہیں

[۸]
لالَسا کی آگ

دور پیری، لاغری، ناطاقتی، موئے سپید
جھرّیاں، کمزور بینائی، سماعت ناتواں
دل میں لیکن کروٹیں لیتی ہیں اب بھی حسرتیں
لالَسا کی آگ کی شدت ابھی تک ہے جواں

[۹]
گیان کا امرت

گل پہ شبنم کی طرح ہے ایک پل یہ زندگی
ایک پل جینے کی خاطر ہر گنہہ کر تا رہا
بیچ ڈالا چند ٹکڑوں کے لئے اپنا ضمیر
اور خدا سے بے نیازی کا گلہ کر تا رہا

[۱۰]
جیون کا موہ

بے غرض جب تپ عقیدت سے ہی ملتی ہے جزا
ہو صلے کی چاہ تو نیکی میں نیکی کچھ نہیں
فطرتاً مرغوب کار نیک ہیں دل کو اگر
تو ولی ہے تجھ کو جو خواہش صلے کی کچھ نہیں

[۱۱]
آشا نراشا

رات دن آشا نراشا میں گزاری زِندگی
ہر نئی حرص و ہوس جاں کو جلاتی ہی رہی
ہو نہ پائی کیوں سکونِ قلب کی کوئی سبیل
بے قراری، نا امیدی دل دُکھاتی ہی رہی

[۱۲]
کامنا چکر

کام کر نیکی کا، ثمرے کا نہ رکھ دل میں خیال
چاہ ہو ثمرے کی تو نیکی بھلا کس کام کی
کر کے نیکی ڈال دے دریا میں ہو کر بے نیاز
چار سو پھیلے گی خوشبو خوب تیرے نام کی

[۱۳] **زندگی کی کشاکش**

یہ کشا کش زندگی کی دہر کی رنگینیاں
چھوڑ دے غافل انہیں یہ چار دن کی بات ہے
تو نہ چھوڑے گا تو آخر چھوڑ دیں گے یہ تجھے
چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے

[۱۴] **عیش وعشرت**

اہل دانش کے لیے آساں ہے ہر کارِ عظیم
عیش و عشرت میں کبھی وہ دل کو الجھاتے نہیں
ہم کہ رہتے ہیں سدا بس جستجو میں عیش کی
عمر بھر کارِ نمایاں کچھ بھی کر پاتے نہیں

[۱۵] **پکشی اور انسان**

ہم سے بہتر ہیں یہ پنچھی یہ نوا ہی دشت کے
جوگیوں کی آنکھ کے آنسو جو پیتے ہیں مُدام
ہم کہ رہتے ہیں سدا بدمست کیف و رنگ میں
بیت جاتی ہے ہماری عمر بے نیل مرام

[۱۶] **طمع**

ایک گدڑی، جامِ گل، نانِ جویں، سادہ لباس
اس سے بڑھ کر اور جینے کو بھلا کیا چاہیے
آدمی کی حرص کی لیکن نہیں کچھ انتہا
کس کو ہے معلوم اس کو اور کیا کیا چاہیے

[۱۷] ماس کی گانٹھوں کو کہتے ہیں وہ سونے کے کلس
عورت اور شاعر تھوک سے پُر منہ کو کہتے ہیں درخشاں ماہتاب
جسم کی بد بو میں ان کو بوئے مئے کی مستیاں
اور پسینے کی کثافت، کیف و لطفِ بے حساب
ہیچ ہے عورت مگر تُف شاعروں کی عقل پر
اس کے اِک اِک عضو میں پاتے ہیں حسن لاجواب

[۱۸] قابلیت شعر کہنے کی خدا کی دین ہے
شاعری خدا کی دین چھیننا شاعر سے یہ جو ہر کبھی ممکن نہیں
دودھ سے پانی جدا کرنا ہے جو ہرقاز کا
کوئی اس جو ہر کو اس سے چھین سکتا ہے کہیں!

[۱۹] پھول، چندن، ہار کیسر دیش بھوشا کا سنگار
زبان کی مٹھاس حسن میں تیرے نہ آئیگا کبھی ان سے نکھار
ہیں لبِ شیریں میں پنہاں حسن کی رنگینیاں
حسن کی زینت فقط تیرا کلامِ خُوش گوار

[۲۰] زندگی تیری ہے گر حرص و ہوش، جام و طعام
جستجو نفس سے آلودہ ہے تو کیا ہے تیری زندگی
کیا کبھی سوچا ہے غافل! زیست کا مقصد ہے کیا
بے روِش، بے مدعا، یوں ہی گنوا دی زندگی

[۲۱]
بندھن

تو امیرِ شہر ہے عشرت کدہ تیرا مکاں
گھر میں تیرے چاندی بیوی ہے حسن با کمال
نوجواں بیٹا سر اسر باپ کی تصویر ہے
تیرے خوابوں کے تصور کا طلسم بے مثال
کیا بتاؤں تجھ کو غافل ! خواب ہیں دھوکا ہیں یہ
ان کے بندھن میں جو الجھا، چھوٹنا اس کا مُحال

[۲۲]
یہ دنیاوی رشتے

کون ہے تو، کون بیوی، کون یہ بچے تیرے
چند روزہ ساتھ ہے، پھر یہ کہاں اور تو کہاں
یہ جو روتے ہیں تو پھٹتا ہے کلیجہ کیوں ترا
کیوں سدا رہتا ہے ان کے واسطے نا شادماں
اِن کو بھوکا دیکھ کر بے چین ہو جاتا ہے تو
در بدر ان کے لیے بھٹکے ہے زاد و نا تواں

[۲۳]
پیٹ کی آگ

بھوک کمزوری ہے انسان کی نہیں جس سے فرار
بھوک دے کر آدمی کو کردیازار و نزار
بھوک سے مجبور انساں کا نہیں کوئی ضمیر
بھوک سے مجبور انساں ہر ذلالت کا شکار

[۲۴]
رُسوائی

مانگنا ہی گر ضروری ہے، تو مت اپنوں سے مانگ
ہاتھ مت پھیلا کبھی اپنوں کے در کے سامنے
خاک میں مل جائے گا تیرا وقار علم وفن
یہ تجھے رسوا کریں گے ہر بشر کے سامنے

[۲۵]
بن باس

چھوڑ کر گنگا کی لہروں کا یہ مستانہ خرام
اور ہمالیہ کی حسیں، سرمست، دل کش و ادیاں
چھوڑ کر بھرپور میووں سے لدے پیڑوں کے جھنڈ
گونجتی ہر سو فضا میں پنچھیوں کی بولیاں
مست جھرنوں کی صدائیں لوریاں گاتی ہوئی
دامن کہسار میں پھیلی ہوئی ہر یالیاں
کیوں بھٹکتا پھر رہا ہے چند سکّوں کے لیے
زَر کے لالچ میں ذلیل و بے کس و بے خانماں

[۲۷]
بستیاں

سوچتا ہوں چھوڑ کر بستی کو بن میں جا بسوں
کیا دھرا ہے بستیوں میں گندگی کے ما سوا
رات دن محنت مشقت مالکوں کی گھرکیاں
تف ہے اس جینے پہ، اس جینے سے مر جانا بھلا
کس قدر دلچسپ تھی، کتنی جواں تھی زندگی
ہم نے ہی اس کو رہین درد و حرماں کر دیا

[۲۸]
جنگل اور شہر

جنگلوں میں ہیں مہیا چار سو رعنائیاں
شیت جل پینے کو، کھانے کو ہیں پھل میٹھے لذیذ
دُوب کا بستر بچھا ہے خواب عشرت کے لئے
زندگی آزاد فرحت آشنا و با تمیز
بستیوں میں زر کے لالچ میں بھٹکتی زندگی
کس قدر بے آبرو، بے خانماں، کتنی غلیظ

[۲۹]
حماقت

اس گپھا میں خود یہ ہنستا ہوں جب آتا ہے خیال
کیا تھی وہ پہلی مری حرص و ہوس کی زندگی
کس قدر بد بخت تھی، محتاج تھی، کتنی حقیر
زر کی خاطر کس قباحت میں گزاری زندگی
اس فقیری میں ہے حاصل مجھ کو شاہوں کا جلال
چار سو پیشِ نظر ہنستی تھرکتی زندگی

[۳۰]
صبر و سکون

ہے سکون قلب کی دولت اگر حاصل تجھے
دہر کے سامان عشرت، ہیچ ہیں تیرے لیے
صبر دے کر تجھ کو رازق نے سبھی کچھ دے دیا
قصر و ایواں، مال و دولت ہیچ ہیں تیرے لیے
دے بھی دے تجھ کو ہزاروں گر وہ سونے کے پہاڑ
کچھ نہ ہوگی ان کی وقعت ہیچ ہیں تیرے لیے

[۳۱]
بِھکشا کی فضیلت

تو ہے جوگی، تجھ کو بھکشا مانگنا ذلت نہیں
دل سے لالچ، حرص ونخوت کو مٹا دیتی ہے یہ
ہر گلی ہر گھر میں ماں ہے، ہر بشر اپنا عزیز
پیار کرنے کا انوکھا گر سکھا دیتی ہے یہ
پیار سے جتنی کوئی دے دے خوشی سے کر قبول
صبر کا احساس پہلو میں جگا دیتی ہے یہ

[۳۲] زندگی کو موت کا ڈر، لطف کو آزار کا
ڈر سے نجات پیار کو ہجرت کا ڈر، دولت کو ڈر سرکار کا
روپ، یوون کو بڑھاپے کا لگا رہتا ہے ڈر
نام کو تہمت کا اور شہرت کو ڈر ادبار کا
ایک بیراگی کا دل آزاد ہے ہر خوف سے
اس کو کوئی ڈر نہیں، دھن دھام کا سرکار کا

[۳۳] موت کے ڈر سے دبی رہتی ہے ہر دم زندگی
پُورن آزادی خوف پیری سے دبا رہتا ہے سہما سا شباب
حسن کے جلووں سے چکنا چور ہو جاتا ہے دل
ٹوٹ کر نابود ہو جاتا ہے مانند حباب
ہو اگر بیراگ تو آزاد ہو جاتا ہے دل
نے کوئی الجھن نہ بندھن اور نہ کوئی اضطراب

[۳۴] اس جہاں کے عیش و عشرت جان و دل کے ہیں وبال
چین کہاں ان کے لالچ میں جو ڈوبا وہ جیا تو کیا جیا
دہر میں مرمر کے جینے میں نہیں ہے زندگی
روح ہو بے چین تو جینے سے مر جانا بھلا

[۳۵] ہیں چھلاوا ایک پل کا دہر کی رنگینیاں
برہم کا دھیان ان میں دل کو مت لگا، دھوکا ہیں یہ، دھوکا ہیں یہ
من کے مندر میں بسا لے مورتی بھگوان کی
حسن کے بت کچھ نہیں، مایا ہیں یہ مایا ہیں یہ

[۳۶]
دُنیاوی عیش

ایک پل کی بات ہیں یہ دہر کے عیش و نشاط
جوں چمک بجلی کی یا جگنو کی جیسے روشنی
یا کمل کے پھول کی پتی پہ قطرہ آب کا
ایک پل بیتا تو مٹ جاتی ہے ان کی دل کشی

[۳۷]
نورِ وحدت

عشقِ خوباں، ناز و غمزہ، مال و زر، عیش و نشاط
جان لیوا ہیں یہ بندھن، دل کو ان سے دور رکھ
ہے فقط عشقِ حقیقی میں ہر اک دکھ سے نجات
اپنے دل کو نور وحدت سے سدا معمور رکھ

[۳۸]
سکھ کہاں

یاد کر وہ دن رہا جب اپنی ماں کی کوکھ میں
گندگی میں رات دن دبکا پڑا سوتا رہا
ہو کے پیدا نوجوانی میں ہوئی تجھ کو نصیب
پھر وہی جا جس میں اپنی جان و دل کھوتا رہا
حسن والوں کے سہے طعنے، ہوا بے آبرو
کس قباحت کے لیے مرتا رہا، روتا رہا
سوچ تو ناداں ذرا وہ کیا تھا جس کے واسطے
تند صحراؤں میں بارِ زندگی ڈھوتا رہا

[۳۹]
نراشا کا جیون

تاک میں پیری ہے دور نوجوانی کی حریف
موت کے سائے میں مر مر کر گزرتی زندگی
پھر بھی انسان کس قدر غلطاں ہے حرص و آز میں
بیت جاتی ہے نراشا میں بھٹکتی زندگی

[۴۰] یہ کشاکش کس لیے

زندگی بھر کیوں ہوس کی آگ میں جلتے ہیں ہم
ڈھونڈتے رہتے ہیں ہر دم مال و زر جاہ و جلال
جانتے ہیں اس کشاکش کی کوئی منزل نہیں
یوں گنوا دیتے ہیں پھر بھی زندگی کے ماہ و سال

[۴۱] مبارک ہیں وہ لوگ

ہیں مبارک دہر میں وہ لوگ جو آزاد ہیں
بے نیازانہ گزر جاتی ہے جن کی زندگی
دکھ نہیں دیتی انہیں خواہش کوئی، حسرت کوئی
بیت جاتی ہے پرستش میں ہی ان کی زندگی

[۴۲] برہم کی مستی

برہم کی مستی سے تیرا دل اگر سرشار ہے
دہر و جنت کی حکومت کچھ نہیں تیرے لیے
کچھ نہیں دنیائے فانی کی کروڑوں مستیاں
اپسراؤں کی بھی وقعت کچھ نہیں تیرے لیے

[۴۳] موت

بادشہہ، قیصر، بہادر، شیر نر عالی وقار
عالم و فاضل، اکابر نصرتوں کے جوش میں
ہو کے پژمردہ، فسردہ، ٹوٹ جاتے ہیں سبھی
غرق ہو جاتے ہیں یکسر موت کی آغوش میں

[۴۴] موت ایک کھلاڑی

موت پانسے کا کھلاڑی، کھیل کی گوٹیں ہیں ہم
کعبتین کا کھیل ہم سے کھیلتا رہتا ہے وہ
یاں سے واں پھر واں سے یاں، یہ سب اسی کی چال ہے
ہم کو یوں چالوں میں اپنی ریلتا رہتا ہے وہ

[۴۵] **گیان**

ہے طفلی، نوجوانی، کیا ہے پیری، کیا ممات؟
کیا کبھی سوچے ہیں ناداں! ان سوالوں کے جواب
رات دن کے چکروں میں یوں بتا دی زندگی
جوں جھپک یا نیم مدہوشی کا اک بھولا سا خواب

[۴۶] **حرصِ زر**

ایک ہی رَٹ میں لگا رہتا ہے نِسدِن آدمی
گونئ صبح دھج سے آتی ہے ہر اک شام وسحر
بے حیا کھاتا ہے دَر دَر حرصِ زر میں ٹھوکریں
اِس کے دِل پہ کیوں نہیں احساسِ ذلت کا اثر

[۴۷] **عشق**

ہو حقیقی یا مجازی، عشق آخر عشق ہے
عشق کی مستی سے اپنا دل سدا مخمور رکھ
کر حسینوں سے محبت یا خدا کی ذات سے
یعنی اِس بستی کو جلووں سے سدا معمور رکھ

[۴۸] **زندگی اکارت گئی**

سوچ ناداں! اس جہاں میں آ کے تو نے کیا کیا؟
کیوں فقط حرص و ہوس میں ہی بتا دی زندگی
عشق پریوں سے نہ کوئی معرکہ نے علم وفن
کیا ہوئی تیری جوانی، کیوں گنوادی زندگی

[۴۹] **محرومی**

دولت علم و ہنر سے بھی رہا محروم تو
اور نہ تھا حاصل حسینوں کا کبھی لطفِ وصال
غیر کے رحم و کرم پر ہی رہی تیری نظر
زندگی تیری تھی گویا ایک کوے کی مثال

[۵۰]
وصالِ مرگ

چل بسے ماں باپ بھی، بھائی بہن بھی، دوست بھی
ذہن میں بس رہ گئیں دھندلی سی کچھ پرچھائیاں
کٹ رہے ہیں ہم بھی دریا کے کناروں کی طرح
منتظر ہیں اب وصالِ مرگ کی تنہائیاں

[۵۱]
ایک عُمر ایک لمحہ

وید اقدس میں لکھا ہے حضرت انسان کو
دی خدا نے اس جہاں میں سو برس کی زندگی
اک صدی کچھ کم نا تھی، لیکن ہمیں لگتا ہے یُوں
لمحے بھر کی بات تھی، بس ایک پل تھی زندگی
کچھ تو بچپن میں کٹی، کچھ نیند کی آغوش میں
کس قدر بے سود تھی، بے مدعا سی زندگی

[۵۲]
تماشا گاہ

یہ جہاں ہے اِک تماشا گاہ، ہم نقال ہیں
کھیل اپنے کھیلتے ہیں اور چلے جاتے ہیں ہم
موت اِک پردہ ہے بس چہرہ بدلنے کے لیے
گوں ناگواں چہرے بدل کر سامنے آتے ہیں ہم
کھیل پیری کے، جوانی کے، وصال و ہجر کے
موت کے پردے سے باہر آ کے دِکھلاتے ہیں ہم

[۵۳]
شاہی اور فقیری

مالکِ اقلیم ہیں، فرمانروائے سلطنت
منحصر ہے دولت و حشمت پہ شاہوں کا نظام
اور ہمیں حاصل فقیری میں جہاں بھر کا مدار
بادشاہوں سے بھی بڑھ کر ہے ہمارا اِحترام

[۵۴] فقیری کا احترام

ناز ہے طاقت پہ تم کو، ہم کو اپنے ضبط پر
بادشاہ وقت ہو تم اور ہم اہل کتاب
ہو مبارک زر کے بندوں کو تمہاری پیروی
ہیں ہمارے بھی جہاں میں نام لیوا بے حساب

[۵۵] دِل کا سکون

ریشمی کپڑوں میں تم کو نیند تک آتی نہیں
چھال میں پیڑوں کی رہتے ہیں سدا مسرور ہم
ہیں فقط دل کے سکوں میں زندگی کی مستیاں
زر نہ ہونے سے کبھی ہوتے نہیں مجبور ہم

[۵۶] پُرتسکین زندگی

ہیں مہیا جا بجا کھانے کو پھل میٹھے لذیذ
خوشنما چشموں کا پانی سرد شیریں، دلنواز
گھاس کا بستر ہے رنگیں خواب راحت کے لئے
چھال کے کپڑے مہیا ہر جگہ بے امتیاز
زندگی مسرور، فرحت آشنا و بے ستیز
کس قدر آزاد، تسکیں آفرین و سر فرا

[۵۷] بے دھڑکن جیون

بے غرض، بے قید، آسودہ ہے اپنی زندگی
گھاس پر سوتے ہیں بھکشا مانگ کر کھاتے ہیں ہم
حکمرانوں کو بھی خاطر میں کبھی لاتے نہیں
حق کی باتوں پر تو شاہوں سے بھی اڑ جاتے ہیں ہم

[۵۸]
فقیرِ بےنوا

ہم فقیرِ بے نوا ہیں کچھ نہیں اس کے سوا
ہیں نہ رقاص و مغنی اور نہ بازی گر کوئی
کیا کریں شاہوں سے مل کر، اُن سے ہم کو واسطہ
ہم میں شاہوں کو رجھانے کا کوئی جوہر نہیں

[۵۹]
حشمت کا غرور

چار چھ نگروں کا راجہ ہو کے کیوں اتنا غرور؟
مٹ گئے شاہوں کے شبہ جن کی نہ تھی کوئی مثال
سلطنت میں جن کے تھے تجھ سے ہزاروں تاجور
خاک ہو جائے گا، مٹ جائے گا یہ جاہ وجلال

[۶۰]
راج پاٹھ کی وقعت

کتنے راجا آ کے اس دنیا میں یوں ہی چل بسے
دہر میں ان کا کہیں نام و نشاں تک بھی نہیں
کون سے گنتی میں ہے ادنیٰ سی تیری مملکت
حکمرانوں میں کہیں جس کا بیاں تک بھی نہیں

[۶۱]
راجاؤں کی ہستی

گیند ہے مٹی کی پانی سے گھری دنیا فقط
اس کے ٹکڑوں کے لئے لڑتے ہیں کتوں کی طرح
دہر کے ان حکمرانوں سے ہمیں ہو کیا امید
ایک مٹھی خاک پہ مرتے ہیں کتوں کی طرح

[۶۲] **محترم ہستی**

دہر میں وہ لوگ ہی ہیں قابل صد احترام
زندگی قربان ہے جن کی خدا کے نام پر
حرص زر میں غرق ہے یہ آج کی دنیا یہاں
بک رہا ہے آدمی ہر موڑ پر ہر گام پر

[۶۳] **زندگی کا راز**

پوچھتا پھرتا ہے کیوں اوروں سے کیا ہے زندگی؟
زندگی کا راز اپنے دل کی گہرائیوں سے پوچھ
یہ حقیقت اصل میں ہے تیرے پہلو میں نہاں
جھانک اپنے دل میں اور خاموش تنہائیوں سے پوچھ

[۶۴] **شِو جی کا رحمت**

مادرِ گنگا کا میٹھا جل ہے پینے کے لیے
پیٹ بھر کے کھانے کو پھل اور چار سو ہریالیاں
شِو کا سایہ سر پہ ہے تو کچھ نہیں خوف و خطر
جنگلوں میں رہ کے بھی رہتے ہیں ہر دم شادماں

[۶۵] **فکر کیوں؟**

اے دل ناداں! ہے کیوں یوں مبتلائے رنج وغم
ہو چکا سو ہو چکا ہونا ہے جو ہو جائے گا
بھول جا ماضی کو مستقبل ہے تیرے سامنے
ورنہ مستقبل بھی ماضی میں کہیں کھو جائے گا

[۶۶] چھوڑ دنیا کے جھمیلوں کو لگا اس سے لگن
تسکین دِل کا راز دل کو ہر دم اک خدا کے عشق سے مخمور رکھ
ہے اگر خواہش کہ ہو حاصل تجھے تسکین دل
اس نہاں خانے کو ہر حرص و ہوس سے دور رکھ

[۶۷] مال و زر، ساتھی، عزیز و اقربا فانی ہیں سب
یہ جہان فانی ہے وقت کی آندھی انہیں اک دن اڑا لے جائے گی
کچھ نہ رہ پائے گا دنیا میں بجز نام خدا
ناگہاں نا دیدہ راہوں میں بہا لے جائے گی

[۶۸] لکشمی کو مت کہو دیوی، یہ ہے اک ویشیا
لکشمی اس کا ور گھر کچھ نہیں، ہے آج یاں تو کل وہاں
اس کے چکر میں نہیں ممکن کہیں تسکین دل
ہے فقیری میں جو لطف و منزلت اس میں کہاں

[۶۹] شاعروں کی محفلیں، رقص و سرود و مے کشی
زندگی کا لطف حاضرِ خدمت جواں پریوں کا لطف بیکراں
زندگی میں گر نہیں تجھ کو میسر یہ تو پھر
کر دل و جاں کو خدا کے نور سے جلوہ کناں

[۷۰] مال و دولت، فتح و نصرت، دوستوں کی محفلیں

خدا کی ذات

چند روزہ زندگی میں چند دن کی بات ہے
دہر کی ہر ایک شئے فانی ہے دائم کچھ نہیں
قائم و دائم فقط بس اِک خدا کی ذات ہے

[۷۱] تُو ہے بَیراگی اگر حرص و ہَوس قابو میں ہے

بَیراگ

اور نہیں دل میں کہیں بھی، بغض و نفرت کا نشاں
موت کا ڈر بھی ہے دل میں اور خدا کی یاد بھی
یاد رکھ بَیراگ میں ہو گا نہ دل کا کچھ زیاں

[۷۲] ہے ترے دل میں اگر بَیراگ تو کیا چاہیے

برہم

موت، پیری اور مغنی کے ترانے کچھ نہیں
تجھ کو دنیا کے لوازم سے بھلا کیا واسطہ
برہم ہی سب کچھ ہے دنیا کے فسانے کچھ نہیں

[۷۳] اے دل ناداں! اُڑانوں کا نہیں تیری شمار

دلِ اِنساں

تو ابھی پاتال میں ہے اور ابھی افلاک پر
سرگراں رہتا ہے کیوں ہردم جہاں میں بے قرار
کیوں نہیں تو مرتکز یادِ خدائے پاک پر

[۷۴] **پُوجا تپسیا**

وید گرنتھوں کا پٹھن، پوجا، تپسیا کچھ نہیں
مت کہو اس کو پرستش یہ فقط بیوپار ہے
برہم کے چنتن کا حاصل دل کی شکتی شانتی
برہم کا چنتن ہے سب کچھ اور سب بیکار ہے

[۷۵] **ایشور تو دل میں ہے**

''مل نہ پائیں گے پجاری، ہیں ابھی ایکانت میں''
''ہیں ابھی مشغول، پھر آکر کبھی مل جایئے''
ہو گئے مایوس سُن سُن کر یہ دربانوں کے بول
جھانکیے دل میں وہیں اِیشور کے درشن پایئے

[۷۶] **اِنسان کی ہستی**

یہ زمیں و آسماں، کون و مکاں فانی ہیں سب
کچھ نہیں دنیا میں دائم ایک اِیشور کے سوا
یہ محل یہ قصر و ایواں خاک میں مل جائیں گے
الحذر! اس حال میں انساں کی ہستی ہے ہی کیا!

[۷۷] **دَورِ پیری**

دَورِ پیری میں ذرا انساں کی حالت دیکھیے
چال دھیمی، دانت گم، آنکھوں میں بینائی نہیں
کان کھو بیٹھے سماعت، لاغری کا دور ہے
بے حس و لرزاں لبوں پر تاب گویائی نہیں
جان کا دشمن ہے بیٹا، آبرو عنقا ہوئی
دِل اسیرِ یاس، جینے کی تمنائی نہیں

[۷۸]
اہانت

اب جواں پریوں سے ممکن ہی نہیں لطفِ وصال
حسن کی مہر و عنایت خواب بن کر رہ گئی
سامنے آکر نکل جاتی ہیں کتراتی ہوئی
ہر نظر جو جام تھی زہراب بن کر رہ گئی

[۷۹]
جوانی

اب جوانی میں جو کرنا ہے سو کر لو دوستو!
کچھ نہ ہو پائے گا جب کٹ جائے گا دَورِ شباب
آگ لگ جانے پہ ہے بے سود کوئیں کی تلاش
دَورِ پیری میں نہ ہوگی جسم و جاں میں آب و تاب

[۸۰]
زندگی کا چار دن

چار دن کی زندگی ہے سوچتے ہیں کیا کریں
بیٹھ کر گنگا کنارے دھرم کی چرچا کریں
یا بتا دیں زندگی یادِ خدا میں رات دن
دَہر کے دکھ درد کا درمان و حل سوچا کریں
آخرش کچھ یوں جھمیلوں میں الجھ جاتے ہیں ہم
کچھ نہیں کھلتا کہ آخر چار دِن میں کیا کریں

[۸۱]
چنچل من

مثل آہو بھاگتا پھرتا ہے چنچل دل ترا
اپنے پہلو میں اسے حرص و ہوس سے دور رکھ
دور پیری سر پہ ہے، یوں زندگی ضائع نہ کر
اک خدا کے نور سے دل کو سدا معمور رکھ

[۸۲] **یادِ حق**

وائے قسمت! گھر نہیں، دولت نہیں، عزت نہیں
ہو گیا مجبور تو، مجبور تیرا من مِلن
تجھ کو لازم ہے کہیں گنگا کے تٹ پر جا بسے
یادِ حق میں وقف کر دے زندگی کے چار دن

[۸۳] **پیار کا لطف**

چاندنی اور چار سو ہر یالیاں، لطف و سرور
پیار کے آنسو لیے ہے اک پری وش ہمکنار
آہ یہ منظر سہانے، ہائے! کیوں فانی ہیں یہ
لوٹ لیتے ہیں دل انسان کا صبر وقرار

[۸۴] **عیش محل یا جنگل**

ہیں بہم عشرت کے ساماں اس محل میں چار سُو
رقص دنے سے گونجتی ہے یاں کی ہر اک انجمن
حسن کے جلوے بھی ہیں اور حسن والوں کا وصال
جا بجا پریوں کے جھرمٹ۔ عیش وعشرت کا چلن
آہ! لیکن تو اگر سمجھے تو یہ سب ہیچ ہیں
اہل دانش کے لئے اس سے کہیں بہتر ہیں بن

[۸۵] **نفسِ امّارہ**

روز اوّل سے کہیں بھی اس جہاں میں آج تک
کون ہے جس نے کہیں دیکھا ہو ایسا شیر نر
نفس امارہ کو جس کے اپنے قابو میں کیا
جس کے بس میں ہوں سدا حرص وہوس قلب ونظر

[۸٦] **مکمل آزادی**

ہیں کہاں وہ لوگ اس دنیا میں جو آزاد ہیں
ہے گزر بھکشا پہ جن کا، فکر فردا کچھ نہیں
پھول پھل جنگل کے کھا کر مست رہتے ہیں مُدام
کوئی غم، کوئی تردّد، خوف و خدشہ کچھ نہیں

[۸۷] **پیری اور یادِ خدا**

اب کہاں جوشِ جوانی، آرزوئیں، حسرتیں
موت کے سائے میں لرزاں گامزن ہے زندگی
اب قریب مرگ آ کر یادِ حق سے فائدہ
درد ہے ، آزار ہے، رنج و محن ہے زِندگی

[۸۸] **شِو جی کی عظمت**

شو بھی وہ، وِشنو بھی وہ، ان میں تفاوت کچھ نہیں
مجھ کو لیکن انس ہے کچھ خاص شو کے نام سے
ماہِ رَخشاں اُن کے سر پر شعریت کا ہے نشاں
اور میں رہتا ہوں بے خود شاعری کے جام سے

[۸۹] **شِو پریم**

چاندنی۔ گنگا کا تٹ۔ خاموش منظر رات کا
اِس فضا میں گونجتی ہے جونہی ''شِو شِو'' کی صدا
اِک انوکھے لطف سے مسرور ہو جاتے ہیں ہم
ہوش ایسے میں ہمیں رہتا نہیں سنسار کا

[۹۰]
انسان اور قدرت

اب یہ ندیاں۔ یہ گپھائیں۔ بیل بوٹے سبزہ زار
میری ہستی میں سما کر ایک ہو کر رہ گئے
ہوگیا نا بود مٹ کر ماوتو کا بھید سب
عشق کے فردوس کا دِلکش فسانہ کہہ گئے

[۹۱]
قدرت کے مناظر

اب یہی حسرت ہے باقی چھوڑ کر دھن دھام کو
جا بسیں گنگا کنارے دُور جنگل میں کہیں
شو کی پوجا میں بتا دیں زندگی کے رات دن
آخرش خود اِن مناظر میں سما جائیں کہیں

[۹۲]
شِو جی کی پرستش

اے مرے بھگوان شو! میں کس قدر بے چین ہوں
سوچتا رہتا ہوں ہردم، کب وہ آئے گی گھڑی
اک تمہاری یاد میں سرشار ہو جاؤں گا میں
اور پرستش میں گزر جائے گی ساری زندگی

[۹۳]
بنارس کی نگری

یہ بنارس اِک تپوون، یاں کا سادہ ہے لباس
یاں کے باسی پھول پھل کھاتے ہیں دن ہویا کہ رات
دیوتاؤں کی ہے نگری، کیوں نہ یاں آکر رہیں
یاں ہی جینا، یاں ہی مرنا راحت وعزت کی بات

[۹۴]
گنگا کا تٹ

دل میں حسرت ہے کہیں گنگا کے تٹ پر جا بسوں
شِو کی پوجا میں رہوں اور دھرم کی چرچا کروں
زر کے بندوں کی اطاعت سے چھڑالوں زندگی
اِس جہاں کے ہر بشر سے پیار کا دعویٰ کروں

[۹۵]
ایک ہی آرزُو

ہاتھ ہے کاسہ مرا، اطراف ہی ملبوس ہیں
میں اکیلا ہوں جہاں میں، آرزو کچھ بھی نہیں
شِو سے مل کر ایک ہو جاؤں یہی ہے کامنا
اور کسی شئے کی جہاں میں، آرزو کچھ بھی نہیں

[۹۶]
شنکر کی مہا

دَہر میں ہستی کا امکاں اِک فقط شنکر سے ہے
یاں کا ہر ایک سازو ساماں اک فقط شنکر سے ہے
دَہر میں جو کچھ ہے افضل ہے فقط ان کا کمال
رنگ و نکہت، حسنِ دوراں اِک فقط شنکر سے ہے

[۹۷]
جامِ عشق

چیتھڑوں میں ہوں مگر دل حرص سے آزاد ہے
لطف عشرت بوریئے میں بھی مجھے کمخواب کا
راستے کی پٹریوں پر سو کے بھی دلشاد ہوں
خشک لقمے میں مجھے مرغِ مُسَلّم کا مزا
روئے زیبا دیکھ کر آہیں نہیں بھرتا کبھی
دل ہے پہلو میں مرے خاموش عبرت آشنا
کوئی دکھ، کوئی کشاکش، کوئی حسرت ہی نہیں
فکر سے آزاد ہوں، غم سے نہیں کچھ واسطہ
کیا کروں گا پا کے میں دونوں جہاں کی سروری
عشق کی مستی میں مجھ کو لطف دورِ جام کا

[۹۸]
جوگی کا دل

دل ہے جوگی کا سمندر کی طرح گہرا، مہیب
اِس پہ دنیا کے حوادث کا اثر ہوتا نہیں
اس کی فطرت لطفِ جنت بھی نہیں کرتی قبول
کوئی خواہش، شوق وجذبہ کارگر ہو تا نہیں
کودتی ہیں مچھلیاں جیسے اتھاہ موجوں کے بیچ
کچھ اثر اِس کا سمندر پر مگر ہوتا نہیں

[۹۹]
بھِکشو

دولت وحشمت کی دیوی! ہم کو تجھ سے واسطہ؟
چاہنے والے ترے عشرت کے ایوانوں میں ہیں
ہم فقط بھکشو ہیں، بھکشا مانگ کر کھاتے ہیں ہم
وہم ہے تیرا کہ ہم بھی تیرے دیوانوں میں ہیں

[۱۰۰]
وصل کی رات

میرا گھر ہے ساری دنیا، آسماں ایواں مرا
میرا بازو میرا تکیہ، میرا بستر سبزہ زار
ہم بغل پہلو میں ہے بیراگ میری سنگنی
چاند کا دیپک فروزاں، بادِ سَر سَر خوشگوار
کس قدر دلچسپ میری وصل کی یہ رات ہے
جانفزا، پر کیف، تسکین خیز، دل کش، عطر بار

بشکریہ:
قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان نئی دہلی کے اشاعتی پروگرام کی کڑی ''لمعات بصیرت'' سے۔

۷۔ غزلیں

کلامِ رگھوناتھ گئی

(۱)

کچھ ہی دن کی بات ہے جب آدمی تنہا نہ تھا
یوں جدا اِنسان سے اِنسان کا سایہ نہ تھا

بر سرِ پیکار تھی، ہر دم رواں تھی زندگی
زندگی جینا فقط مَر مَر کے جی لینا نہ تھا

رُوحِ انساں مصلحت کے نام سے واقف تو تھی
ذہنِ انسانی پہ زر کا اِس قدر غلبہ نہ تھا

حسن کی شرمائی آنکھوں میں عیاں ہر راز تھا
شوقِ بے پروا کے چہرے پر کوئی چہرا نہ تھا

عشق کی وادی میں رکھتے تھے قدم ڈرتے ہوئے
جذبۂ بے باک تھا، پر اِس قدر رُسوا نہ تھا

تجھ سے تنہائی میں ملنا بھی تو اب ممکن نہیں
یوں پسِ دیوار پوشیدہ کوئی پہرا نہ تھا

رنگ و نکہت میں گلوں کی درد کے آنسو تو تھے
مسکراہٹ میں مگر چبھتا ہوا کانٹا نہ تھا

مے بھی تھی، مینا بھی تھی، ساقی بھی مے خانے بھی تھے
رِندِ تشنہ کام کے لب پر کوئی شکوہ نہ تھا

جانے وہ کیا شئے تھی جس سے حسن میں تھی دِلکشی
حسنِ سادہ کی بناوٹ کے لیے غازہ نہ تھا

گر کسی سے دُو بہ دُو ہوتے تھے تو مردانہ وار
یوں تعاقب میں کسی آسیب کا سایہ نہ تھا

آدمی محور تھا اور رقصاں تھی ساری کائنات
آدمی روبوٹ کے پہلو کا اِک پُرزہ نہ تھا

□□

(۲)

ہے دُعا یارب! کوئی میری طرح تنہا نہ ہو
خاک جینا ہے کہ دُنیا میں کوئی اپنا نہ ہو

لاکھ اُمیدیں تھیں وابستہ جنونِ عشق سے
آہ یہ دریا بھی آخر ریت کا دریا نہ ہو

عشق کو موزوں بہت ہے آج کی آب و ہوا
فاصلہ گر جیب و دامن میں بہت لمبا نہ ہو

یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا وقت آجائے کبھی
منّت گر ہو لیکن عشق کو پروا نہ ہو

عشق کی جو تھا امانت زر کا داماں ہوگیا
کیوں سرِ بازار تیرا حسن پھر رُسوا نہ ہو

ڈر رہا ہوں اپنی صورت آئینے میں دیکھ کر
سوچتا ہوں اس میں بھی شاید کوئی دھوکا نہ ہو

تھا ولی کوئی یقیناً جس نے مے ایجاد کی
کیا سے کیا ہو جائے گر ساغر نہ ہو، مینا نہ ہو

تو ہے گر پیرِ مغاں ساقی گری کی لاج رکھ
تیرے مے خانے میں یکسر کوئی بھی پیاسا نہ ہو

راہ روِ راہِ فنا ہوں میں فقیرِ بے صدا
زندگی میں جس نے کچھ کھویا نہ ہو پایا نہ ہو

کیوں ہوا رگھوناتھ پائمالِ ستم اِس دہر میں
یوں نہ کوئی خاک اُفتادِ درِ مے خانہ ہو

□□

(۳)

نزع کی ہچکی میں دل کے شکستہ ساز میں تم
مری ہر آہ میں، ہر دردِ جانگداز میں تم

جنوں میں شوق میں دہقاں کی تگ و تاز میں تم
غریبِ شہر کی اُمیدِ، دلنواز میں تم

میں ڈھونڈھتا تھا تمھیں دشت و کوہ و صحرا میں
ملے تو اُن کی حسیں مست چشمِ ناز میں تم

تمھارے حسن سے ارض و سما ہوئے رنگین
شفق کے رنگ میں، پھولوں کی بزمِ ناز میں تم

مرے قلم میں فروزاں تمھاری رنگینی
مری دُعاؤں میں، پوجا میں تم نماز میں تم

تمھارے نور سے شعر و ادب میں رنگ و نکھار
عمرِ خیام میں تم، حافظِ شیراز میں تم

مجاز ہو کہ حقیقت مجھے نہیں معلوم
حجابِ راز میں تم، نظر دلنواز میں تم

دلِ حزیں کے خرابے میں تیرا مسکن ہے
حرم میں، دَیر میں نئے کعبہ و حجاز میں تم

مری حیات تجسس کا شوق بے پایاں
میں کیا کروں گا اگر آ گئے مجاز میں تم

یہ رازِ عشق ہے، رگھوناتھ دل کے گوشہ میں
بچا کے نظروں سے رکھیو یہ راز راز میں تم

□□

(۴)

باعثِ تقدیس و عشرت خانہ ویرانی مجھے
سلطنت صحرا نوردی، قیس سامانی مجھے

کرلیا شاداب اِس سے دل کے زخموں کا چمن
ہوگیا آبِ بقا یہ آنکھ کا پانی مجھے

رات دن اپنے لہو کی آگ میں جلتا ہوں میں
کیا سمجھ کر دے دیا اِک دردِ لافانی مجھے

دل نہ پہلو میں اگر ہوتا تو میں ہوتا خدا
دے کے دل دے دی جہاں بھر کی پریشانی مجھے

وہ گُہر جن سے ہوا پیدا شرارِ زندگی
چشمِ نم سے اُن کی حاصل ہے فراوانی مجھے

نبض اِنساں میں حرارت عشق کی پیدا کروں
دے کوئی شاعر کا دل اور نطقِ لاثانی مجھے

مضطرب ہے آنسوؤں میں تند طوفاں کا خروش
موجۂ آتش ہے یہ بہتا ہوا پانی مجھے

ڈھونڈھتی رہتی ہے ہر دم جس کو شاعر کی نظر
آہ! دکھادے ایک دن وہ حسنِ لاثانی مجھے

دل کے زخموں کا بُرا ہو پھوٹ کر رونے لگے
کیا کہوں کیوں کر ہوا شوقِ غزل خوانی مجھے

ہوگیا رگھوناتھ مجھ کو درد و غم رزق و معاش
یہ بساطِ زندگی نقشِ سلیمانی مجھے

□□

(۵)

برق رَو ذرّہ ہُوں مَیں خوفِ فنا کچھ بھی نہیں
بجلیوں کا شور طوفانِ قضا کُچھ بھی نہیں

تَیرتے ذرّے ہیں گویا تند طوفانوں میں ہم
اِبتدا کچھ بھی نہیں اور انتہا کُچھ بھی نہیں

عِشق کی خونباریوں نے ہی نِکھارا ہے انھیں
یُوں لب و رُخسار میں اپنی جلا کُچھ بھی نہیں

قہقہے کُچھ، چند آہیں اور شب بیداریاں
اور میری زندگی کا ماجرا کُچھ بھی نہیں

میرا حاصل اِنتہائے لاسعیِ حاصل میں ہے
اس بُلندی کا مقامِ اِرتقا کُچھ بھی نہیں

کس قدر زورِ تکلّم ہے خموشی میں مِری
بے اثر ناقوس ہے بانگِ درا کچھ بھی نہیں

مَیں لُٹاتا ہوں گُہر رگھوناتھ دُنیا کو مگر
وہ یہ کہتے ہیں یہ اشکوں کے سِوا کچھ بھی نہیں

□□

(٦)

کیا پتہ میں کیا ہوں اور کیا ہے خدا، کیا کائنات
سب فسانے ہیں، حقیقت کا پتا کُچھ بھی نہیں

کیوں فسانوں سے بہل جاؤں حقیقت مان کر
مُجھ کو جب معلوم ہے، میں جانتا کُچھ بھی نہیں

پالیا گر تو نے اُس کو رُوح کے احساس میں
یہ تِرا احساس ہے، اِس کے سِوا کُچھ بھی نہیں

کیا کرائے گا تعارُف اُس کا مُجھ سے میرے دوست
خُود تجھے معلوم ہے تو جانتا کُچھ بھی نہیں

کیوں نہ سچ کہہ دوں کہ سچ کہنے میں مُجھ کو عار کیا!
ایک قطرہ ہوں سمندر کا پتا کُچھ بھی نہیں

دائرہ میری نظر کا کِس قدر محدود ہے
یہ قیاس آرائیاں، یہ فلسفہ کُچھ بھی نہیں

تو مجھے مُنکر سمجھتا ہے تو مُنکر ہی سہی
اُس کی خلقت ہوں مجھے تجھ سے گلا کُچھ بھی نہیں

تیرا یہ ذوقِ تجسّس، پائیدار و اُستوار
یہ تیرے اندر خُدا ہے، اور خُدا کُچھ بھی نہیں

جُستجو تیری ہے گویا، جُستجوئے ناتمام
سعیٔ لاحاصل کہ جِس کی اِنتہا کُچھ بھی نہیں

جُستجو میرا مقدر، جُستجو یہ زِندگی
زِندگی پیہم تجسّس کے سِوا کُچھ بھی نہیں

مطرب و مَے کے سُنا عشقِ بتاں کی بات کر
ہم کو رازِ دَہر سے کیا واسطہ؟ کچھ بھی نہیں

عمر بھر دُنیا میں جی کر کیا کیا کُچھ بھی نہیں
ہے یہی جینا تو جینے کا مزا کچھ بھی نہیں

جستجو میں جِس کی یُوں بھٹکا کیے شام وسحر
در بدر کی خاک چھانی تھا وہ کیا؟ کُچھ بھی نہیں

مر چکا ہے دِل اب اس کو رو رہا ہوں رات دِن
زندگی نالۂ پیہم کے سِوا کُچھ بھی نہیں

مُضطرب ہوں گویا ویرانے میں منزِل کے لیے
تیری اِس آباد دُنیا میں مرا کُچھ بھی نہیں

کس قدر جہدِ مسلسل کِس قدر جاں کَندنی
اور آخر اس کا حاصل کیا ہوا؟ کُچھ بھی نہیں

رات دن مرتا رہا میں جس کو پانے کے لیے
کیا پتہ تھا ضعفِ پیری کے سِوا کُچھ بھی نہیں

وائے محرومی! یہ میرا دردِ عشق جاں گداز
خارِ حسرت کی خلش کے ماسوا کُچھ بھی نہیں

جل کے خاکستر یا مٹی میں دبایا جاؤں گا　　اور اس ہستی کا میری ارتقا کچھ بھی نہیں

بھول جاؤ گے مجھے اور یہ ادب کی محفلیں　　دوستو! ہرگز مجھے تم سے گلا کچھ بھی نہیں

شام آ پہنچی تھکن سے چُور ہے سارا بدن　　وائے مایوسی کہ منزل کا پتہ کچھ بھی نہیں

کیسے پائے گا اُسے دُنیا سے آنکھیں پھیر کر　　میری نظروں میں تو دُنیا کے سوا کچھ بھی نہیں

حضرتِ رگھوناتھ کہتے تھے خُدا بخشے انھیں
زِندگی اِک خواب ہے اِس کے سِوا کُچھ بھی نہیں

□□

(۷)

کیا ضروری ہے کہ ہم تکرار کی باتیں کریں
کیوں نہ مل بیٹھیں، ہنسیں اور پیار کی باتیں کریں

دے اگر فرصت زمانہ آج کے اِس دَور میں
مثلِ گل کھُل کر کھلیں گلزار کی باتیں کریں

بھول جائیں زندگی کی جان لیوا تلخیاں
حسنِ گل کی، نرگسِ بیمار کی باتیں کریں

گنگنائیں مل کے باہم میرؔ و غالبؔ کی غزل
عشق و الفت کی، لب و رخسار کی باتیں کریں

جان جائیں آنکھوں آنکھوں میں دلوں کی داستاں
پیار کی نظروں سے ہی گفتار کی باتیں کریں

چاندنی ہو، جام ہو، پہلو میں تم جلوہ فروز
رات بھر بیٹھے رہیں اور پیار کی باتیں کریں

زندگی سچ مچ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
جامِ اُلفت، شربت دیدار کی باتیں کریں

تم جو چاہو تو یہیں پیدا ہو فردوس زریں
آسماں والے اسی گلزار کی باتیں کریں

کس کی برکت ہے کہ ہم ہیں اور یہ رنگیں کائنات
لمحہ بھر کچھ اُس کشورِ کار کی باتیں کریں

کچھ غم دَوراں کی اور کچھ داستانیں عشق کی
دُکھ دیا جس نے اُسی دِلدار کی باتیں کریں

بانٹ لیں سکھ دُکھ تو کچھ دِلستاں ہو زندگی
غیر سے بھی پیار کے اقرار کی باتیں کریں

سہل ہوجائے گا مشکل زندگی کا یہ سفر
ہر گلی، ہر موڑ، ہر بازار کی باتیں کریں

دس قدم مل کر چلیں تو دوست بن جاتے ہیں لوگ
کیوں نہ ہم بھی پیار کے اقرار کی باتیں کریں

چل بسا رگھوناتھ ہم کو دے کے درسِ زندگی
کیوں نہ اُس کے قول وخوش کردار کی باتیں کریں

□□

۱۲۔نظمیں

کلام رگھوناتھ گھئی

ا۔مہاپُرش

وہی انسان دُنیا میں بڑا انسان ہوتا ہے

جو ذرّوں کے جگر چیرے اِک عالم رُونما کر دے
کرے پتھر میں پیدا سوزِ اُلفت معجزہ کر دے

جو کر دے غرق اپنی ہستی گردابِ تفکّر میں
نکالے وہ گُہر آخر جو عالم پُرضیا کر دے

جو برقِ آسماں بن کر تڑپ جائے چٹانوں پر
جو صحراؤں میں برسے اور جنت کی فضا کر دے

جو طوفاں خیز دریاؤں کی راہوں کو بدل ڈالے
دیارِ ظلمتِ باطل میں اِک محشر بپا کر دے

جو کھا کر زخم پہلو میں سنبھالے دل کے ٹکڑوں کو
وفائے شوق میں ذوقِ وفا کی اِنتہا کر دے

جو ٹپکے سوزِ دل بن کر کسی بے کس کی آنکھوں سے
ملا دے خرمنِ اسیاف کر آہ رسا کر دے

اے سازِ موسیقی کسی کلک نیستاں کو
بت کے ترانوں سے جہاں نغمہ سرا کر دے

سرودِ زیست دے دے پھر سے جو مایوس ذہنوں کو
شکستہ دل کے تاروں کو ترنم آشنا کر دے

جو شعلۂ عشق میں جل کر مجسم حسن بن جائے
مثالِ طورِ پر ذرّے کو پھر شعلہ کر دے

◻◻

۲۔ بچّہ اور ماں

ماہِ تاباں درخشاں کو دیکھ کر برآسماں
اِک حسیں بچّہ یوں بولا اپنی مادر سے ''اے ماں''

کیا بھلا معلوم ہوتا ہے مجھے ماہتاب
میرے دِل میں اِس کی اہمیت ہے کتنی لاجواب

دیکھ لیتا ہوں جو اِس کو ایک بار بھی آنکھ بھر
مافیہائے دُنیا سے ہوجاتا ہوں میں بے خبر

تیری حالت دیکھ کر ہوتی ہے حیرانی مجھے
دیکھتا ہوں جب کہ پرواہ ہی نہیں اِس کی تجھے

اِس پہ یوں گویا ہوئی اُس کی وہ مادرِ مہرباں
ایک دن میں بھی تری طرح تھی اَے ننھی سی جاں!

میرے دل میں بھی تھی اِس کی اہمیت تیری طرح
میرے پہلو میں بھی تھی اِس کی چاہت تیری طرح

پر آسمانی چاند کی اب کیا ضرورت ہے مجھے
کھیلتا جب دیکھتی ہوں اپنی گودی میں تجھے

□□

۳۔ آنکھوں آنکھوں میں

آنکھوں آنکھوں میں ہوئی کچھ شمع پروانے کی بات
جل کے جل جانے کی، یا جل جل کے مرجانے کی بات

دل سے دِل کی بات تھی، کس نے کہی کِس نے سُنی
کہنے سُننے کی، سمجھنے کی، نہ سمجھانے کی بات

جلتے جلتے کان میں شمع کے کیا کچھ کہہ گیا
اشک ٹپکاتی رہی سُن کر وہ پروانے کی بات

منتظر نظریں ہیں اب تک نیند کی دہلیز پر
کہہ گیا تھا کوئی اُن کے خواب میں آنے کی بات

عشق گر خود دار ہے تو حسن بھی ہے بے نیاز
ہے حقیقت میں مگر یہ ایک افسانے کی بات

رات کو نشے میں کیا کچھ کہہ دیا تھا آپ نے
شیخ جی! کیا یاد ہے اب بھی وہ مَے خانے کی بات

میری آہوں میں بھی یارب! کچھ اثر پیدا تو ہو
اُن کے وعدوں تک ہی کیوں ہو میرے افسانے کی بات

دہشتِ دار و رَسن تک بھی نہ مانع آئے گی
ہوگی ہر لب پر کسی دِن میرے افسانے کی بات

کچھ نہیں بُجز درد و غم رگھوناتھ کی ہر بات میں
کون بتلاؤ! سنے گا، ایسے دیوانے کی بات

□□

Greeting to TANAZUR on its
Punar Janam

From:
Shrimati Urmil Satya Bhushan
152 A, Pocket iv, Mayur Vihar, Phase-i,
Delhi-110091

۴۔ جو میرا جذبِ دل محکم نہیں ہے

جو میرا جذبِ دل محکم نہیں ہے
ترا بھی حسن تو دائم نہیں ہے

جہاں میں تو بھی فانی میں بھی فانی
جہاں کی کوئی شے قائم نہیں ہے

اندھیری رات ہے اندھا سفر ہے
کوئی راہبر، کوئی ہمدم نہیں ہے

مرنے مرنے پہ کیوں ہے، شورِ وحشت
بشارت ہے مجھے ماتم نہیں ہے

یہ مانا تلخ ہے دُنیا میں جینا
جہاں میں دِلکشی بھی کم نہیں ہے

نگاہِ حسن ہے غارت گرِ دل
نگاہِ عشق بھی کچھ کم نہیں ہے

جئے کچھ اِس طرح سے زِندگانی
کہ مرجانے کا دل میں غم نہیں ہے

جوانی حسن و عشق و جام و نغمہ
مگر افسوس کیوں دائم نہیں ہے

اُمید وَصل کی پُرلطف گھڑیاں
لطافتِ ہجر میں بھی کم نہیں ہے

یہ دامانِ سحر پر آبگینے
مرے آنسو ہیں یہ شبنم نہیں ہے

دلِ درد آزما خوگر ہے غم کا
جہاں کا کوئی غم اب غم نہیں ہے

ہے کچھ تو دِل میں کہ بھیگی ہیں پلکیں
یونہی تو آنکھ اُن کی نم نہیں ہے

کہاں لے جاؤں یہ دُکھتا ہوا دِل
کوئی پرسانِ درد و غم نہیں ہے

گراؤ ناتھ مت زخموں پر آنسو
یہ آنسو زخم کا مرہم نہیں ہے

□□

۵۔ ذرّہ اور کائنات

قطرۂ آبی میں پنہاں زِندگی کاراز ہے
تپتے لوہے پر تو دُودِ زار ہوجاتا ہے یہ
پھول کی پتی پہ لگتا ہے یہ موتی کی طرح
سیپ میں گِر کر دُرِ شہوار ہوجاتا ہے یہ

یہ اثر صحبت کا ہے اُس کو پتہ کُچھ بھی نہیں
کیا سے کیا ہوجائے گا وہ جانتا کُچھ بھی نہیں
(بھرتری ہری نیتی شتک)

''زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی شبنم، کبھی گوہر، کبھی آنسو ہوا''
آپ کی نظروں میں اِک ذرّے کی وقعت کُچھ نہیں
تند طوفانوں کے مضمر ہیں اِسی میں اژدھام
تم نے دیکھا ہے بکھر کر قہر ہوجاتا ہے یہ
کس قدر برباد کردیتا ہے ہستی کا نظام

میں ہوں اِک قطرہ سمندر کی اتھاہ موجوں کے بیچ
یا ہَوا کے دوش پر اُڑتا ہوا ذرّہ ہوں میں
دہر میں گو میری ہستی کا تصور کچھ نہیں
تند طوفانوں کا لیکن پھر بھی اِک حصہ ہوں میں

قطرہ ہوں لیکن کبھی شبنم کبھی گوہر ہوں میں
ابر بن کر گر کبھی برساتو ایک دریا ہوا
گاہ ٹپکا اشک غم بن کر کسی کی آنکھ سے
گاہ ہلاہل زہر، گاہ تریاق، گاہ صہبا ہوا

کتنا حیرت کُن ہے یارب! تیری قدرت کا نظام
کتنی صدیوں کا پرانا، پھر بھی فرسودہ نہیں
آدمی بھی ہے کرشمہ تیری قدرت کا مگر
آدمی کیوں پھول کی مانند آسودہ نہیں

□□

۶۔ داغِ مفارقت

کیا خوب وفاؤں کا صلادے گیا مجھے
نہ جانے کس خطا کی سزا دے گیا مجھے

ہے کون سی وہ جا کہ اکیلا چلا گیا
کچھ بات ہے ضرور دغا دے گیا مجھے

وہ زخم دے گیا جو کبھی بھر نہ پائے گا
اِک دردِ لادوا جدا دے گیا مجھے

دردِ فراقِ جس کا مداوا نہیں کوئی
خوں گشتہ و اندوہ رُبا دے گیا مجھے

نشتر سا گویا دل میں چبھو کر چلا گیا
تازیست تڑپنے کی دُعا دے گیا مجھے

تو کیا گیا کہ رونقِ باغِ جہاں گئی
ویرانیوں کا ماسوا کیا دے گیا مجھے

اب سعی چارہ سازی و درما کرے گا کون
وحشی دلِ آشفتہ نوا دے گیا مجھے

کیا خوب! خود تو گلشن جنت میں جا بسا
دردِ فراق و آہ و بقا دے گیا مجھے

بھرپور زندگی کی جو دیتا رہا دُعاء
کیوں آپ زندگی میں خلا دے گیا مجھے

سو سال کا تھا ساتھ نبھانے کا وعدہ
کیسا یہ درسِ حسن وفا دے گیا مجھے

کیسے کرے گا جاکے وہاں اُن کا سامنا
کیا ساتھ نبھانے کا صلا دے گیا مجھے

رگھوناتھؔ اس جہان میں اب جی کے کیا کروں
اشکوں کا اِک سیلابِ بلا دے گیا مجھے

□□

۷۔ تخلیق

فرطِ غم سے جب کبھی سینے میں اُٹھتا ہے دُھواں
خاک ہوجاتا ہے جل کر آرزوؤں کا جہاں

جب کسی کروٹ دلِ مجروح کل پاتا نہیں
تڑپتا رہتا ہے ہر پہلو قرار آتا نہیں

شب کے سناٹے میں جب سنتا ہوں رونے کی صدا
دِل دُکھا جاتا ہے جب کوئی فسانہ درد کا

جھومتی کالی گھٹائیں گھِر کے آجاتی ہیں جب
ہجر کی تنہائیوں میں اور تڑپاتی ہیں جب

دیکھتا ہوں جب جوانی بے قرار ہوتی ہوئی
اشک بار ہوتی ہوئی سینہ فگار ہوتی ہوئی

حسرتیں پردہ نشیں جب خانۂ دل میں نہاں
آنکھ سے بہتی ہیں بن کر اشک کا سَیلِ رواں

دل ستانی حسن کی نغموں پہ اُکساتی ہے جب
دل کی دھڑکن ساز کی آواز ہوجاتی ہے جب

شدتِ احساس سے تب چور ہوجاتا ہے دل
آہ و نغمہ کے لیے مجبور ہوجاتا ہے دل

مجھ کو کیا معلوم کیا ہے فاعلاتن فاعلات
غیب سے آتی ہے دل میں شعر بن جاتی ہے بات

دَہر کے ہر راز سے تب آشنا ہوتا ہوں میں
بندۂ بے بس نہیں رہتا، خدا ہوتا ہوں میں

مجھ کو لگتا ہے کہ میں بیٹھا ہوں ہفت افلاک پر
اور واں سے دیکھتا ہوں اپنی خلقت خاک پر

دیکھ کر اُن کو کبھی ہنستا کبھی گاتا ہوں میں
فرطِ رِقّت سے کبھی بے تاب ہوجاتا ہوں میں

ضبط کچھ رہتا نہیں اِدراک پر اِحساس پر
پھول جھڑتے ہیں قلم سے صفحۂ قرطاس پر

سوچتا ہوں کس طرح سب کچھ یہ کہہ جاتا ہوں میں
خود کبھی پڑھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں میں

جستجو دل کو کسی زہرہ کی رہتی ہے مدام
زندگی میری ہے گویا ایک شعرِ ناتمام

کون ہے رگھوناتھ جو چھایا ہوا ہے رُوح پر
نغمہ زن ہے کیف مستی ذہن و دل پر سر بسر

□□

۸۔ پیری میں عشق

کیوں بتوں کا عشق پیری میں بھی قائم ہے ہنوز
اک حسیں چہرے پہ اب بھی کیوں مچل جاتا ہے دل
کیا کروں اس دل کا کافر یہ ابھی تک ہے جواں
دید کی حسرت میں اب بھی ہچکیاں کھاتا ہے دل

نوجوانی میں محبت کا جنوں کچھ اور تھا
نوجوانی میں محبت درد کا عنواں نہ تھی
نوجوانی میں محبت نشۂ لطف سرور
نوجوانی میں یہ اک چبھتا ہوا پیکاں نہ تھی

نوجوانی میں تمہارے حسن کی رنگینیاں
دعوت عشرت تو تھیں پر درد کا ساماں نہ تھیں
نوجوانی میں تمہارا قرب تھا عیش و نشاط
وصل کی راتیں وقارِ عشق کے شایاں نہ تھیں

حسن کے عارض پہ وہ کھلتا ہوا رنگیں گلاب
وہ گھٹا زلفوں کی وہ بہکی ہوئی نظروں کے جام
وہ سرکتا ریشمی آنچل، وہ پتھریلا شباب
وہ بدن مہکا ہوا، وہ چال وہ دل کش خرام

حسنِ نسوانی پہ وہ کھلتی جوانی کا فِسوں
روح پرور ہر ادا، غارت گر دنیا و دیں
جنبش مژگاں میں لرزاں عشوہ ہائے دلنواز
جان لیوا حسن کی اک اک ادائے دل نشیں
بارگاہ حسن میں یاں دل لٹا دینے کا شوق
واں جھجکتی آرزوئیں جانگل خاموشیاں
بولتی نظروں میں باہم عہد و پیمانِ وفا
پرتکلم خامشی میں عشق کی سرگوشیاں

باہمی لطف و ہم آہنگی کی وہ سرمستیاں
وصل کے لمحے ہوا کے دوش پر بہتے ہوئے
سلوٹیں بستر کی شب کے راز بتلاتی ہوئی
بال الجھے سے کہانی رات کی کہتے ہوئے

اک ہوس تھی، تشنگی تھی عشق کہتا تھا اسے
گرمئی خوں کو محبت کا فسوں سمجھتا تھا میں
بوسۂ لب سے جوانی میں جو پاتا تھا سکوں
واسنا تھی، پیار کا اس کو جنوں سمجھتا تھا میں

بھوک تھی جسموں کی اس میں پیار کا جذبہ نہ تھا
طالب عشرت جوانی باہیں پھیلائے ہوئے
کامنا تھی، پیاس تھی، تسکیں طلب مجبور سی
لالسا کی آگ سی پہلو میں بھڑکائے ہوئے

لیلیٰ و سلمیٰ کا غلبہ تھا میرے اعصاب پر
صورتِ خوش دیکھ کر مدہوش ہو جاتا تھا میں
عشرت و شوقِ شراب و شعر میں ڈوبا ہوا
حافظ و خیام کے انداز میں گاتا تھا میں
آج جب دیکھا تجھے تو دل کو کچھ ایسا لگا
درد کی دنیا میں کتنی بیکراں ہے زندگی
پیار کے ماحول میں پلتی ہوئی بڑھتی ہوئی
کس قدر دلچسپ ہے کتنی جواں ہے زندگی

حسن فانی ہے تو ہو پر مجھ کو ہے کامل یقین
حسن پر تیرے رہے گا تا ابد یوں ہی نکھار
عشق کی صہبا سے کھیتی حسن کی شاداب ہے
عشق سے ہی حسن کی دنیا میں ہے رنگ بہار

انبساط روح کی منجدھار میں بہتے ہوئے
لطف بے پایاں کہ گہرائیوں میں کھو جائیں گے ہم
زندگی اور موت کی مجبوریوں سے بے نیاز
عشق کے فردوس میں ابدی بقا پائیں گے ہم

□□

۹۔ پھر لوٹ آنے پر ـــــ ایک کہانی

کس قدر حیراں ہوں آنے پر تیرے اے جانِ جہاں　　لے کے آئی ہو میرے گھر میں امیدوں کا جہاں
تیرے آنے سے ہوئے روشن مرے کون و مکاں　　ہو رہا ہے ہائے، پیری میں جوانی کا گماں
پیکرِ بے حس میں پھر سے زندگی بیدار ہے　　خون کی گردش میں پھر سے برق کی رفتار ہے
آ گئی پھر میرے جسم و جان میں تاب و تواں　　رو بروِ شمع کے پروانہ ہے پھر آتش بجاں
ہو گئے تھے سرد سوزِ عشق کے جو ولولے　　پھر سے خاکستر میں پیدا ہو گئے شعلے نئے
لذتِ الفت کی یادیں پھر فروزاں ہو گئیں　　مر چکی تھیں جو امنگیں پھر نمایاں ہو گئیں

چھلچھلا اٹھے ہیں تیری چشم میگوں میں حباب؟
پھر پلانے کے لئے لائی ہو دیرینہ شراب؟

آ گئی کیا پھر وہی طوفاں اٹھانے کے لئے؟　　زندگی کی شام میں ہنگام لانے کے لئے؟
مجھ کو اپنی دکھ بھری اجڑی جوانی کی قسم　　الفتِ ناکام کی غم کی کہانی کی قسم
آ گئے آنکھوں میں پھر منظر وہ سارے گھوم کے　　کر گئی تھی ٹکڑے ٹکڑے جب دلِ معصوم کے
تو گئی تو کرب کا سیلاب گھر کر آ گیا　　گھپ اندھیرا سا میری روحِ حزیں پر چھا گیا
ساری دنیا مجھ کو ویرانہ نظر آنے لگی　　اپنی ذاتِ خود بھی بیگانہ نظر آنے لگی
یاد تیری رات دن بیتاب رکھتی تھی مجھے　　بستر پر خار پر بے خواب رکھتی تھی مجھے
شام ہوتے ہی بلائیں گھیر لیتی تھیں مجھے　　شب کی تنہائیوں میں ڈر لگتا تھا اپنے آپ سے
رات بھر نشتر سا سینے میں لیے روتا تھا میں　　پوچھ لو تاروں سے کیا شب بھر کبھی سوتا تھا میں؟

تڑپتا رہتا تھا شب بھر مرغِ بسمل کی طرح
ماہی بے آب نالہ زار بلبل کی طرح

ضبط کرتا تھا اگر رونا تو گھبراتا تھا دل
روتے رہنے ہی میں کچھ تسکیں سی پاتا تھا دل

تیرگی میں اشک پلکوں پر بسا لیتا تھا میں
کہکشاں سا اپنی آنکھوں پر سجا لیتا تھا میں

برچھیاں دل پر چلاتی تھی چمک کر چاندنی
سرد راتوں کی وہ برق افشا ستم گر چاندنی

ٹیس سی اٹھتی تھی آوارہ گھٹائیں دیکھ کر
آگ لگ جاتی تھی پُر رنگیں فضائیں دیکھ کر

تیر سا چبھتا تھا رہ رہ کر کلیجے میں کہیں
نوکِ سوزن کی کسک اٹھتی ہی رہتی تھی وہیں

وہ ترا حسن و جوانی وار وہ باتیں وصل کی
یاد آتی تھیں تو تڑپاتی تھیں راتیں وصل کی

آنکھ میں تیرا تصور دل میں اک تیری خلش
ہائے تڑپاتی تھی کتنی آتشِ غم کی تپش

دور آبادی سے جنگل میں چلا جاتا تھا میں
غم کی تنہائیوں میں لطفِ زندگی پاتا تھا میں

بیٹھ جاتا تھا چٹانوں پر کنارے جھیل کے
اور تڑپاتے تھے پھر دلکش نظارے جھیل کے

لب پہ آجاتے تھے کچھ معصوم نغمے درد کے
اشک بن جاتے تھے پھر مغموم نغمے درد کے

تڑپتی تھی بنسری میں جب میرے دل کی صدا
بھول جاتے تھے ترانے طائرانِ خوش نوا

درد کے نغمیں جو سنتی تھیں فضائیں دشت کی
سسکیاں بھرتی تھیں رہ رہ کر ہوائیں دشت کی

کہتا جاؤں گا تو کہتا ہی چلا جاؤں گا میں
آپ روؤں گا سنا کر تم کو رلواؤں گا میں

ہو نہ پائے گا کبھی اُس دور کا پورا بیاں
ختم ہونے میں نہ آئے گی کبھی یہ داستاں

ہے عبث بے سود دہرانا کہانی درد کی
مصلحت ہے بھول ہی جانا کہانی درد کی

دیکھ! پہلو میں میرے سوئی ہے یہ جانِ حزیں
ہے منعکس اس کے چہرے پر دلِ اندوہ گیں

اس کے پہلو میں بھی غم دیدہ دل ناشاد ہے
زندگی اس کی بھی دردِ عشق سے برباد ہے

پیکر پژمردہ آنکھوں میں لیے یاس و ہراس
اُکھڑی اُکھڑی سی نگاہیں مضمحل چہرا اداس

یہ بھی تھی میری طرح اِس عارضے میں مبتلا
درد میں کچھ کم نہ تھا اِس کا فسانہ عشق کا

وقت اور ماحول کی سازش سے بہکائے ہوئے
مل گئے دونوں فریبِ زندگی کھائے ہوئے

ہو گئی میری شریکِ غم شریکِ زندگی
درد کی دنیا میں پیدا ہو گئی لذت نئی

موت کا خواہاں تھا میں جینے پہ اکسایا مجھے — بے دلی میں کس طرح جیتے ہیں سمجھایا مجھے
اس نے بتلائے مجھے اس عصرِ حاضر کے چلن — اس سے سیکھا درد پہلو میں لیے جینے کا فن
مجھ کو بھی اس دور میں مر مر کے جینا آ گیا — غم لیے پہلو میں ہنسنے کا قرینا آ گیا
اس کی آہیں ہی میرے زخموں کا مرہم بن گئیں — آرزوئیں مٹ کے داغِ سوزشِ غم بن گئیں
اس نے میری آنکھ سے بہتے ہوئے آنسو پیے — زخم جو تو نے لگائے تھے وہ اس نے سی دیے
میری راہوں میں جلائے اس نے اشکوں کے چراغ — کھل گئے ہیں پھول بن کر اب میرے سینے کے داغ
حسرتوں سے حسرتیں مل کر غزل خواں ہو گئیں — تڑپتی روحیں جو چیخیں لَے کا ساماں ہو گئیں
رفتہ رفتہ دشت و صحرا گلستاں لگنے لگا — رفتہ رفتہ یہ قفس بھی آشیاں لگنے لگا
دولتِ تسکیں میسر اب میرے شیون میں ہے — مرگ کی سی بے حسی اس سوختہ خرمن میں ہے
عشق کی محفل کے ہنگاموں سے ناطہ توڑ کر — جی رہے ہیں دونوں دو ٹوٹے ہوئے دل جوڑ کر
دے دیا وہ سب اسے جو کچھ کہ میرے پاس تھا — دل بھی دے دیتا مگر یہ دل تو تیرے پاس تھا

تجھ کو پا کر ساتھ اس کا چھوڑ دوں؟ ممکن نہیں
رشتۂ عہدِ وفا کو توڑ دوں؟ ممکن نہیں

□□

۱۰۔ بن گیا ہے آج ڈالر ساری دنیا کا خدا

عشق کے ہر غم کو سینے میں بسا لو دوستو!
اِس جہاں کو پیار کی بستی بنا لو، دوستو!

بن گیا ہے آج ڈالر ساری دنیا کا خدا
آج کے اِنساں کو ڈالر سے بچا لو، دوستو!

پھونک ڈالو حرص زر کے قصر و ایواں مُستعار
زر کی زد سے روحِ انساں کو بچا لو، دوستو!

عشق کے آتش کدے سے لے کے شعلہ نور کا
دل کو اپنے طور کا ہمسر بنا لو دوستو!

ڈھونڈھ کر لاؤ نئے جلوے حریم ناز سے
نو فروز اِک حسن کی محفل سجا لو دوستو!

کس قدر تاریکیاں ہیں قمقموں کے دور میں
دل میں پھر شمع محبت کی جلا لو، دوستو!

ہے صداقت بے وقوفی جھوٹ ہوشیاری کا نام
اپنے چہروں سے نقابوں کو ہٹا لو، دوستو!

مر چکا انساں تو پھر زندہ کرو اس لاش کو
زندگی میں پھر بنائے زیست ڈالو، دوستو!

لے کے اُٹھو نکہتوں کا کارواں مثلِ نسیم
بندشیں صحن و روش کی توڑ ڈالو، دوستو!

ناؔتھ سے کہہ دو نہ لائے لب پہ نالے درد کے
اشکِ غم ہر چشم تر سے پونچھ ڈالو، دوستو!

□□

۱۱۔ایک آواز

کیوں اے میرے شاعرِ آتش بیاں خاموش ہے
کیوں لبوں پر نطق کا سَیلِ رواں خاموش ہے
بے حسی چھائی ہے کیوں تیرے لبِ گفتار پر
خشک ہے کیوں روشنائی خامۂ پندار پر
تو مغنی دردِ اُلفت کا غم و آلام کا
تو پیاری رمزِ حق کا دولتِ الہام کا
سمفنی کا ایک دریائے رواں بہتا ہوا
گائے جاتا ہے ترانے رنج و غم سہتا ہوا
ہر نگاہِ ناز تیرے دل پہ عشوہ کار ہے
اس جہاں کے ہر حسیں چہرے سے تجھ کو پیار ہے
بوئے گل سے ہے معطر تیرے ایواں کی شمیم
لخلخۂ زلف سے مہکی ہوئی بادِ نسیم
نیم وا آنکھیں سدا رہتی ہیں کیفِ خواب میں
اضطرابِ حشر ساماں ہے دلِ بے تاب میں
چاک دامانی کسی کی، دیکھ کر روتا ہے تُو
دیکھ کر آنسو کسی کے اشکبار ہوتا ہے تُو
تلخیٔ دَوراں سے آزردہ دلِ رنجور کے
اشک تیری آنکھ میں ہیں یا ستارے نور کے
تُو ہے اپنے وقت کے ماحول کا آئینہ دار

ہر نئی آواز کا، تہذیب کا پروردِگار
اے مسیحِ وقت! اے گنجینۂ علم و ہنر
رہنمائے قوم و ملت، قوم کے جانِ جگر
دیکھ کیا حالت ہوئی اِس دَور کے انسان کی
مل گئی مٹی میں شوکت تیرے ہندوستان کی
بھائی بھائی کا ہوا دشمن، یہ ہے کیسا جنوں
منتشر ہے آج کیوں شیرازۂ امن و سکوں
اب کوئی پیغام بھی آتا نہیں افلاک سے
کیوں سدا توحید کی اُٹھتی نہیں آفاق سے
اُٹھ رہی ہے ابنِ آدم کی نگہہ تیری طرف
دیکھ وہ پھیلے ہوئے دستِ دعا تیری طرف
کھول کر دِکھلا ذرا اس سینۂ پُر داغ کو
آشکارا کر دلِ پرداغ کے ہر داغ کو
لے کے ہنگاموں میں بھر دے سوزِ الفت کا خروش
پھر سنا دے آج کے انساں کو آوازِ سروش
تا ابد ہر لب پہ ہوگا اس جہاں میں تیرا نام
بادشاہوں سے بھی بڑھ کر ہوگا تیرا احترام

دوسری آواز

کون ہے مجھ سے مخاطب کس کی یہ آواز ہے
یا مرا اپنا تخیل ہی کرشمہ ساز ہے
مائلِ پرواز کیوں ہے نغمہ پیرائی مری
پھر ترنم ریز کیوں ہے خامہ فرسائی مری

کیسی کیفیت ہے میرے ذہن پر مستور آج
ہو رہا ہوں ہائے کیوں رونے پہ پھر مجبور آج
روکنا جوشِ جنوں کیوں ہوگیا مشکل مجھے
ہچکیاں دیتا ہے کیوں پہلو میں میرا دل مجھے
کتنے عرصے سے دبا رکھا تھا اِس آواز کو
توڑ کر تاریکیوں میں رکھ دیا تھا ساز کو
ہوگیا مجبور عریانی کو پھر یہ راز کیوں!
بج اٹھا ہے خود بخود آخر شکستہ ساز کیوں!
دل میں پھر پیدا ہوا شوقِ جراحت کا جنوں
آنکھ سے افشاں ہے پھر ذوقِ نیاحت کا جنوں
کوشش ضبطِ فغاں شدت سے گھبرانے لگی
دل کے سنسانوں سے چیخوں کی صدا آنے لگی
جذبۂ دل مصلحت سے برسرِ پیکار ہے
حشر آمادہ سرشکِ دیدۂ خوں باز ہے
سینہ کاوی کا جنوں ذہنِ رساء پر چھا گیا
روشنائی بن کے خوں نوکِ قلم پر آگیا!

□□

۱۲۔ مجھ سے بڑھ کر اِس جہاں میں معجزہ کچھ بھی نہیں

برق رَو ذرّہ ہوں میں، خوفِ فنا کچھ بھی نہیں
بجلیوں کا شور طوفانِ قضا کچھ بھی نہیں

دُوریاں، لاچاریاں احساس کا اعجاز تھیں
ورنہ حائل درمیاں میں فاصلہ کچھ بھی نہیں

تیرتے ذرّے ہیں گویا تُند طوفانوں میں ہم
اِبتدا کچھ بھی نہیں اور اِنتہا کچھ بھی نہیں

اِک مرے ہونے سے ہی ہے آب و تابِ زندگی
ورنہ یہ شمس و قمر، ارض و سما کچھ بھی نہیں

حسن کی رعنائیاں اور عشق کی دُشواریاں
زِندگی کا مدعا اِس کے سوا کچھ بھی نہیں

عشق کی خونباریوں نے ہی نکھارا ہے اِنھیں
یوں لب و رخسار میں اپنی جلا کچھ بھی نہیں

قہقہے کچھ، چند آہیں اور شب بیداریاں
اور میری زندگی کا ماجرا کچھ بھی نہیں

ذرّے ذرّے میں ہے عریاں سوزِ الفت کا کمال
عشق ہی میرا خدا ہے اور خدا کچھ بھی نہیں

میری ہستی میں عیاں کونین کا ہر راز ہے
مجھ سے بڑھ کر اس جہاں میں معجزہ کچھ بھی نہیں

ہے نہاں دل میں مرے کون و مکاں کی وسعتیں
مجھ کو زاہد تیرے جنت کی فضا کچھ بھی نہیں

میرا حاصل انتہائے سعی لاحاصل میں ہے
اِس بلندی کا مقامِ ارتقا کچھ بھی نہیں

کس قدر زور تکلم ہے خموشی میں مری
بے اثر ناقوس ہے بانگِ درا کچھ بھی نہیں

میں لٹاتا ہوں گہر رگھوناتھ دُنیا کو مگر
وہ یہ کہتے ہیں یہ اشکوں کے سوا کچھ بھی نہیں

□□

پروین اے راؤ (امریکہ)

ٹیسٹ ٹیوب بے بی

تم کب مر گئے، مجھے خبر ہی نہ ہوئی
میں تمہیں زندہ سمجھتی رہی
تمہاری مردہ اولاد کو جنم دیتی رہی
اور ہر نومولود کو، مردان خانہ کی بھینٹ چڑھاتی رہی
میں جانتی تھی کہ انھیں بھی حنوط کیا جارہا ہے
خوب صورتی سے، بالکل تمہاری طرح
کمالِ فن کی داد دیتی ہوں کہ
میں!
تمہاری سانسوں کے قریب جانے والی نہ پہچان سکی کہ
تم مر چکے ہو
مگر ابھی تو کچھ دن پہلے تمہارے بازو بڑے جوش سے پلتے تھے
کبھی دایاں بازو، کبھی بایاں بازو
تمہاری آنکھوں میں، ہونٹوں میں جنبش تھی
زندگی کی، سرخی تھی
کتنے پیارے لگتے تھے
ہاں مگر خوفناک بھی

جب کھردری زبان سے
میرے تلوے پیار میں نہیں" کہ
اس غرض سے چاٹتے تھے کہ سیسہ پلائی
'زنان خانہ' کی اس چاردیواری سے باہر نہ جاسکوں
اور میں تمہارے کمزور پیلے دانتوں کو بھی
کشار سے تشبیہ دیتی رہی، خود کو دبکاتی
اور تمہیں پیار کرتی رہی
کہ تم زندہ ہو
تمہارے گال سرخ ہیں
اپنی کوکھ کی جنی ساری
تمہارے بیٹوں کے ساتھ، رغبت سے سونے کی تربیت دیتی رہی
کہ یہ ہی اُن کا انعام ہے[1]
اور نکیل سے تیکھی نتھ پہن کر
چابک کے سائے میں
خود کو تمہاری اقدہانکتی رہی
بنا یہ جانے کہ مردہ بیجوں کی تخم ریزی سے جُتی ہوں
کیونکہ
تم کب مرگئے، مجھے خبر ہی نہ ہوئی
تھے تو حنوط مگر ہو بہو زندوں کی طرح
تم کو باندھے ان
مردان خانہ میں
تمہارے ذریعے کیا کیا حاصل کیا

---

[1] تمہیں اپنے شوہروں کے ساتھ رغبت سے سونا چاہیے۔ کیونکہ یہی تمہارا انعام ہے (قرآن شریف کی آیت)

یہ تو وہی جانیں
میں تو تب کھٹکی
جب زنان خانہ کے رنگ آلود قفل ٹوٹے
طلسم بھری آوازیں مجھے پھسلانے لگیں
اور تم گونگوں بہروں کی طرح ان میں شامل ہو گئے
تو جان گئی تم تو کب سے مر چکے ہو، مجھے ہی خبر نہ ہوئی
طلسم بھری آوازیں پھر اُبھریں مجھے پھسلانے لگیں
مگر مجھ میں
ہوس کم اور برداشت زیادہ ہے
غرض کم اور ممتا زیادہ ہے
سو، وہ غالب نہ آسکیں
میں زندہ ہوں
اور عہد کرتی ہوں کہ
اب تمہارے ساتھ رغبت سے سوؤں گی
کہ یہ تو مجھ خمار آلود کرتی ہے
اور تمہارے زندہ یا مردہ ہونے کی تمیز بھلا دیتی ہے
میں زندہ ہوں اور عہد کرتی ہوں کہ
تمہاری بَری میں لائی ہوئی تمام چیزیں
مذہبی تعصب، پیر کی بیڑی اور بلادستی
سب ایک ساتھ تمہارے تابوت میں دفن کر دوں گی
کہ تمہارے یوں چلے جانے کے بعد
انھیں ساتھ رکھنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں رہا
میں زندہ ہوں اور عہد کرتی ہوں کہ
حنوط شدہ عضوِ تناسل کی بجائے

اس سرنج کو ترجیح دوں گی
جس میں ایک زندہ انسان کا دان کیا ہوا
تخم رکھا ہوگا، جسے سینچوں گی
اور مردان خانہ کی بھینٹ چڑھائے بغیر
زندگی کی سرخ لہروں میں تیرنا سکھاؤں گی

□□

نوٹ:

مرحوم رگھو بھائی اور بھابھی (محترمہ راج رانی صاحبہ) اپنے بڑے فرزند۔ بہو اور پوتے پوتی سے ملنے اکثر امریکہ جایا کرتے تھے۔

ایسے ہی سفر کے دوران کھئی صاحب کی ملاقات محترمہ پروین اے راؤ صاحبہ سے ہوگئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں خاصے اچھے دوست بن گئے۔ آزاد خیال رگھوناتھ کی اپنے ہی جیسی ایک روشن ذہن خاتون سے ملاقات ایک ایسا انوکھا اور دلچسپ اینکاؤنٹر تھا جس کی یاد اُنھیں مدتوں گرماتی رہی۔

پروین صاحبہ کی یہ نظم وہ اپنے ساتھ ہندوستان لے آئے تھے۔ کافی ہاؤس کی ایک شام کی ملاقات کے دوران انھوں نے یہ فن پارہ تناظر میں اشاعت کی غرض سے مجھے تھما دیا۔ ان دنوں میں تناظر کے چار شمارے ایک ساتھ مرتب کر رہا تھا۔ مہینوں سے جٹائی ہوئی دیگر ادبی تخلیقات میں اُن کی طویل نظم ''پیری میں عشق'' بھی شامل تھی۔ 'ٹیسٹ ٹیوب بے بی' کے عنوان سے اُن کے اس امریکی آشنا کی نظم کو میں نے ان ہی کی نظم کے ساتھ جما دیا تو اُنھیں اچھا لگا۔

چار شماروں اور ۴۱۶ صفحات پر مشتمل یہ بڑا شمارہ عزت مآب جناب اندر کمار گجرال کے دستِ مبارک سے اپریل ۱۹۸۹ء میں رونما ہوا تھا اور کافی سراہا گیا تھا۔ اس خصوصی شمارے میں یہ فن پارہ دوبارہ شائع کرتے ہوئے میں فخر محسوس کر رہا ہوں۔

دیولوگ کے نئے باسی، شو بھگت رگھوناتھ کھئی میرا شکرانہ قبول کرو۔

—— بلراج ورما

انتخاب رگھوناتھ گھئی

فنکار

کالی داس گپتا رضا۔ مظہر امام ۔کرشن موہن ۔ رام پرکاش راہی۔ پریم بہاری لال سکسینہ رواں۔ اقبال محمد ۔ پیغام آفاقی ۔رمیش تنہا۔ سیماب سلطانپوری۔ ملک زادہ جاوید۔کلدیپ گوہر۔ عازم گوروبندر سنگھ کوہلی۔ حقیر آستانی۔ چندر بھان خیال۔ساحل احمد۔

☆ ☆ ☆

انتخاب : شام یاراں اور تشنگان ادب کی فائلوں سے

ڈی راج کنول۔جگدیش جین۔ برھمانند جلیس۔رام پرکاش راہی۔پریم بہاری لال سکسینہ رواں۔ سیماب سلطانپوری۔ عازم گوروبندر سنگھ کوہلی۔ پروفیسر ڈاکٹر دھرمندر ناتھ۔ڈاکٹر جی آر کنول۔ملک زادہ جاوید۔رمیش تنہا۔دلبر نورانی۔منور سرحدی۔نرمل سنگھ نرمل۔موہن سنگھ بسمبھی موہن۔نظمی سکندر آبادی۔منشی شمس العارفین عارف۔طالب چکوالی۔عزیز بگھروی۔کندن لال کندن۔ ہیرانند سوز۔رادھا کرشن سہگل۔کلدیپ گوہر۔امرتا پریتم (پنجابی کویتا)۔اُرمل ستیہ بھوشن (ہندی کویتا)۔ اندر بھٹنا گر نکہت (ہندی کویتا)۔سویتا چڈھا (ہندی کویتا) ڈاکٹر رنجنا اگروال (ہندی کویتا)۔مکتی ورما (ہندی کویتا)۔

شامِ یاراں — ایک پرانی تحریر

رگھوناتھ گھئی مرحوم کی روشن خیالی، جرأت مندانہ رہنمائی اور اُردو دوستی کا ایک اہم باب اُن کا مشہور ادارہ ''شام یاراں'' تھا جو مدتوں دہلی کے ادبی، خصوصاً شاعرانہ ماحول کی چمک دمک کو قائم رکھے رہا۔

اب جب کہ وہ ہمارے درمیان نہیں رہے، ہم اُن کی ادبی خدمات اور علم دوستی کا اعتراف کرتے ہیں۔ شام یاراں کا مختصر سا تعارف اُن کی اپنی قلم سے شامل ہے اور شامل ہیں اُن چند شاعروں کے قلم سے وہ مختلف اشعار جو انھیں خاص طور پر پسند تھے۔

گھئی صاحب کا یہ انتخاب کامریڈ کلدیپ گوہر نے اس شمارے کے لیے خاص طور پر مرتب کیا ہے۔

آج جب کہ دہلی میں متعدد ادبی ادارے، ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک اور ادبی محفل کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے ادارے اس شہر میں وقتاً فوقتاً ادبی محفلوں کا اہتمام کرتے رہتے ہیں اور یہ محفلیں عوام میں کافی مقبول بھی ہیں۔ لیکن اگر ہم ان اداروں کی سرگرمیوں پر غور سے نظر ڈالیں تو ہمیں اس حقیقت کا احساس ہوگا کہ ان میں سے بیشتر یا تو سیاسیات یا گروپ بندی کا شکار ہیں یا ذاتیات کے زیرِ اثر ہیں۔ ایسے ماحول میں فن کار کے جذبات گھٹ کر رہ

جاتے ہیں اور وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، کہہ نہیں پاتا۔ اس کی ادبی صلاحیتیں سیاسی گٹھ بندی اور گروپ بازی میں بندھ کر رہ جاتی ہیں۔ کئی ایک دیگر ادبی اداروں کی فضا محکمانہ سی ہے۔ گویا وہ کسی خاص قسم کے نظم و نسق کے پابند ہوں اور انھیں ایک خاص قسم کا محکمانہ نظم و نسق کنٹرول کرتا نظر آئے گا۔ جو ادارے ذاتیات کے زیرِ اثر ہیں، وہاں چند افراد اپنی شخصیتوں کو اُبھارنے کی کوشش میں کارفرما معلوم ہوتے ہیں۔ دریں حالات ادبی محفلیں مطلب براری اور مصلحت کی غُلام بن کر رہ گئی ہیں اور ان کا ماحول ادبیات کے پنپنے کے موافق نہیں۔ ان حالات کے پیشِ نظر ایک ایسی محفل کی ضرورت ہے جو سیاسیات، گٹھ بندیوں اور تعصّبات سے آزاد ہو اور جہاں اہلِ فن مل کر اس طرح کا ماحول پیدا کریں کہ جس میں احساسات اور تاثرات کا آزادانہ اظہار ہو سکے۔ اور ادبی ذوق و شوق کو اُبھارنے میں مدد مل سکے۔

ہماری زبان زندگی سے بھرپور ہے۔ اور انشاءاللہ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اگر ہم اپنے وابستہ شعراء کی متحدہ کوششوں سے ہر سال دو چار ایسی تصانیف پیش کر سکیں، جو اردو ادب کی عزت اور عظمت کا باعث ہوں، تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری محنت ناکام نہیں ہوئی۔

''شامِ یاراں'' کی محفلیں پچھلے کئی سالوں سے باقاعدہ ہر ماہ منعقد کی جاتی رہی ہیں اور اہلِ نظر کی معاونت سے یہ محفلیں کافی کامیاب بھی رہی ہیں۔ شعرا حضرات اچھی خاصی تعداد میں شرکت فرماتے رہے ہیں اور اپنے اپنے کلام سے اربابِ محفل کو محظوظ کرتے رہے ہیں۔

ہم سب اس امر سے آگاہ ہیں کہ دہلی میں کئی ایسے ادیب اور شعرا حضرات موجود ہیں، جن کی تخلیقی صلاحیتیں نسبتاً زیادہ مشہور و نامور ادیبوں سے کسی طرح کم نہیں۔ ''شامِ یاراں'' کو ایسے شعرائے کرام کی مخلصانہ رفاقت ہمیشہ حاصل رہی ہے اور ہمیں یقین کامل ہے کہ ہم ایسے حضرات کے تعاون سے اردو ادب کے لیے صحت مند ماحول پیدا کرنے میں پہلے ہی کی طرح کامیاب رہیں گے۔

رگھوناتھ گھئی کنوینر شامِ یاراں

انتخاب رگھوناتھ گھئی

نام کتاب : غزل گلاب
نام مصنف : جناب کالی داس گپتا رضاؔ

ہمارے گھر کا پتا چاند یاد کیا رکھتا
کہ بے گھری کے سوا اپنا کوئی گھر ہی نہیں

●

کوئی تو لائے گا مٹھی میں ہوائیں بھر کر
کوئی تو ٹھہرے سمندر کو روانی دے گا

●

کوئی کیوں کر مری بستی میں رہے گا پیاسا
خشک پتھر بھی نچوڑو گے تو پانی دے گا

●

جہاں مڑو گے وہیں حادثے کا امکاں ہے
یہیں تھمے رہو کچھ دیر کے لیے لوگو

●

ٹھٹھرتی رات بھی ہے کوئی جاگتا بھی نہیں
الاؤ جلتا ہے تھوڑی سی آگ ہی لے لیں

●

ذہنوں سے شرر پھوٹیں حرفوں سے دھواں اُٹھے
اب جو بھی نتیجہ ہو اک آگ لگا لی ہے

●

بس یہیں تک تھی حدیثِ زندگی
اِک دیا بجھ کر دھواں دینے لگا

●

میں اُن گہرائیوں میں ہوں جہاں اب
سمندر بھی کنارا ہوگیا ہے

●

جیون کے گہرے پانی میں لاکھ سیاہی ہے لیکن
پیار بھی اک دریا ہے، جس میں چاند ستارے بہتے ہیں

●

ہم تو سمجھے تھے گزر آئے چمن سے بچ کر
کتنی گنجائشیں دامن میں رفو کی نکلیں

□□

نام کتاب : پالکی کہکشاں کی
نام مصنف : جناب مظہر امام

کوئی قصہ تو بنے کوئی حکایت تو لکھے　　اس سلیقے سے یہ بات اُچھالی جائے

●

تمام لذّتِ کام و دہن اُسی سے تھی　　وہ مہماں تھا مگر میزبان کتنا تھا

●

کہا یہ سب نے کہ جو وار تھے اُسی پر تھے　　مگر یہ کیا کہ بدن چُور چُور میرا تھا

●

کب ڈوب کے مرنے کی خوشی تھی ہمیں لیکن　　کشتی کو کہاں لاتے کہ ساحل ہی نہیں تھا

●

یہ تجربہ بھی کروں یہ بھی غم اُٹھاؤں میں　　کہ خود کو یاد رکھوں اُس کو بھول جاؤں میں

●

اِس دوراہے پہ کھڑا سوچ رہا ہوں کب سے　　تجھ سے بچھڑوں کہ زمانے سے جدا ہو جاؤں

●

تُو ہے گر مجھ سے خفا خود سے خفا ہوں میں بھی　　مجھ کو پہچان کہ تیری ہی ادا ہوں میں بھی

●

اُس نے کس ناز سے بخشی ہے تجھے جائے پناہ　　یوں کہ دیوار سلامت ہو مگر گھر نہ رہے

●

میرے روکے نہ رُکا وقت کا طوفاں لیکن　　اک دیا میں نے سرِ راہ جلایا تو سہی

●

تمہاری شب کا اُجالا تو سب نے دیکھا ہے
مری سحر کے اندھیرے کو کون دیکھے گا

□□

نام کتاب : بے صحرا
نام مصنف : جناب کرشن موہن

قطعات

مجھے کیا آئے جینے کا سلیقہ
کہ پیہم سوچ ہے میرا طریقہ
درخشانی جوانی کی کہانی
اُداسی، عہدِ پیری کی رفیقہ

محبت کی کہانی اوڑھ لی ہے
رِدا ایسی سُہانی اوڑھ لی ہے
ہوس آمیز رنگیں شعر کہہ کر
بزرگی پر جوانی اوڑھ لی ہے

کرشن موہن شعار ہے میرا
شوق کے راستے میں کھو جانا
اب تو ہے میری زندگی گویا
سوچنا اور اُداس ہوجانا

تمناؤں سے جالے جُڑ گئے ہیں
خوشی کے قافلے سب مُڑ گئے ہیں
یہ کیسا سوزِ محرومی ہے طاری
مرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے ہیں

□□

۴۔ غزلیں

کرشن موہن

(۱)

اگرچہ آج بھی تو آس پاس لگتی ہے
تیرے بغیر یہ دُنیا اُداس لگتی ہے

وقارِ نفس کی اُمید ، یاس لگتی ہے
کہ اب حیات فقط التماس لگتی ہے

یہ آب و تاب بدن ہے حجابِ حسن و شباب
برہنگی بھی ہمیں اب لباس لگتی ہے

جو تُو نہیں تو مسرت کی آرزو بھی نہیں
یہ بزمِ عیش مجھے بدحواس لگتی ہے

تری حیات بھی اے یارِ غم گُسار مجھے
کتابِ درد کا اقتباس لگتی ہے

سکوں کبھی دلِ بے تاب کو نہیں ملتا
وفورِ شوق میں بجھ کر بھی پیاس لگتی ہے

اگرچہ دُکھ سے عبارت ہے ہستیِ انساں
عجب ہے، پھر بھی سراپا سپاس لگتی ہے

□□

(۲)

ہستی کا حاشیہ نشیں ہوں
ہرچند کہوں کہ ہوں، نہیں ہوں

آکاش پہ اڑ رہا ہوں، پیہم
دھرتی کا مکینِ خوش یقیں ہوں

ڈھونڈو گے مجھے تو پا ہی لوگے
کوشش تو کرو، یہیں کہیں ہوں

پرانہ سری بھی کیا ستم ہے
تنہا ہوں، بیکس و حزیں ہوں

کیوں دل کو یہ وہم ہوگیا ہے
میں باعثِ رونقِ زمیں ہوں

دل ٹوٹ چکا ہے کرشن موہن
جسماً بھی موت کے قریں ہوں

□□

(۳)

تیری ہستی کا رازِ دِلجو ہوں
تُو نہیں تُو ہے مَیں مگر تُو ہوں

ناچ کے بعد اُتار پھینکا ہو
نرتکی نے جسے وہ گھنگھرو ہوں

خوش ہوں تھوڑی سی روشنی پا کر
میں شب آرزو کا جگنو ہوں

مَیں روایت کے بند کمرے میں
بند کیسے رہوں کہ خوشبو ہوں

کب مرا دل لگا ہے دنیا سے
مَیں گرہست آشرم کا سادھو ہوں

میرا دل بھی ہے کفر سے برہم
مَیں مسلماں نہیں، پرنتو ہوں

کرشن موہن کہے مرا ہر شعر
آرزوئے شبابِ خوشخو ہوں

□□

(۴)

آرزو تدبیر ہوکر رہ گئی
جستجو تاخیر ہو کر رہ گئی

سوچ کی آواز کتنی تیز ہے
خامُشی تقریر ہو کر رہ گئی

کاٹ ہے الفاظ کی کتنی شدید
گفتگو شمشیر ہو کر رہ گئی

عہدِ حاضر کی کتابی شاعری
فکر کی جاگیر ہو کر رہ گئی

آہ یہ دِن رین کی بے چین سوچ
جو مری تقدیر ہو کر رہ گئی

میرے فکر و فن کی عظمت آخرش
شوخیٔ تحریر ہو کر رہ گئی

کرشن موہن خواب کی تعبیر بھی
درد کی تفسیر ہو کر رہ گئی

□□

داغوں کے باوجود

''پکاسو'' اور ''رسل'' واسنائی تھے
وہ دونوں تھے بتانِ شوخ دہر جائی کے شیدائی
''رسل'' کا ایلیٹ کی اہلیہ سے بھی یارانہ
(کہ تھی کم ایلیٹ کی قوت جنسی رہا وہ اِک تماشائی)
مگر یہ داغ ہرگز ان کی عظمت کم نہیں کرتے

□□

بہرہَ وافر

(Lions Share)

شیرنی کا فرض کرنا شکار
اور اس کا لیش کرنا شیر کو
اپنا حصہ پہلے کرتا ہے تناول شیر نر
بعد میں کھاتی ہے اُس کی شیرنی
اس طرح ہی پیروکار
اپنے اپنے لیڈروں کے ہوتے ہیں خدمت گذار

□□

نظمیں

یلغار

مصری کی قاش پر
چیونٹیوں کی یلغار
ایسے ہی میرے من پر
چنتائیں ہیں سوار

چار چیزیں

قابلِ زیست اِن سے جیون
چار چیزیں ہیں مہان
پیار، اُمید، مدد اور مُسکان

□□

نام کتاب : دریچے
نام مصنف : جناب رام پرکاش راہی

نظر جو نقدِ مصوّر سے اُٹھ گئی راہی میں ہر لکیر کو تصویر مان لیتا ہوں

●

تو لاکھ زہر گھول مگر اے غمِ حیات تیری بساط کیا ہے غمِ عاشقی کے بعد

●

رگ رگ سے نہ کیوں اُبھرے جذبات کی موسیقی اُمید نے چھیڑی ہے پھر شوق کی شہنائی

●

پلٹ کے آئیں نظر ہی نظر کے اندازے نظر سے اپنی جو اپنا ہی آئینہ دیکھیں

●

مری معصوم فطرت ہی مری ہستی کا حاصل ہے رُلا دو گے تو رو دوں گا ہنسانے پر ہنسوں گا میں

●

دکھا کے جلوہ وہ چھپ بھی جائے تو کائناتِ اثر رہے گی نظر کے بس میں نہ دل رہے گا نہ دل کے بس میں نظر رہے گی

●

آمدورفت کی بہتی جمنا رودِ چناب نہ بن پائے گی رانجھا رانجھا کرتے چہرے لاکھ کہیں "ہم ہیریں ہیں"

●

میری صورت جو بُجھی ہے تو بجھی رہنے دو میرے سینے سے مرا سوزِ دروں مت چھینو

●

کوئی بیگانہ اگر ہو تو تکلّف بھی کریں تجھ کو بھی آپ پکاریں یہ کوئی بات ہوئی

●

ناکامیِ اُلفت میں آیا ہے مقام ایسا
تقدیر کے سجدے ہیں تسلیم ہی ایمان

□□

نام کتاب : عکسِ جمیل
نام مصنف : جناب پریم بہاری لال سکسینہ رواںؔ

یہ دل میں کون آیا چپکے چپکے یہ کس نے دی مجھے آواز دیکھو

●

ضروری تو نہیں طوفان ہی میں کشتیاں ڈوبیں کبھی ساحل پہ آ کر بھی سفینے ڈوب جاتے ہیں

●

تو نے دنیا کے اندھیروں میں دھکیلا ہم کو تیری دنیا میں کیا پھر بھی اُجالا ہم نے

●

محبت کی کوئی قیمت مُقرّر ہو نہیں سکتی یہ جس قیمت پہ مل جائے اُسی قیمت پہ سستی ہے

●

محبت میں جینا محبت میں مرنا یہی میری دنیا یہی میرا دیں ہے

●

شعر کہیے تو اِس طرح کہیے جیسے ہوتی ہے بات آپس میں

●

کچھ تمہاری مہربانی ہوگئی بات ورنہ بن چلی تھی دوستو!

●

مئے پیا کرتے ہیں پینے کی طرح ہم جیا کرتے ہیں جینے کی طرح

●

زندگی کیا ہے یہ سمجھ پانا میرے بس میں نہ آپ کے بس میں

●

بتانے پہ آؤں تو سب کچھ بتادوں
مگر کچھ خیال آپ کا کر رہا ہوں

□□

نام کتاب : زمین شعر
نام مصنف : جناب اقبال عمر

جان بیچ کر لکھنا گھر اُجاڑ کر لکھنا عرضِ واقعی لکھنا حرفِ معتبر لکھنا

●

اُنہی لوگوں میں اُٹھنا بیٹھنا اچھا لگا ہم کو جو اپنا ذہن اپنی آنکھ اپنے کان رکھتے ہیں

●

یہی تو سوچ کے اقبالؔ کو ندامت ہے شجر کے سائے میں ہم تھے شجر پہ دھوپ رہی

●

ہمارے پاؤں کے نیچے زمین ایسی تھی قدم قدم پر گماں جس پہ آسمان کا تھا

●

ہم کو معلوم نہ تھا ایسے بھی دِن آئیں گے کوئی سچ بول رہا ہو تو بُرا لگتا ہے

●

نیرنگیِ جہاں کو ہم خوب جانتے ہیں اک ذات گھر سے باہر اک ذات اپنے گھر میں

●

کون یاد رکھتا ہے ایسی ویسی باتوں کو جس کو یاد رکھنا ہو اُس کو یاد ہوتا ہے

●

موسموں کی باتوں تک گفتگو رہی اپنی میں نے کب کہی اپنی تم نے کب سنی اپنی

●

جس شہر میں گیا ہوں میرے شہر کی طرح ہر شخص اپنی آگ میں جلتا ہوا ملا

●

گھر میں رہ کر سوچتا رہتا تھا کیا ہے کائنات
گھر کے باہر سوچتا یہ ہوں کہ گھر میں کیا نہ تھا

□□

نظم: اجنبی آسمان کے سائے میں

ٹیڑھی میڑھی سی رہ گذر ہے مگر
آؤ کچھ دور اور ساتھ آؤ
پھر ملے یا ملے نہ یہ موقع
آج ہر چیز دیکھتی جاؤ

حادثہ شہر میں ہوا جو کل
کچھ نہ کچھ تم نے بھی سنا ہوگا
اور جب شہر کا یہ عالم ہے
کون جانے کہ میرا کیا ہوگا

وہ جو اک جھیل دیکھتی ہو تم
کس قدر میں وہاں پہ رویا تھا
اپنے ہاتھوں پہ رکھ کے سر اپنا
رات بھر پتھروں پہ سویا تھا

آج ہم تم کھڑے ہیں پُل پہ مگر
چڑھتے دریا کا کیا ٹھکانہ ہے
وقت کے بیکراں سمندر میں
ہر سفینے کو ڈوب جانا ہے

بعد صدیوں کے اب ملی ہو تم
آؤ سب کچھ تمھیں دکھا لاؤں
اور پوچھوں کہ اِس جگہ سے اب
تم بتاؤ کہ میں کہاں جاؤں

آؤ بانہوں میں میری آجاؤ
چلتے چلتے تو تھک گیا ہوں میں
آؤ آجاؤ کہ تمہارے لیے
کھویا کھویا بہت رہا ہوں میں

ہر طرف بتیاں اُداس ہیں کیوں
اور یہاں کیوں کوئی چراغ نہیں
کیا یہ سچ ہے سدا بہار ہو جو
کوئی دنیا میں ایسا باغ نہیں

کس قدر تم نے یاد مجھ کو کیا
قطرہ قطرہ یہ اب بتاؤ تم
آؤ اس جھیل کے کنارے تک
آؤ چپکے سے بیٹھ جاؤ تم

کس قدر خوابناک ہے دنیا
تم کو اُس وقت یہ پتا بھی نا تھا
کس قدر پیار تم کو تھا مجھ سے
تم نے لیکن کبھی کہا بھی نہ تھا

یہ سفر تھا عجیب ختم ہوا
اب تو یادوں کے پار کچھ بھی نہیں
کتنا فرسودہ ہوگیا ماضی
وہ خزاں وہ بہار کچھ بھی نہیں

نام کتاب : حرفِ تنہا
نام مصنف : جناب رمیش تنہاؔ

پہنچے بھی کسی در پہ تو دستک ہی نہیں دی
آغاز کے ڈر سے کبھی انجام کے ڈر سے

●

کسی بھی چیز کا مجھ پر اثر نہیں ہوتا
جو دیکھ کر بھی نہ دیکھے وہ آئینہ ہوں میں

●

ایک سایۂ تھا ہمارے آس پاس
دھوپ نے جب بھی ہمیں آواز دی

●

چپ رہ کے بھی کر سکتے ہو دنیا کی قیادت
کیا تم نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

●

میرا کیا ہے میں تو احساس کی لو ہوں تنہاؔ
جی میں جب آئے بجھا لو کہ جگا لو مجھ کو

●

چلنا تھا پا برہنہ مجھے تیز دھوپ میں
اور دشت بے گیاہ مرے راستے میں تھا

●

میں زندگی بھی ہوں اور زندگی کا نوحہ بھی
ہوا چراغ سے کہتی گئی گزرتے ہوئے

●

پھر یوں ہوا کہ روشنیوں سے جھٹک کے ہاتھ
پرچھائیوں سے لوگ. ہم آغوش ہو گئے

●

جو تصوّر میں بات پلتی ہے وہ ضروری نہیں نگاہ میں ہو
ہے تصوّر کا دائرہ اپنا ہیں نگاہوں کے زاویۓ اپنے

□□

نام کتاب : عکس برآب
نام مصنف : جناب سیماب سلطان پوری

دیئے بیچتے تھے جو بازار میں انہیں کے گھروں میں اُجالا نہ تھا

●

سب کے ہمراہ تھی غرض اُن کی بے غرض میں تھا رہ گیا تنہا

●

دیکھتا ہوں تیرگی کب تک نگلتی ہے تجھے کل نئے سورج کا چہرہ پھر لگا کر آؤں گا

●

تیرگی میں یہ تو ممکن ہے کہ کھو جائے نظر ورنہ سایہ تو یقیناً ساتھ چلتا جائے گا

●

آؤ بازار سے اِک آئینہ ہی لے آئیں گھر میں آنے پہ کوئی اِک تو شناسا ہوگا

●

میں پی گیا ہوں یہی سوچ کر ترے آنسو حسین آنکھوں کا پانی شراب ہوتا ہے

●

لبوں سے حرفِ محبت ادا نہیں ہوتا نظر نظر سے سوال و جواب ہوتا ہے

●

میں اک چراغ لاکھ چراغوں میں بٹ گیا رکھا جو آئینوں نے کبھی درمیاں مجھے

●

نہ جانے کیوں مری نظریں تھیں آستیں کی طرف بڑھا رہا تھا کوئی ہاتھ دوستی کے لیے

●

خوبصورت جو بھی ہوگا مجھ کو دیکھے گا ضرور
آئینہ سا میں لگا بیٹھا ہوں اک دیوار سے

□□

نام کتاب : کھنڈر میں چراغ
نام مصنف : جناب ملک زادہ جاوید

گئے موسم کے کپڑے رکھ رہا ہوں سفر کرنے کی تیاری نہیں ہے

●

پرانی یادوں کے البم سنبھال کر رکھنا گئے زمانوں کے منظر کھنڈر سے نکلیں گے

●

گرتے ہوئے مینار حویلی کے تو دیکھے تم نے مرے اجداد کی عظمت نہیں دیکھی

●

یہاں کس کو صدا دیتے ہو بابا حویلی میں کوئی رہتا نہیں ہے

●

اس محلّے کے مکاں ہیں ایک سے گھر پہ اپنے نام کا کتبا لگا

●

ساحل کی ریت اٹھائی نشانی کے طور پر پانی کی تہہ میں جب کوئی گوہر نہ مل سکا

●

اسی چٹان سے پتھر کے آدمی دیکھو ذرا سی دیر میں میرے ہنر سے نکلیں گے

●

امیر زادے جو خود کو سنبھال کر رکھتے حویلیوں کا مقدّر کھنڈر نہیں ہوتا

●

نہ جانے کون سی آفت اِدھر سے گزرے گی پرندے چھوڑ کے جاتے ہیں گھونسلہ اپنا

●

بیتے دنوں کی یاد ہوں کل کا سراغ ہوں
اے زندگی میں تیرے کھنڈر کا چراغ ہوں

□□

نام کتاب : نوائے احساس
نام مصنف : جناب کلدیپ گوہر

رستہ میری منزل کا ہے محفوظ کہ اس میں مسجد نہیں آتی کوئی مندر نہیں آتا

●

مجھے یقیں ہے کہ میں بخوبی خلا میں پرواز کر سکوں گا ابھی میرا حوصلہ جواں ہے ابھی تو ہمت ہے بال و پر میں

●

فریب کھائے ہیں بارہا ہم نے زندگی میں فریب دینے کا ہم کو لیکن ہنر نہ آیا

●

اس قدر دیکھے ہیں جلتے ہوئے گھر ہم نے کہ اب ایک جگنو بھی لپک جائے تو ڈر لگتا ہے

●

ایک خانہ خراب ہی سمجھے ایک خانہ خراب کی دنیا

●

نگاہِ دَہر میں ہوں قابلِ پرستش میں خود اپنی ذات سے لگتا ہے مجھ کو ڈر کتنا

●

بہت قربانیاں اِس راستے میں کرنی پڑتی ہیں فقط گھر چھوڑنے ہی سے کوئی گوتم نہیں ہوتا

●

زندگی کی تلخ سچائی عیاں کرتی ہے یوں آتی ہے کچھ دیر رکتی ہے چلی جاتی ہے دھوپ

●

اِسی اُمید پہ ہم کر نہ سکے ترکِ وفا شاید اُن کی جو نہیں ہے کبھی "ہاں" تک پہنچے

●

کیا کرتی ہیں میرا خیر مقدم گھر میں آنے پر
سفر پر جب نکلتا ہوں دعا دیتی ہیں دیواریں

□□

نام کتاب : آغاز
نام مصنف : جناب عازم گورویندر سنگھ کوہلی

یہ کیسا انصاف ہے یارب کیسا کھیل ہے قسمت کا کچھ ہاتھوں میں رنگِ حنا ہے کچھ میں صرف لکیریں ہیں

●

سیرِ گلشن کو تم اگر آؤ ٹہنیوں پر گلاب آجائیں

●

اک جیسی نفرتوں کے سبھی ہیں شکار ہم اتنا تو ربط باہمی ہندوستان میں ہے

●

کتنے حسیں تھے یارو بچپن کے دن کہ جب ہم مٹھی میں چاند رکھ کر کہتے تھے کیوں دکھائیں

●

جس سے ملئے ہنس کے ملئے اپنا ہو یا غیر ہو دل جلانا چھوڑیے بس دل لگایا کیجیے

●

سوچتا ہوں پہنچ کے منزل پر اس سے آگے ہے اب کدھر جانا

●

عمر اس عشق کی دراز رہے جو ہوا کامیاب برسوں میں

●

ایک ہی پتھر کے دو ٹکڑوں کو کیا معلوم تھا اِک بنے گا راستہ اِک دیوتا ہو جائے گا

●

دوستوں نے کیے کرم ہم پر ہر دعا اُن کی بددعا نکلی

●

حشر ہستی کا دیکھنا ہے اگر
ریت پر کچھ بھی لکھ دیا کیجیے

□□

نام کتاب : آدمی درندہ ہے
نام مصنف : جناب حقیر آستانی

(۱)

خالق دو ہیں
انسان بھی خالق
ہے مخلوق، مگر خالق ہے
جو خالق مخلوق ہے اس کی بھی اِک اپنی رضا ہے
اپنی ادا ہے

(۲)

حد ہی نہیں اس کے وعدوں کی
تھاہ نہیں اس کی باتوں کی
خود سے مگر آگاہ نہیں ہے
آگاہی خود سے ہو جائے
ایسی کوئی چاہ نہیں ہے
رسم نہیں ہے راہ نہیں ہے
اِن کی کوئی چاہ نہیں ہے

(۳)

خودی ہرگز خدا بننے نہ پائی
کبھی اُس کی رضا بننے نہ پائی
خودی کے جو بھی دعوے ہیں
وہ دعوے ناروا ہوں گے
خدا خود کو سمجھنے پر نشانے تب خطا ہوں گے

(۴)

بھُون دیتا ہے
کیا کرتا ہے ٹکڑے ٹکڑے
اپنی ہی انا، اپنی خودی کو
زندگی کو
جیسے تیسے زِندہ ہے!
آدمی دَرِندہ ہے!

□□

نام کتاب : گمشدہ آدمی کا انتظار
نام مصنف : جناب چندر بھان خیالؔ

شنکر دت کمار پاشیؔ

برہنہ تن، بے لباس لمحوں کی داستانیں
کہو تو جانیں کہ آدمی آستیں میں اپنی وِشیلے
سانپوں کو پال کر رہی
وِلاس کی یاترا میں تنہا
عظیم تریاتنا کا امرت بھی پی چکا ہے
کہ جیسے شاعر
کمار پاشی

وہ نرم دل سخت جان شاعر
اداس راتوں کے خشک ہونٹوں سے قطرہ قطرہ
ٹپکتی سیّال آگ کو بھی، بنا کے آبِ حیات
بے خوف پی رہا تھا
وہ جی رہا تھا
کہ ایک موسم تھا اس کے باہر
کہ ایک موسم تھا اُس کے اندر

□□

یہی تو سچ ہے
یہ سچ ہی شو ہے
شوم ہی سندر
یہ سچ، یہ شیو، یہ بدن، یہ شنکر
ہزار ہا روپ میں اُجاگر
یگوں یگوں سے وشیلے سانپوں سے لڑ رہا ہے
سنور رہا ہے، اجڑ رہا ہے
کبھی یہ شنکر ہے سرو ناشی
کبھی یہ خالق کمار پاشی

□□

نام کتاب : موسم
نام مصنف : جناب ساحل احمد

راست باز: سانپ کی یہ بہت بڑی کامیابی ہے کہ وہ راست باز ہے
اور ہمیشہ پیٹ سے پیٹ ملا کر چلتا ہے جب کہ آدمی
پیٹ پر پاؤں رکھ کر چلتا ہے

●●

ویرانی: اک ویران سے علاقے میں چونا مٹی کی چہار دِواری کھنچی ہوئی تھی
جہاں دور دور کے مرے یا مارے ہوئے جانوروں کی ہڈیاں جمع تھیں
گدھ اُونگھ رہے تھے

●●

دائرہ: میں ہوں ورق سادہ کا بے صدا احساس اظہار کے بند ہیں سب راستے
کرب کی آنچ میں سلگتا ہے احساس کا آتشیں سایہ
سایوں کا ایک چھوٹا دائرہ

●●

آوارگی: پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے درمیان
جنگل کی آوارگی چھپی ہوئی ہے
جنہیں بارش ڈھونڈتی پھر رہی ہے

●●

تنہائی: چپ اُداس کمرہ ہے آدمی اکیلا ہے
ابتدا اکیلا تھا اِنتہا اکیلا ہے

□□

کتابی دنیا کی مطبوعات ایک نظر میں

کتاب	مصنف	قیمت
جدید اصول تنقید	پروفیسر ارشاد علی خان	۳۰۰/-
قدیم دکنی شاعری میں مشترکہ کلچر	ڈاکٹر انوری بیگم	۱۵۰/-
تین ناول نگار (قرۃ العین حیدر) عبداللہ حسین، انتظار حسین	رضی عابدی	۱۰۰/-
اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	سلیم اختر	۳۵۰/-
اردو تفاسیر بیسویں صدی میں	ڈاکٹر سید شاہد علی	۳۵۰/-
بیان غالب شرح دیوان غالب	آغا محمد باقر ایم۔اے	۲۷۵/-

شاعری

کتاب	مصنف	قیمت
آسان کلیات اقبال مع فرہنگ	خواجہ عبدالحمید یزدانی	۴۰۰/-
کلیات ن۔م۔راشد	ن۔م۔راشد	۳۰۰/-
کلیات داغ	داغ دہلوی	۶۰۰/-
مہتاب داغ	داغ دہلوی	۲۰۰/-
آفتاب داغ	داغ دہلوی	۶۰/-
گلزار داغ	داغ دہلوی	۲۰۰/-
مثنوی فریاد داغ	داغ دہلوی	۲۰/-
یادگار داغ	داغ دہلوی	۲۰۰/-
کلیات ناصر کاظمی	ناصر کاظمی	۳۰۰/-
کلیات حسرت موہانی	حسرت موہانی	۳۰۰/-
کلیات مومن	مومن خاں مومن	۲۰۰/-
بے آواز گلی کوچوں میں	احمد فراز	۸۰/-
بود لک	احمد فراز	۸۰/۰
پس انداز موسم	احمد فراز	۸۰/-
تنہا تنہا	احمد فراز	۸۰/-
درد آشوب	احمد فراز	۸۰/-
خواب گل پریشان ہے	احمد فراز	۸۰/-
سب آوازیں میری ہیں	احمد فراز	۸۰/-
شب خون	احمد فراز	۸۰/-
غزل بہانہ کروں	احمد فراز	۸۰/-
میرے خواب ریزہ ریزہ	احمد فراز	۸۰/-
نابینا شہر میں آئینہ	احمد فراز	۸۰/-
نایافت	احمد فراز	۸۰/-
جان جاناں	احمد فراز	۸۰/-

اسلامیات

کتاب	مصنف	قیمت
نبی کریم ﷺ سے محبت اور اس کی علامتیں	پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی	۳۵/-
مسجد نبوی ﷺ تاریخ آداب فضائل	ڈاکٹر محمد الیاس عبدالغنی	۶۰/-

فکشن ناول و افسانے

کتاب	مصنف	قیمت
آتش زیر پا (افسانے)	بانو قدسیہ	۱۵۰/-
ایک قطرہ خون (ناول)	عصمت چغتائی	۲۰۰/-
لغات کشوری	(پاکستانی)	۱۲۵/-
شاہجہاں پور میں اردو افسانہ (ایک تذکرہ)	وسیم مینائی	۲۵۰/-
کلیات عصمت چغتائی (ناول)	عصمت چغتائی	۷۰۰/-
ضدی۔عصمت چغتائی (ناول)	عصمت چغتائی	۷۵/-
ٹیڑھی لکیر (ناول)	عصمت چغتائی	۲۵۰/-
معصومہ (ناول)	عصمت چغتائی	۷۵/-
عجیب آدمی (ناول)	عصمت چغتائی	۱۲۵/-
سودائی اور دل کی دنیا (ناول)	عصمت چغتائی	۱۲۵/-

انتخاب: شامِ یاراں اور تشنگانِ ادب کی فائلوں سے

غزلیں

ڈی راج کنولؔ

(۱)

وقت کی موجوں سے ہردم کھیلتا رہتا ہُوں مَیں
زندگی کیا چیز ہے یہ سوچتا رہتا ہوں میں

لَوٹ آتے ہیں پرندے چھو کے نیلا آسماں
اور اُڑنے کے لیے پر تولتا رہتا ہوں میں

زندگی کا ذکر آتا ہے تو پانی پر کہیں
اُنگلیوں سے کچھ لکیریں کھینچتا رہتا ہوں میں

یہ نہ پوچھو کیا ہوں میں ہے اور کیا میری بساط
آئینہ ہوں روز بنتا ٹوٹتا رہتا ہوں میں

اِس طرح کرتا ہوں خوشیوں میں اضافہ اور بھی
اپنی خوشیاں دوسروں میں بانٹتا رہتا ہوں میں

سوچتا ہوں اِس لیے شاید نہیں منزل ملی
ہر کسی سے راہِ منزل پوچھتا رہتا ہوں میں

جب بھی چلتی ہے کبھی دُکھ درد کی آندھی کنولؔ
گیلے کپڑوں کی طرح بس سوکھتا رہتاہوں میں

□□

(۲)

مَیں زندگی کے بیاباں میں جب بکھرتا ہوں
حیاتِ نو کو لیے پھر کہیں اُبھرتا ہوں

مَیں آئینہ ہوں یہ مانا زباں نہیں میری
مَیں ہر کسی سے مگر گفتگو تو کرتا ہوں

کہیں سے ذہن میں خوشبو اُبھرنے لگتی ہے
مَیں چھو کے جب بھی کبھی پھول کو گزرتا ہوں

خوشی کا ایک پرندہ ہُوں تُو نہ روک مجھے
میں دو ہی پَل کے لیے ہر کہیں ٹھہرتا ہوں

تم آ گئے ہو تو آؤ وفا کی بات کریں
وفا کی بات مَیں ہر بے وفا سے کرتا ہوں

جہاں کا شور ستاتا ہے جب کنولؔ مجھ کو
مَیں خامشی کے سمندر میں جا اُترتا ہوں

□□

جگدیش جین

(۱)

خاک میں ملنا ہے تجھ کو خاک کو رسوا نہ کر
راہِ حق میں زندگی سے تو کوئی سودا نہ کر

شوقِ منزل ہے تو خود اپنا نیا رستہ نکال
ہر سفر میں دوسروں کا نقشِ پا دیکھا نہ کر

ہر قدم پر ہے یہاں نقش فریب آرزو
ہر نظر کو زندگی کا مدعا سمجھا نہ کر

محرمِ اسرارِ کُل ہستی ہے جب تو اے خدا
مجھ سے میرے نامۂ اعمال کا چرچا نہ کر

ایک ہی فنکار کی تخلیق ہے سارا جہاں
ہر کسی چہرے میں پھر چہرہ نیا ڈھونڈا نہ کر

آج بھی اعلان کرتا ہے یہ انساں کا ضمیر
نقشِ باطل ہے یہ دنیا تو اسے سجدہ نہ کر

غم ہی سے جگدیشؔ حاصل ہے سرورِ زندگی
غم بھی اس کی دین ہے تو شکوۂ بے جا نہ کر

□□

(۲)

اک ہجوم درد و غم تھا دل کو جو بہلا گیا
الجھنیں جتنی تھیں اس کی سب کی سب سلجھا گیا

شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے کی آخر کیا بساط
جس طرف چاہا ہوا نے اس طرف اڑتا گیا

ہمسفر منزل بہ منزل دور تر ہوتے گئے
جیسے جیسے میں دِیارِ عشق میں بڑھتا گیا

ابتدا سے اِنتہا تک تھا وہی جوش سفر
مَیں مثالِ ابر آیا صورتِ دَریا گیا

وہ بھی نکلی اک فریبِ آرزوئے ناتمام
جس نظر کو زندگی کا مُدعا سمجھا گیا

کیا بتائیں آپ کو کس کس جتن سے بزم میں
آپ اپنی خود فریبی کا بھرم رکھا گیا

مِل گئی احساس کو جب سے زبان اظہار کی
کربِ دل جگدیش کے اشعار میں ڈھلتا گیا

□□

(۱)

پیش ہر گام پہ آفت کبھی ایسی تو نہ تھی
عربدہ جو مری قسمت کبھی ایسی تو نہ تھی

حسن رسوائے زمانہ کبھی ایسا تو نہ تھا
عشق کے نام پہ تہمت کبھی ایسی تو نہ تھی

اپنے سائے سے بھی آتا ہے مجھے خوف اب تو
بدگمانی کی یہ صورت کبھی ایسی تو نہ تھی

فصلِ گل میں بھی ہے پامال خزاں کی مانند
گلشنِ زیست کی صورت کبھی ایسی تو نہ تھی

اختلافات تو تھے اہل چمن میں لیکن
لالہ و گل میں عداوت کبھی ایسی تو نہ تھی

پوجتا ہوں مَیں انھیں اپنے خداؤں کی طرح
اِن بُتوں سے مجھے نسبت کبھی ایسی تو نہ تھی

اس کے ہر عکس سے آتا ہے مجھے خوف جلیسؔ
آئینہ سے مجھے وحشت کبھی ایسی تو نہ تھی

□□

(۲)

کرتا نہ کبھی وَا لبِ اظہارِ تمنّا
ہوتا مَیں اگر واقفِ اسرارِ تمنّا

اک جست میں تھی وسعتِ کونین کے اس پار
اللہ رے یہ گرمیِ رفتار تمنّا

ہر آن ہے اک نغمگیِ شوق کی جھنکار
کیا زمزمہ پر داز ہے ہر تارِ تمنّا

ناموسِ تمنّا کا بھرم ہے تو اسی سے
کرتا ہی نہیں جو کبھی اظہارِ تمنّا

آتی ہی نہیں راہ نظر اس سے مفر کی
ہر سمت ہے وہ حلقۂ دیوار تمنّا

ہر شخص کو سودا ہے اسی جنسِ گراں کا
ہر شخص ہے دنیا میں پرستار تمنّا

اِک حشر سا برپا ہے مرے دل میں جلیسؔ آج
ٹوٹی ہے یقیناً کوئی دیوارِ تمنّا

□□

(۱)

کس نے کہا تھا، شہر میں آکر، آنکھ لڑاؤ دیواروں سے
سایہ، سایہ، بھٹک بھٹک اب سر ٹکراؤ دیواروں سے

گھات کی پلکیں جھپک رہے ہیں، کھُل کھل کر انجان دریچے
زخموں کے اب پھول سمیٹو، پتھر کھاؤ دیواروں سے

قطعِ نظر کے بعد بھی اکثر، بڑھ جاتی ہے دل کی دھڑکن
آنکھ ہٹائے کیا بنتا ہے، دل ہی ہٹاؤ دیواروں سے

رستوں کی تہذیب یہی ہے، دائیں بائیں چھوڑ کے چلنا
سیدھے ہی گھر جانا ہے تو منہ نہ لگاؤ دیواروں سے

یہ بھی ہے کیسی ریت سمے کی، بنیادوں سے محرابوں تک
خون کے ناتے سب کچھ دے کر، کچھ بھی نہ پاؤ دیواروں سے

سوچ گھٹن میں ڈوب نہ جائے، توڑو یہ سنکوچ کے گھیرے
کھلی ہوا میں پر پھیلاؤ، جان بچاؤ دیواروں سے

کسی طرح تو ٹوٹے راہی، کرب یہ سب شوریدہ سری کا
دروازوں کو بند کرو اور سر ٹکراؤ دیواروں سے

□□

(۲)

بدن کی اوٹ کے ماتے، بدن تک رہ نہ جائیں
کہیں پھر اس کفن سے اس کفن تک رہ نہ جائیں

قریب آنے کی مِل جُل کر کوئی صورت نکالیں
اِسی دُوری میں دونوں حسنِ ظن تک رہ نہ جائیں

ہوا بھی روشنی کے ساتھ در آئے تو بہتر
فسانے شب کے بستر کی شکن تک رہ نہ جائیں

کڑے ہیں وقت کے سانچے تو ڈھلنا بھی ضروری
کھنکتے سر، چٹختے بانکپن تک رہ نہ جائیں

پپوٹے اوڑھ کر ہی ان خلاؤں کو نہاریں
نگاہیں، پھر نگاہیں ہیں، گگن تک رہ نہ جائیں

کوئی تاریخ سی تکرار در تکرار راہیؔ!
قدم یہ آج کے، کل کی تھکن تک رہ نہ جائیں

□□

(۱)

نہ دورِ جام ہے ساقی، نہ رندی ہے، نہ مستی ہے
یہ کس ڈھب کا ہے میخانہ، یہ کیسی مے پرستی ہے

کبھی وہ بھی زمانہ تھا کہ ہم دنیا پہ ہنستے تھے
کبھی یہ بھی زمانہ ہے کہ دنیا ہم پہ ہنستی ہے

مقدّر ہے ترا جو نغمہ زن ہوں روبرو ورنہ
میرے اشعار سننے کے لیے دنیا ترستی ہے

محبت کی کوئی قیمت مقرّر ہو نہیں سکی
یہ جس قیمت پہ مل جائے اسی قیمت پہ سستی ہے

سمجھ سے اپنی باہر ہے سمجھ میں کچھ نہیں آتا
طلسمِ رازِ ہستی پھر طلسمِ رازِ ہستی ہے

بڑی خونخوار ہے دُنیا، جب آجاتی ہے اپنی پر
تو پھر یہ آدمی کو سانپ کی مانند ڈستی ہے

کوئی مانے نہ مانے اے رواںؔ سچ ہے یہی لیکن
ہماری وجہَ بربادی ہماری خود پرستی ہے

□□

(۲)

دِل کے جذبات کو اشعار میں ڈھالا ہم نے
شاعری تجھ سے بڑا کام نکالا ہم نے

تو نے دنیا کے اندھیروں میں ڈھکیلا ہم کو
تیری دنیا میں کیا پھر بھی اُجالا ہم نے

رات دن اپنے کلیجے سے لگائے رکھا
دَردِ دل تجھ کو بڑے ناز سے پالا ہم نے

لڑکھڑاہٹ کا یہ عالم تھا کہ میخانے میں
کبھی خود کو کبھی ساقی کو سنبھالا ہم نے

منزلِ عشق میں جس راہ میں کانٹے دیکھے
دِل کو ڈالا تو اسی راہ پہ ڈالا ہم نے

ہوگئے اُن کے تو بس ہوگئے ان کے دِل سے
عشق کے کھیل میں کچھ دیکھا نہ بھالا ہم نے

یوں تو محفل میں رواںؔ اور بھی دیوانے تھے
مورچہ پھر بھی سنبھالا تو سنبھالا ہم نے

□□

سیمابؔ سلطانپوری

(۱)

جیسے جیسے آفتابِ عُمر ڈھلتا جائے گا
زندگی کے آئینے کا رُخ بدلتا جائے گا

دوسرا کانٹا ہی دے گا پہلے کانٹے سے نجات
مسئلوں سے مسئلوں کا حل نکلتا جائے گا

میرے اُس کے درمیاں ہے طے شدہ اِک فاصلہ
ہمسفر ہو کر وہ اِک دُوری پہ چلتا جائے گا

لفظ کی صورت کھڑا ہوں کاتبوں کے شہر میں
کج اگر مجھ میں کوئی ہوگا نکلتا جائے گا

تیرگی میں یہ تو ممکن ہے کہ کھو جائے نظر
ورنہ سایہ تو یقیناً ساتھ چلتا جائے گا

مَیں نے کی ہر رُت میں اس کی آبیاری اِس قدر
اب غزل کا پیڑ ہر موسم میں پھلتا جائے گا

مُنہ میں گھلتی جائے گی سیمابؔ اِک خوش ذائقی
جب بھی اُس شیریں سخن کا ذِکر چلتا جائے گا

□□

(۲)

یہ دیکھنا تھا کہ دُوں گا میں وسعتیں کیسی؟
قلم نے سونپ دیں مجھ کو وراثتیں کیسی؟

مری انا کو مرے خوں سے تولنے والے
لگا رہے ہیں مرے سَر کی قیمتیں کیسی؟

بڑے سلیقے سے اُن کو کتاب میں رکھ کر
وہ کر رہا تھا گلوں کی حفاظتیں کیسی؟

میں دشتِ جاں کا مسافر ہوں روزِ اوّل سے
بدن بدن یہ ملی ہیں یہ مسافتیں کیسی؟

ہزار چہروں کو یکجا کرو تو پھر دیکھو
دکھائی دیتی ہیں گھُل مل کے صورتیں کیسی؟

تحفظات کی خاطر جو سَر پہ رکھی تھیں
بنی ہیں بارِ گراں اب وہی چھتیں کیسی؟

چراغِ صبر جلایا تو گھر میں اے سیمابؔ
بکھر گئی ہیں ہر اک سمت برکتیں کیسی؟

□□

عازم گروندر سنگھ کوہلی

(۱)

ظرف ہے کس میں کہ وہ سارا جہاں لے کر چلے
ہم تو دُنیا سے فقط اِک دردِ جہاں لے کر چلے

آدمی کو چاہیے توفیق چلنے کی فقط
کچھ نہیں تو گزرے وقتوں کا دھواں لے کر چلے

کب مُقدّر کا کہاں کیسا کوئی منظر بنے
ہم ہتھیلی پر لکیروں کے مکاں لے کر چلے

دیکھتے ہیں زِندگی کو اپنے ہی انداز سے
ہم جدھر کو چل پڑے اِک داستاں لے کر چلے

جو بڑے بیڑوں پہ نکلے رہ گئے منجدھار میں
ہم وہی کاغذ کی ننھی کشتیاں لے کر چلے

کیا سمجھتے درد کو بچّے تھے وہ معصوم تھے
ہاتھ میں جو چھٹپٹاتی تِتلیاں لے کر چلے

ظلمتیں تاریک شب کی دُور کرنے کے لیے
بادلوں سے ہم بھی عازم بجلیاں لے کر چلے

□□

(۲)

کبھی صورت نہیں ملتی کبھی سیرت نہیں ملتی
یہاں انسان سے انسان کی فطرت نہیں ملتی

نصیبہ رَب نے بخشا ہے ہر اک کو اُس کے حصے کا
یہاں اک باپ کے بیٹوں کی بھی قسمت نہیں ملتی

کرم مولا کرے تو آدمی بے لَوث ہوتا ہے
نہ ہو اُس کی اگر رحمت تو یہ طاقت نہیں ملتی

وہ دُنیا میں بھی رہتے ہیں تو ہو کر خود سے بیگانے
جنھیں اپنے گناہوں سے کبھی فرصت نہیں ملتی

اثر اِک سا ہے ہم دونوں پہ واعظ اِس موئی مَے کا
وگرنہ تیری میری اِک بھی تو عادت نہیں ملتی

کہاں آدم نکلتا خلد سے اِتنا تو سوچو تم
گر حوّا کی جانب سے اسے دعوت نہیں ملتی

جو تیرے در پہ اے مولا نہ عازؔم یوں دُعا کرتا
اُسے جنّت نہیں ملتی تجھے شہرت نہیں ملتی

□□

(۱)

دُود کی قبا پہنے شور کی رِدا اوڑھے
ہے یہاں خموشی بھی اِک نہ اِک صدا اوڑھے

بے غرض نہیں کوئی کیا ہُوا زمانے کو
دوستوں کے چہرے بھی حرفِ مدّعا اوڑھے

صبحِ دم یہ منظر تھا آفتابِ زرّیں کا
جیسے نُور کی چادر ایک خوش ادا اوڑھے

شکریہ گرانی کا، گھر میں بوریا بھی نہیں
اب کوئی بچھائے کیا اور کوئی کیا اوڑھے

مُفلسی میں بھی اپنا رکھ رکھاؤ ہے قائم
شان سے جیئے ہیں ہم صبر کی رِدا اوڑھے

عقل محوِ حیرت ہے آفرینِ صنّائی!
ہر حقیر ذرّا ہے ایک معجزہ اوڑھے

ساتھ ساتھ رہتی ہے خواہشات کی دُنیا
کوئی تاج پہنے ہو یا ہو بوریا اوڑھے

□□

(۲)

چمن سجا نہ سکے گل ہی کچھ کھلا تو چلے
ہمارے بعد بہاروں کا سلسلہ تو چلے

گلہ نہیں کہ ہمیں جامِ مے ملا نہ مِلا
تجھے ہم اپنا لہو زندگی پلا تو چلے

کوئی تو خاک بسر ڈھائے گا یہ قصرِ ستم
جفا و جور کی بنیاد ہم ہلا تو چلے

جو بے زباں تھے انھیں بخش دی ہے گویائی
بجھے دِلوں کو نیا حوصلہ دِلا تو چلے

سیاہ بختوں کو ہم نے دِیا پیامِ سحر
غرورِ تیرہ شبی خاک میں مِلا تو چلے

مجھے یقیں ہے نئی صبح جلد آئے گی
ستارہ ہائے شبِ یاس جھلملا تو چلے

چمکتے سِکّوں کا دنیا میں بس گیا ہے چلن
وفا کے سِکّے پہ کچھ اور ہو جلا تو چلے

□□

(۱)

زندگی بول کہ ہیں پیاس کے منظر کتنے
اور مری روح کے اندر ہیں سمندر کتنے

غور سے دیکھ مرے شہر کی گلیوں کا چلن
ایک شیشے کے لیے اُٹھتے ہیں پتھر کتنے

اب تو بستی میں یہ اندازہ نہیں ہے ممکن
کتنے قاتل ہیں یہاں اور ہیں خنجر کتنے

ساقیا صاف بتا ہم سے چھپاتا کیوں ہے
اب بھی خالی ہیں تری بزم میں ساغر کتنے

وہ مرے ساتھ رہے یہ بھی کرم تھا ان کا
یہ نہ پوچھو کہ بدلتے رہے تیور کتنے

محفلِ حسن میں اِک بھیڑ تو ہوگی لیکن
لوگ نکلیں گے مرے قد کے برابر کتنے

دیکھنا یہ ہے کنولؔ کوچۂ دلبر کے اسیر
کتنے اندر ہیں ابھی اور ہیں باہر کتنے

□□

(۲)

مرے نصیب میں تھی دوستو کتاب غلط
کہیں سوال غلط تھا کہیں جواب غلط

مرے حریف کو احساس اس کا تھا شاید
ہوا تھا میرے مقابل وہ کامیاب غلط

مرے گناہ سے بڑھ کر سزا ملی مجھ کو
لکھا گیا تھا یقیناً مرا حساب غلط

عجیب سلسلہ تھا زندگی کی راتوں کا
کبھی تو نیند غلط تھی کبھی تھا خواب غلط

ہر ایک شخص نے دھوکا مری نظر کو دیا
ہر ایک شخص تھا اوڑھے ہوئے نقاب غلط

میں اپنی تشنہ لبی کا علاج کیا کرتا
کہیں تو جام غلط تھا کہیں شراب غلط

مری نظر ہی کنولؔ روشنی سے ڈرتی ہے
نہ آفتاب غلط تھا نہ ماہتاب غلط

□□

ملک زادہ جاوید

(۱)

اگر یہ راہ میں بوڑھا شجر نہیں ہوتا
شدید دھوپ میں مجھ سے سفر نہیں ہوتا

امیر زادے جو خود کو سنبھال کر رکھتے
حویلیوں کا مقدّر کھنڈر نہیں ہوتا

لہو جلا کے اُجالا کروں میں کتنا ہی
نیا چراغ کبھی معتبر نہیں ہوتا

گئے زمانوں کے سکّے لیے میں بیٹھا ہوں
کسی فقیر کا آنا ادھر نہیں ہوتا

مسائل اتنے جو ملتے نہ ہم کو ورثے میں
ہمارے پاس غزل کا ہنر نہیں ہوتا

□□

(۲)

رَکْ ملے گا سوچا کر
ہر دَر پر مت سجدہ کر

ذہنوں میں تاریکی ہے
بجلی بن کر کوندھا کر

یاد آئیں گی باتیں سب
پہلے خود کو تنہا کر

بوڑھے پیڑ کی چھاؤں تلے
تھوڑی دیر تو بیٹھا کر

شور بہت ہے نعروں کا
اپنا جھنڈا اونچا کر

بیٹھ نہ سستے لوگوں میں
اپنی قیمت سمجھا کر

□□

(۱)

سورج بنا کے پھر مجھے اُوپر اچھال دے
ورنہ کہیں عدم کے سمندر میں ڈال دے

دیوار بن گیا یہ میرے تیرے درمیاں
میرے وجود سے مرے مَیں کو نکال دے

کب تک رہوں خلا میں بھٹکتا ہوا سوال
ممکن نہیں کچھ اور تو لفظوں میں ڈھال دے

آئینہ بن کے اپنے میں سب کچھ سمیٹ لوں
احساس کو مرے کوئی حسنِ خیال دے

روزِ ازل سے پھرتا ہوں اپنی تلاش میں
عرفانِ ذات کا مجھے کچھ تو کمال دے

انبوہِ ناشناخت میں مجھ کو نہ کر شریک
اک شخصیت الگ سے مجھے بے مثال دے

جسمِ یقیں بھی جل گیا تنہاؔ وہ دھوپ ہے
اب وہ بلا سے چھاؤں دے یا برشگال دے

□□

(۲)

سَر برہنہ دھوپ کی وادی میں یوں گھوما نہ کر
آنکھ جل جائے گی سورج کی طرف دیکھا نہ کر

کیوں بکھر کر پھر سمٹنے کے لیے بے تاب ہے
میں نہ کہتا تھا ہَوا سے رسم و رَہ پیدا نہ کر

دھوپ کا بے داغ منظر دُور ہی سے دیکھ لے
اپنے سائے کے تصرّف سے اِسے میلا نہ کر

ہر تھکن اپنا کے چل، ہر فاصلہ خود میں سمیٹ
اور کتنی دُور ہے منزل کبھی سوچا نہ کر

شہر میں بھی پیاس پھیلی ہے وبا سی دیکھ لے
چھوڑ مت صحرا کو میری مان لے، ایسا نہ کر

دُور تک میں بھی گیا ہوں کچھ نہ حاصل ہوسکا
راستے تو بھی خلاؤں کے بہت ناپا نہ کر

میں نے اپنے آپ کو تنہا کبھی بیچا نہیں
تو سمندر ہے تو میری پیاس کا سودا نہ کر

□□

(۱)

جو کہ ہیں صبح و شام مسجد میں
رب سے ہیں ہمکلام مسجد میں

یہ خبر رند نے اُڑائی ہے
شیخ پیتا ہے جام مسجد میں

کیوں وہ آخر یہاں چلا آیا
رند کا کیا تھا کام مسجد میں

عید کے دن ملے ہیں ہم ان سے
ہوگئی رام رام مسجد میں

پاک کتنی مری محبت ہے
ان کا پایا سلام مسجد میں

ہم فقیروں کے صبح و شام ہیں کیا
صبح مندر میں شام مسجد میں

یاد آیا ہمیں خدا دلبر
پی کے اُلفت کا جام مسجد میں

□□

(۲)

تمہارے غم کی عظمت جن سے پہچانی نہیں جاتی
اُنہی کی زندگی بھر اشک افشانی نہیں جاتی

یہ کوئی پیش خیمہ ہو نہ آنے والی آفت کا
کسی صورت میرے دل سے پریشانی نہیں جاتی

ترے کوچے کی مَیں آوا گی تو چھوڑ دوں لیکن
جو پڑ جاتی ہے وہ عادت بہ آسانی نہیں جاتی

یہ کیسی آبیاری کی ہے ہم نے اپنے گلشن میں
بہار آجانے کے باوصف ویرانی نہیں جاتی

بگولے دشت میں اٹھ کر فلک پیمائی کرتے ہیں
تیرے کوچے کی ہم سے خاک چھانی نہیں جاتی

نکل کر دل سے جو آواز اتر جاتی تھی ہر دِل میں
وہ آواز آج کیوں تاحدِ امکانی نہیں جاتی

تلاطم خیز موجوں کا مقدر دیکھیے دلبر
کہ دریا خشک ہوجاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

□□

منوّر سرحدی

(۱)

شادی تو کی تھی ہم نے بھی جی دار کی طرح
لٹکے ہوئے ہیں تار پہ سلوار کی طرح

کہنے کو گھر ہے اصل میں چوکی پولیس کی
بیلن لیے کھڑی ہے حولدار کی طرح

یہ ہے جومیٹری کا سبق زندگی نہیں
ہم گھومتے ہیں روز ہی پرکار کی طرح

کڑچھا گھما رہی ہے پتیلے میں دھاڑ دھاڑ
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

اس نے زباں پہ رکھّی ہے چھوٹی سی برین گن
خط کا جواب دیتی ہے وہ تار کی طرح

تازہ تھے صبح دم تو ہمیں چومتی تھی ساس
اب بک رہے ردّی کے اخبار کی طرح

رُکتی نہیں ہے چھینک محبت کی کیا کریں
نتھنوں تک آ گئی ہے وہ نسوار کی طرح

□□

(۲)

کہاں مرغِ مُسلّم اور کہاں یہ دال کا پانی
کہیں ایسے میں ہوتی ہے سخندانو، سخن دانی

ذرا سی خس خسی داڑھی پہ اچکن اور پاجامہ
اور اس پر شعر کہتے ہیں وہ ماشاء اللہ رومانی

ہے پنجرا ہڈیوں کا اُس پہ یہ پچکے ہوئے جبڑے
تمنا نانِ تندوری کی فرمائش کو بریانی

گرجنا گونجنا سر پر اٹھانا آسماں سارا
سخن گوئی ضروری ہے تو رہنے دو پہلوانی

بگاڑی اس طرح مذہب کی صورت ٹھیکے داروں نے
نہ 'رامو' ہات آتا ہے نہ ہات آتا ہے 'رمضانی'

میں سارے زخم دِل کے اب برہنہ کر کے لایا ہوں
کہیں تم رکھ کے شاید بھول آئی ہو نمک دانی

ستم پر وہ ستم ڈھانے سے باز آتے نہیں ہرگز
رپٹ تھانے میں جا جا کر ہمیں پڑتی ہے لکھوانی

□□

نرمل سنگھ نرملؔ رائے پوری

(۱)

ہُوا کرتا ہے ذکرِ خیر جیسے خوبیوں کا
کیے جاتا ہوں چرچا اپنی بداعمالیوں کا

یہی بہتر ہے گھر اپنے ذرا محفوظ رکھو
گلہ کرنا ہے سب بیکار بپھری آندھیوں کا

کہوں کیا مَیں اِسے اب منّا مجھ سے پوچھتا ہے
یہ کیوں کہتے ہیں دادا ،راج ہے کٹھ پتلیوں کا

مجھے کیسے چکاناہے، یہ سب سوچا ہوا ہے
مِرے سر پر ہے کچھ احساں تری دلداریوں کا

بلندی کی طرف وہ لوگ جو کم دیکھتے ہیں
وہی روتے ہیں رونا آدمی کی پستیوں کا

تمہارا ساتھ دے گی ہر قدم پر کامیابی
صحیفہ جو پڑھوگے تم مری ناکامیوں کا

فقط سر ہی ہوا کرتا تھا جن کا نرخ نرملؔ
نہ جانے اب کہاں ہے بانکپن وہ پگڑیوں کا

□□

(۲)

مسرّتوں سے سنو سچ کے رُوبرُو نہ ہُوئی
کبھی یوں زندگی سے اپنی گفتگو نہ ہوئی

تلاش کرتے کہاں پر سکونِ گُم کردہ
کہ ہم سے اپنے دروں کی ہی جستجو نہ ہوئی

نہ کوئی دار، نہ زنداں، نہ قتل گہہ، نہ صلیب
ہماری زندگی اب کے بھی سُرخرو نہ ہوئی

سیئیں اِدھر سے، اِسے تو اُدھر دریدہ ملے
یہ زندگی کی رِدا عمر بھر رفُو نہ ہوئی!

تجھے منانے میں مصروف سب ہیں مدّت سے
مگر اے زندگی اب تک کسی کی تُو نہ ہوئی

مَے سخن کی جسے پڑ گئی ہو لت نزؔل
پھر اُس پہ حاوی کوئی اور آرزو نہ ہوئی

□□

سوہن سنگھ سیمبھی سوہنؔ

(۱)

کم نہ ہو فاصلہ، تو کیا کیجیے
نارسا ہو دُعا، تو کیا کیجیے

غم کی آندھی ہے، اور اُمیدوں کا
بُجھ ہی جائے دِیا، تو کیا کیجیے

تا سحر، اس کو روک لینے کا
کچھ نہ چارہ چلا تو کیا کیجیے

ہم بھی پا لیتے دید کا گوہر
پر مقدّر نہ تھا، تو کیا کیجیے

ہنستے چہرے سا صاف اور شفاف
اس کا باطن نہ تھا، تو کیا کیجیے

اس کی رحمت بہت تھی، پر ایسا
اپنا دامن نہ تھا، تو کیا کیجیے

اس کا دولت کدہ، مِلا سوہنؔ
دَر نہ پایا کُھلا، تو کیا کیجیے

□□

(۲)

غُنچہ غُنچہ چھو کر دیکھا
خُوشبو کو بے پیکر دیکھا

ہم نے سوچا، قسمت جاگی
اس نے ذرا جو مُڑ کر دیکھا

راہ میں اس سے کیا ٹکرائے
گویا عجب مقدّر دیکھا

ایک جھلک، پھر ایک جھلک تھی
کیسے کہہ دیں، جی بھَر دیکھا

وقتِ رخصت خشک آنکھوں نے
دل کو روتے، اندر دیکھا

سوہنؔ نے جب آنکھیں موندیں
اس کو دِل کے اندر دیکھا

□□

نظمی سکندر آبادی

(۱)

حقیقتوں کے جب آئینہ دار ہم بھی نہ تھے
یہاں کسی کی طبیعت پہ بار ہم بھی نہ تھے

جو تم صبا کی طرح تھے تو راہ میں ہم بھی
تھے سنگِ میل کی صورت غبار ہم بھی نہ تھے

گلوں کے ساتھ ہمیں بھی تھا ذوقِ جامہ دری
کہ ناشناسِ مزاجِ بہار ہم بھی نہ تھے

دکھوں کو بانٹ ہی سکتے تھے شہر میں رہ کر
غریبِ شہر تھا وہ شہر یار ہم بھی نہ تھے

زمانے بھر سے چھپا لیتے راز دِل اپنا
جہاں میں اتنے سلیقہ شعار ہم بھی نہ تھے

تجھے تھا کون وفاؤں سے روکنے والا
تری نظر میں تو بے اعتبار ہم بھی نہ تھے

بس اک صفت تھی بہم قدرِ مشترک نظمی
وہ سادہ دل تھے بہت ہوشیار ہم بھی نہ تھے

□□

(۲)

فکرِ مستقبل بھی احساسِ شکستہ پائی بھی
آدمی کو مار دیتی ہے کبھی تنہائی بھی

موسمِ باراں میں اب کے پھول بھی کھلتے رہے
اور زخموں کا پتہ دیتی رہی پروائی بھی

ڈوب بھی سکتا ہے موجوں میں سفینہ شوق کا
دِل میں ہوتی ہے سمندر کی طرح گہرائی بھی

ایک ہوں مَیں اور دو قاتل ہیں راہِ شوق میں
میری کوشش بھی تمہاری حوصلہ افزائی بھی

زندگی بھر ہم نے معیارِ نظر اونچا رکھا
سادگی پر جان بھی دی سادگی اپنائی بھی

عمر بھر کے قرض خواہوں میں خوشی بٹ جائے گی
اب اگر دوچاردن کو زندگی راس آئی بھی

آج تک راہِ فرارِ غم نہ ڈھونڈی جاسکی
زندگی پر دُور تک نظمی نظر دوڑائی بھی

□□

منشی شمس العارفین عارفؔ دہلوی

(۱)

ہاں، یہ سچ ہے کہ وہ ہر دل میں مکیں ہوتا ہے
یہ غلط ہے کہ وہ ہوتا ہی نہیں، ہوتا ہے

تیرا ہی حسن نمایاں ہے ہر ایک انساں میں
ہر بشر میں تیرے ہونے کا یقیں ہوتا ہے

اور بڑھ جاتا ہے کچھ شوقِ طلب رہرو کا
جب مسافر کوئی منزل کے قریں ہوتا ہے

حسن کیا چیز ہے نظروں کا فریبِ رنگیں
دیکھیے شوق سے جس کو وہ حسیں ہوتا ہے

چپکے چپکے جو ہوا کرتی ہیں دل سے باتیں
دل کے پردے میں کوئی پردہ نشیں ہوتا ہے

منہ سے اقرار کرو، ہاں تو کہو، بولو تو
وصل کا وعدہ اشاروں سے کہیں ہوتا ہے

شاہ بھی ہیں اسی دنیا میں، گدا بھی عارفؔ
کوئی سائل تو کوئی تخت نشیں ہوتا ہے

□□

(۲)

رموزِ میکدہ ہے جام لینا
مبارک دستِ ساقی تھام لینا

نِکھرتا جائے گا حسنِ مجازی
بتو! تم بھی خدا کا نام لینا

چرایا آنکھوں آنکھوں میں میرا دل
بڑا مشکل ہے ان کا نام لینا

مَیں تم کو خوبصورت کہہ رہا ہوں
کوئی پوچھے تو میرا نام لینا

جو تھک جاؤ تو کرلو چال دھیمی
مگر منزل پہ تم آرام لینا

اتارو ان کی جب آنکھوں کا صدقہ
میری یہ رائے ہے بادام لینا

ہر اک دل کی بڑی قیمت ہے عارفؔ
حسینوں سے پرکھ کر دام لینا

□□

طالبؔ چکوالی

(۱)

آغاز بھی دیکھا ہے، انجام بھی دیکھیں گے
دیکھی ہے سحر ہم نے، اب شام بھی دیکھیں گے

قانون ہے قدرت کا، فرمان ہے قسمت کا
پَروردۂ آسائش، آلام بھی دیکھیں گے

جو ہم نے خیالوں اور خوابوں سے سجایا تھا
اس دِل کے گھروندے کا نیلام بھی دیکھیں گے

جن لوگوں کی خواہش ہی تکمیلِ تمنا تھی
ان لوگوں کی کوشش کو ناکام بھی دیکھیں گے

باتیں ہی بنانے سے تو بات نہیں بنتی
جو دیکھنے والے ہیں وہ کام بھی دیکھیں گے

توبہ کی دُکاں میں تو ہر رنگ کے ساغر ہیں
جو ٹوٹ کے جُڑ جائے، وہ جام بھی دیکھیں گے

لگتا ہے کہ طالبؔ اب وہ وقت بھی آپہنچا
جب ہم سے تھکے ہارے آرام بھی دیکھیں گے

□□

(۲)

اُٹھا کر طاق پہ دُنیا کے غم رکھ
بہ بھولے سے بھی فکرِ بیش و کم رکھ

حصارِ ذات کا قیدی نہیں تو
حصارِ ذات سے باہر قدم رکھ

کسی سے بھی نہ عرضِ مُدّعا کر
کسی سے بھی نہ اُمیدِ کرم رکھ

زمانے کی نہ سُن، سُن اپنے دِل کی
زمانے کا نہ رکھ اپنا بھرم رکھ

یہی منزل پہ لے جائیں گے تجھ کو
نظر میں راستے کے پیچ و خَم رکھ

کیے جا پرورشِ لوح و قلم کی
لہُو پینے کو اور کھانے کو غم رکھ

یہی ہے وقت کی آواز طالبؔ
ہم آہنگ اس سے لَے کا زیر و بَم رکھ

□□

(۱)

زندگی تجھ سے تو پیمانِ محبت کر کے
حادثے ٹوٹ پڑے ہم پہ زمانے بھر کے

ایک ہی موڑ پہ مدّت سے کھڑے تھے ہم لوگ
گردشِ وقت کے صدقہ میں کچھ آگے سر کے

کیا کہا جائے اِسے پاسِ محبت کے سوِا
منزلِ شوق میں اٹھتے ہیں قدم ڈر ڈر کے

جستجو آج بھی دُنیا کو ہے منظر کی مرے
نقش ہیں سارے اُجاگر مرے پس منظر کے

لگ چکی فکر و ہنر کی تو ہمارے قیمت
دام باقی ہیں ابھی لگنے ہمارے سر کے

باعثِ شکر ہیں اس دورِ پُرآشوب میں بھی
شہر سے اچھے ہیں حالات ہمارے گھر کے

زخم سب بھول گئے اپنے حریفوں کے عزیزؔ
یاد بس رہ گئے اربابِ کرم کے چرکے

□□

(۲)

زمیں پاؤں سے اور سر سے آسمان گیا
کہاں پہ چھوڑ کے کشتی کو پاسبان گیا

بیان اور بھی تھے لائقِ گرفت مگر
حضورِ شاہ گیا تو مرا بیان گیا

قصور وار سدا دشمنوں کو ٹھہرایا
محافظوں کی طرف بھول کر نہ دھیان گیا

یہ پیش خیمہ کسی قتل عام کا تو نہیں
گھروں پہ رات لگا کر کوئی نشان گیا

عقیدتوں کے وہ آیا تھا لے کے نذرانے
گیا جو اُٹھ کے یہاں سے تو بدگمان گیا

عذاب بن کے اب آسائشوں نے گھیر لیا
الم نصیب تھے خوش دورِ امتحان گیا

مقابلہ ہے برابر کا اب عزیزؔ میاں
سمجھ گیا وہ مجھے میں بھی اس کو جان گیا

□□

کندن لال کندنؔ

(۱)

نوائے نغمۂ دلکش ہو ساز ساز میں تم
جھلک رہے ہو حسینوں کے ناز ناز میں تم

نہیں ہے دیدۂ ناامتیاز واقفِ حُسن
مگر بسے ہو ہر اک چشمِ امتیاز میں تم

تھے غزنوی کی زباں پر سوال کی صورت
جواب بَن کے چھپے تھے لب ایاز میں تم

فراز و پست میں رونق جو ہے تمہیں سے ہے
دکھائی دیتے ہو ہر پست و ہر فراز میں تم ہو

حجابِ راز میں چھپنے نہ دے گا پھر کندنؔ
کروگے حشر بَپا آ کے جب حجاز میں تم

□□

(۲)

کلیوں پہ بہار آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
پھولوں پہ نکھار آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو

آنکھوں کے دریچوں سے دل نُور سے بھرنے پر
گلریز نگار آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو

بُلبل کے چہکنے سے غنچے جو چٹک جائیں
یک گونہ قرار آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو

گلشن سے ہَوا لائے جو خوشبو کو چُرا کر
پُرکیف بہار آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو

ساون میں پری پیار کی آنچل کو ہلاکر
گاتی جو ملہار آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو

جنّت سے فرشتے بھی جسے نیک لگن پر
کرنے جو سنگار آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو

دنیا کے جھمیلوں سے الگ رہ کے بھی کندنؔ
دِل کو جو قرار آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو

□□

ہیرانند سوزؔ

(۱)

وہ میرے شیشۂ دل پر خراش چھوڑ گیا
دیارِ روح میں اِک ارتعاش چھوڑ گیا

قدم قدم پہ ہوا جب منافقت کا شکار
تو اپنے شہر کی وہ بُود و باش چھوڑ گیا

وہاں سے منزلِ عرفانِ ذات دور نہ تھی
وہ جس مقام پہ اپنی تلاش چھوڑ گیا

وہ شخص آپ ہی قاتل تھا آپ ہی مقتول
جہاں جہاں بھی گیا اپنی لاش چھوڑ گیا

کمال درجہ تھا اس میں شعورِ تیشہ گری
مرے وجود کو وہ پاش پاش چھوڑ گیا

سُنا جب اس نے کہ اللہ سب کا رازق ہے
وہ فکرِ رزق، تلاشِ معاش چھوڑ گیا

تھا اس کے دستِ ہنر میں بھی آذری کا کمال
مگر وہ اپنا ہی بُت نا تراش چھوڑ گیا

□□

(۲)

یہاں تو آہ و فغاں بے اثر ہے کیا کیجیے
تمام شہر ہی بیداد گر ہے کیا کیجیے

دِلوں میں شوقِ کمالِ ہنر تو ہے لیکن
یہ زندگی ہی بڑی مختصر ہے کیا کیجیے

خوشی نصیب نہیں اور متاعِ رنج و الم
رہ حیات کا زادِ سفر ہے کیا کیجیے

ہے دل میں حق و صداقت کا احترام مگر
دروغ گو ہی یہاں معتبر ہے کیا کیجیے

ہزار چاہا کہ اس سے قدم مِلا کے چلیں
یہ وقت ہم سے مگر تیز تر ہے کیا کیجیے

سمٹتے جاتے ہیں آسائشوں کے سائے سوزؔ
دکھوں کی دھوپ یہاں اس قدر ہے کیا کیجیے

□□

(۱)

سُن سکے گا میرے مَن کی دُکھ بھری تقریر کون؟
پڑھ سکا ہے اشکِ خوں کی آج تک تحریر کون؟

حوصلہ، ہمّت، جنوں، ہوش و خرد کچھ بھی نہیں
بند دَرواَزوں کی اب کھڑکائے گا زنجیر کون؟

چاند، سورج، ابر، بجلی، آسماں، تارے، ہَوا
خوگرِ تخریب ہیں، ہو مائلِ تعمیر کون؟

جس کو دیکھا اپنے ہی خوابوں میں تھا کھویا ہُوا
میرے خوابوں کی بتاتا پھر مجھے تعبیر کون؟

ہر گلی کوچے میں ہے کافر اداؤں کا ہجوم
اب کہو قرآن و گیتا کی کرے تفسیر کون؟

باعمل انسان کی تدبیر ہی تقدیر ہے
جُز ہمارے ہے ہمارا کاتبِ تقدیر کون؟

امتیاز نیک و بَد سہگلؔ کسی کو بھی نہیں
رُوئے ہستی سے اُٹھائے پردۂ تقصیر کون؟

□□

(۲)

آغاز تمنا کا اس طرح کیا جائے
انجام سے بیگانہ بے فکر رہا جائے

الفت کا تقاضا ہے بس اب تو یہی اے دِل
رو رو کے ہنسا جائے، مَرمَر کے جیا جائے

اِن دیکھتی آنکھوں کے منظر تو بھیانک ہیں
دُنیائے تخیل میں چل کر ہی بسا جائے

سُن سُن کے زمانے کی ہم ہوش گنوا بیٹھے
اب ہوش میں آئیں تو دِل کو بھی سُنا جائے

کمرے میں گھٹن سی ہے یُوں سانس بآسانی
باہر کی ہَوا تازہ کھڑکی سے جو آجائے

گلچیں کا نہ کھٹکا ہو، دھڑکا نہ ہو بجلی کا
اب چھوڑ کے گلشن کو صحرا میں بسا جائے

سہگلؔ! تری رچنائیں جھرنوں کا ترنّم ہیں
سَنسا رینا کوئی اب اِن سے رچا جائے

□□

کلدیپ گوہرؔ

(۱)

ہم بھری بزم سے کچھ سوچ کے جب اُٹھ آئے
دیکھتے دیکھتے سب اہلِ ادب اُٹھ آئے

یوں تو محتاط ہیں رکھتے ہیں دوا بھی لیکن
دَرد پھر دَرد ہے کیا جانے کب اُٹھ آئے

صرف اِک ہم ہی رہے پاسِ وفا کے پابند
آپ کی بزم سے یوں اور تو سب اُٹھ آئے

اَے سیاہ بادلو! منڈلاؤ نہ میخانے پر
کہیں پھر سے نہ ہمیں مے کی طلب اُٹھ آئے

اُن کی یادوں کے اُجالے میں سجائی محفل
چھائی جب ذہن پہ تاریکیِ شب اُٹھ آئے

ہم اسی ڈر سے تعارف کے نہیں ہیں قائل
کیا خبر مسئلۂ نام و نسب اُٹھ آئے

ذکرِ ہنگامۂ محفل نہیں واجب گوہرؔ
کوئی تو بات تھی ہم جس کے سبب اُٹھ آئے

□□

(۲)

رہی کب پیکرِ دل میں گھٹن بن کر صدا میری
سنی جاتی رہی وادی و صحرا میں نوا میری

بجز شکرِ خدا کرتے مدد کیا آشنا میری
میں صورت ناخدا کی دیکھتا تھا ناخدا میری

شرف حاصل ہو راہِ محبت میں فنا ہوکر
بنی ہے سُرمۂ چشم نگاراں خاکِ پا میری

خلوص و آشتی کا وہ فسوں پھونکا ہے ہر دِل میں
سنائیں گے کہانی فخر سے اہلِ وفا میری

بھرم روحانیت میں دسترس کا کُھل گیا آخر
پلٹ آئی ہے محرومِ اثر ہو کر دُعا میری

فضا میں سرسراہٹ سے مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے گنگناتی ہو غزل بادِ صبا میری

کیا ہے اِستفادہ ماہرینِ فن سے اے گوہرؔ
رہی طرزِ بیاں فنکارِ دَوراں سے جُدا میری

□□

ڈاکٹر جی۔آر کنول

نئے سال اور تناظر کے پنر جنم پر

ساتھیو، دوستو، شناساؤ!
تم کو معلوم ہے تو فرماؤ
حالِ دل سالِ نو میں کیا ہوگا
وقت اب کیسے رونما ہوگا
جنگ ہوگی کسی رقیب کے ساتھ
یا کسی بے وفا حبیب کے ساتھ
آرزوؤں کا رنگ نکھرے گا
یا تشدّد سے اور بکھرے گا
مسئلے زندگی کے حل ہوں گے
یا کہ پہلے سے بھی جٹل ہوں گے
زلزلہ کس نگر میں آئے گا
کتنے گھر ایک پل میں ڈھائے گا
لوگ کتنے مریں گے فاقوں سے
آگ سے، قتل سے، دھماکوں سے
سلسلہ کیا ہوگا دہشت کا
امن کے دشمنوں کی وحشت کا

ون جیتے گا آخری بازی
کس کو مانیں گے ہم نیاغازی
اس طرح کے سوال ہیں دل میں
اور بھی کچھ خیال ہیں دل میں
کون دے گا مجھے جواب کہو
عقل ہے کس کی کامیاب کہو

□□

امرتا پریتم (پنجابی کویتا)

رات آدھی ہوگئی

تھکی ہاری
نیند سے بوجھل آنکھیں
اچانک کھل گئیں
ایک آواز آئی
اری ابھی کھٹیا پر ہی پڑی ہو
اُٹھو، بہت دور جانا ہے
آکاش گنگا کو تیر کر جانا ہے
میں حیران ہوئی، بولی
میں تیرنا نہیں جانتی
مگر لے چلے ہو تو
آکاش گنگا میں ڈوبنا ضرور چاہوں گی
ایک خاموش ہلکی سی ہنسی
نہیں ری، ڈوبنا نہیں، تیرنا ہے
میں ہوں نا
پھر جب تک، کان سنتے رہے
اِک بنسری کی من موہنی آواز آتی رہی

□□

اُرمِل

سمے کی ندی

بہی جا رہی ہے سمے کی ندی یہ
نہ روکے رُکی ہے سمے کی ندی یہ

خوشی ہے یا غم ہے، یہ اشکوں سے نم ہے
سدا جل بھری ہے، سمے کی ندی یہ

بھگتی، اُمڈتی، اُپھنتی، سرکتی
نِرنتر بڑھی ہے سمے کی ندی یہ

پہاڑوں کو پھاڑے، رُخوں کو اُکھاڑے
بڑی بلبتی ہے، سمے کی ندی یہ

کبھی لعل و گوہر، کبھی ریت تٹ پر
بچھاتی چلی ہے سمے کی ندی یہ

گِروں کو اُٹھاتی، اُٹھوں کو گراتی
کہ سمتا مئی ہے، سمے کی ندی یہ

سراپا محبت، کبھی آبِ نفرت
کبھی خوں سنی ہے، سمے کی ندی یہ

بڑا ہو یا چھوٹا، کھرا ہو یا کھوٹا
کسے چھوڑی ہے، سمے کی ندی ہے

گھمنڈوں کے پنڈے، پکھنڈوں کے جھنڈے
جھکاتی رہی ہے سمے کی ندی یہ

کہانی ہے فانی سناتا ہے پانی
یگوں سے جُڑی ہے سمے کی ندی یہ

کبھی کوئی آتا، سمے بندھ لگاتا
اُسے پوجتی ہے سمے کی ندی یہ

دیے کچھ جلا دو، اُسے روشنی دو
کہ اندھی گلی ہے سمے کی ندی ہے

او اُرمِل نہ جھکنا، رواں ہو نہ رُکنا
کہ تجھ میں رمی ہے سمے کی ندی ہے

□□

اُرمل

سچ لیکن تنہا ہوتا ہے

سپنا تب پورا ہوتا ہے
جب نشچے پکا ہوتا ہے

سرور کے پنکل جل میں ہی
پنکج کو کھلنا ہوتا ہے

جھوٹے کے سب سنگی ساتھی
سچ لیکن تنہا ہوتا ہے

یوں تو سچ کو آنچ نہیں ہے
بس سُولی چڑھنا ہوتا ہے

سُولی اوپر سیج پیا کی
سُولی پر ملنا ہوتا ہے

سپنا چاہے جھوٹا ہو وہ
آنکھوں کا تارا ہوتا ہے

اندھے یگ کی بن آتی ہے
راجا جب اندھا ہوتا ہے

دیپک بتلائے گا تم کو
تل تِل کیا جلنا ہوتا ہے

موتی پانا ہے تو ڈوبو
ست ساگر گہرا ہوتا ہے

اُرمِلؔ خود کو پانے بیٹھو
خود کو خود کھونا ہوتا ہے

□□

تشنہ لبی

آنکھوں میں اشک لب پہ ہنسی کا گماں رہے
کس کی گلی سے آئے ہیں کچھ تو نشاں رہے

دیکھو اُلجھ نہ جائیں سماعت سے آہٹیں
دروازے وا رکھو کہ ہوا درمیاں رہے

رِشتوں کا قرب سوچ کی انگڑائیاں، تھکن
ایسے میں دردِ دِل کا تبرک کہاں رہے

دِل خوش تھا ہونٹ کانپے مگر یہ نہ کہہ سکے
آئے ہو اِتنی دیر سے اب تک کہاں رہے؟

خاموشیوں کو کس نے کھنکنا سکھا دیا؟
سازِ انا کے تار تو سب بے زباں رہے

اب کیا بتائیں کون، کہاں، کیسے کھو گیا؟
ہر ہر یقیں کے بھیس میں کیا کیا گماں رہے

نکہت کہیں تو دم لو کوئی موڑ ہی سہی
کیا فرض ہے کہ تشنہ لبی جاوداں رہے

□□

دردِ دل

دردِ دِل کچھ کھارے پانی کی اوقاتیں رہنے دو
تنہائی میں پاس ہمارے یہ سوغاتیں رہنے دو

ماضی کی کترن باقی ہے حال کی سیون اُدھڑی ہے
مستقبل کیسا کیا ہوگا اُس کی باتیں رہنے دو

کُتری کوشش، پیاسے لمحیں، سیمائیں اور بادھائیں
کھٹّی میٹھی کچھ یادوں کی یہ باراتیں رہنے دو

گھِر گھِر کر بادل تو آئے پر بن برسے لوٹ گئے
آشاؤں کے اِس جگ میں سوکھی برساتیں رہنے دو

کچھ نہ کچھ تو دے کر جاؤ جس پر میں سوچوں سمجھوں
شطرنجی چالیں رہنے دو شہہ اور ماتیں رہنے دو

جیسا بھی ہے جو کچھ بھی ہے اُس کو ہی سب کچھ جانو
کورے کاغذ سامن رکھو قلم دواتیں رہنے دو

آوازیں کستے رہنا تو نکہت جگ کی عادت ہے
کیسے گزارے کیسے بیتے دِن اور راتیں رہنے دو

□□
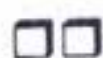
سمجھ کے سوچ کے ہر پاؤں ہم کو دھرنا ہے

ابھی تو کام بہت زندگی میں کرنا ہے
خوشی کے پھول سبھی آنچلوں میں بھرنا ہے

میں چن رہی ہوں یہ راہوں کے خار پلکوں سے
یہیں سے ہو کے ہر ایک شخص کو گزرنا ہے

اگر ہے چاہ کہ یہ زندگی سنور جائے
تو بن کے خاک ہمیں ہر طرف بکھرنا ہے

خُدا ملے بھی تو کیسے، کہ کام مشکل ہے
ملن خدا کا سمندر میں جا اُترنا ہے

بچھے ہیں چاروں طرف مایا موہ کے کانٹے
سمجھ کے سوچ کے ہر پاؤں ہم کو دھرنا ہے

خوشی کے ساتھ دیے غم، تو رات دِن بھی دیے
دلیل جینے کی دُنیا میں روز مرنا ہے

یہ مشکلیں تو رہیں گی میں اے سویتا
کہا یہ کس نے ہمیں مشکلوں سے ڈرنا ہے

□□

ڈاکٹر رنجنا اگروال

ضرورت کیا ہے؟

بھیڑ کے ساتھ نبھانے کی کیا ضرورت ہے
لوگ پتھر ہیں منانے کی ضرورت کیا ہے

اپنے قدموں پہ بھروسہ تو کرو اے ہمدم!
ساتھ چلنے کو زمانے کی ضرورت کیا ہے

آؤ ہم تلخ حقیقت سے نبھانا سیکھیں
یوں حقیقت کو بھلانے کی ضرورت کیا ہے

کیوں نہ ساحل کو بھی آئینہ دکھادیں، آؤ
اس قدر آنکھ چرانے کی ضرورت کیا ہے

زندگی اپنی، قدم اپنے، ہے منزل اپنی
راہ چلنے کو بہانے کی ضرورت کیا ہے

□□

مکتی ورما (ہندی سے) مترجم بلراج ورما

تشہیر

سُنا ہے، تم اپنی تصویروں کی نمائش کرنے جا رہی ہو
دوستوں کا مشورہ ہے
اِس میں بُرائی بھی کیا ہے، مگر!
مگر؟

یہ بے رحم شہر!!
میں تنقید سے نہیں ڈرتی
میرا اِشارہ مصوّری کے مقامی نقادچیوں کی جانب نہ تھا
تو پھر؟
ان سے کہیں خطرناک ہے،
اس شہر کی دقیقہ رس اور باریک بین جنتا،
جو خود کاغذ کے پھولوں کی طرح مصنوعی ہے
مگر ہر خوشبو کی جڑ اور بنیاد پہچانتی ہے
یہ لوگ بکاؤ نہیں

خریدار ہیں
ان کی منظوری اور پسندیدگی کے حصول کے لیے، ان کی آنکھوں میں
بھبھوتی جھونکنی ہوگی
بھبھوتی؟
فکر نہ کرو، اِس کا انتظام میں کردوں گی

□□

مکتی ورما (ہندی سے) مترجم بلراج ورما

تخلیق

تم لوگ
فن کے شیدا تو ہو
مگر، اپنے عظیم فن کاروں کے قدرداں ذرا بھی نہیں
اُدھر ہمارے وہاں، ہر بڑی عمارت، محل یا کلیسا کے بانی اور معمار کا نام
سنہری حروف میں کندہ رہتا ہے
ادھر تمہارے یہاں
ماضی کی کسی بڑی عمارت
فنِ تعمیر کے کسی شاہکار
محل،

مندر،
یہاں تک کہ اجنتا کی ان بے مثل و بے نظیر
گپھاؤں کی شاہکار تصویروں کے عظیم خالقوں کے نام دھام کا کسی کو علم نہیں
سب اتنا ہی جانتے ہیں، کہ:
یہ کس عہد میں، کس حکمران کے راج میں بنی تھیں

****

یہ ماہرینِ فن کے عہد کی یادگاریں ہیں پیاری
ہمارے عہدِ ماضی کا فن کار
اپنے شاگرد کی تعلیم و تربیت کو تب تک کامیاب نہیں سمجھتا تھا
جب تک کہ وہ اُسے
وہ سب کچھ نہ سکھا دیتا تھا
جو وہ خود جانتا تھا
ہمارے تولیدی دَور کی
اُس تہذیب میں
نشو و نما پائی ہوئی نسلوں کا ہر فن کار با کمال تھا
جہاں سبھی با کمال ہوں
جہاں دادا پردادا کا شروع کیا ہوا کام، پوتا پڑپوتا سر انجام دے
وہاں نام نہیں، کام ہی افضل ہوتا ہے
کرم یوگیوں کے اُس یُگ میں
تشہیر نہیں،
تخلیق ہی اصل شے مانی جاتی تھی

□□

مکتی ورما (ہندی سے) مترجم بلراج ورما

میرے آبا کی حویلی

سورج، چاند، ستارے
فضا کی قوس میں ٹنگے
ہیرے، موتی، جواہر، پنے —
آسمانوں کی لامحدود خلا میں چمکتی دمکتی دیوتاؤں کی مہربان نوری
آنکھیں —
وہیں، کہیں،
اُنھیں کے مابین
میرا گھر،
میرے آبا کی حویلی ہے
جس کے آنگن کے خاموش، بے آواز نغمے
زینہ زینہ اُتر آئے ہیں دھرتی پر، اور
آ بجے ہیں
میرے دِل میں جو یگوں سے خالی اور ویراں ہے
یہ گہری اٹوٹ سمادھی

کانوں کا سنگیت

میرے دل کا سرور
اس کی مچلتی دُھنیں گاتی گنگناتی
آج مرے ہونٹوں پر، آجمی ہیں
رقصاں ہیں
انھیں کی توسیع ہے
ابدی مسرّت کا وہ نشہ
جو آج مہک مہک اُٹھا ہے میرے قلب وجگر میں،
اور چہک چہک کر گنگنانے لگا ہے
اپنے آبائی ازلی ابدی سرمدی گیت
جو مفہوم سے ماورا ہیں
جن میں دُھن ہی دھن ہے
شبد ایک بھی نہیں،
اِن گونگے نغموں کا جادو
کھول دیتا ہے ہر وہ دیار
وہ مدتوں سے مقفل کھڑکیاں
جن کے پیچھے چھپا بیٹھا ہے میرا محبوب
جو منتظر ہے مرا
تب سے جب سے اُس سے روٹھ کر، زِندگی کی تلاشِ بیجا میں،
میں دھرتی پر چلی آئی تھی —
پھر ایک دن
کسی ایک مبارک ساعت میں جو پہلے ہی سے نردھارت ہے
جنم جنمانتر کی مری سمادھی ٹوٹتی ہے

میں آنکھیں جھپکاتی ہوں، کھولتی ہوں
اور وہ اپنی ازلی شرارت سے مسکرا کر جھانکتا ہے میری آنکھوں میں
پہچان لیا ہے نہ میں نے تجھے بھگوڑی، پکڑ لیا ہے نا
چل اب لوٹ چلیں ـــــ

□□

رگھوناتھ گھئی ـــــ سوانح اور کارنامے

رگھوناتھ گھئی کا جنم اسلام آباد کشمیر، کے اُرّیURRI گاؤں میں 19 /دسمبر 1918 کے روز ہوا۔ اِس اعتبار سے اُنھیں کشمیری نژاد کہا جا سکتا ہے۔ کشمیر سے اُنھیں بے پناہ محبت تھی۔

اوّلین تعلیم اُنھوں نے راولپنڈی میں حاصل کی۔ 1936 میں ڈی اے وی کالج لاہور سے بی۔اے کیا۔ 1938 میں فارمین کرسچین کالج لاہور سے انگریزی ادبیات میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ 1947-1940 تک اپنے راولپنڈی والے خاندانی کاروبار میں مصروف رہے۔

دورانِ تعلیم بھی ان کی مجلسی اور تخلیقی سرگرمیاں اپنے ساتھی طلبا میں ہمیشہ قابلِ عزت واحترام بنی رہیں۔ کچھ ایک کا ذکر:

- ایڈیٹر : COMMING RENAISCENCE
- ایڈیٹر : فلمی ماہنامہ FILMITE
- ایڈیٹر : کالج میگزین NIRJHAR
- سیکریٹری : ساکریٹ کلچرل سینٹر
- سیکریٹری : ڈاکٹر ستیہ پال کی سوراج سبھا
- کنوینز اور صدر : STUDENTS SAWARAJ
- صدر : بھگت سنگھ مارٹرڈم میموریل لیگ

1947 یعنی تقسیمِ ہند کے بعد بطورِ مہاجر دلّی میں آ کر بس گئے اور تا حیات (یعنی 15 را کتوبر 2002 تک) یہیں رہے۔ اِس دوران دوسری کاروباری (صنعتی) اور تخلیقی مصروفیات میں جُٹے رہے۔

1967 سے 2000 تک: بریڈ بری فنلے اور سیز (Bradbury (Overseas Finlays کے ڈائریکٹر اور World View English Monthlies اور The Man کے ایڈیٹر، پبلشر رہے۔ اِس دوران اُردو، ہندی شعرا کی ماہانہ "محفل شامِ یاراں" کے کنوینر بھی رہے۔

1986 میں اُنھیں مرکزی وزیرِ عزت مآب جناب کے سی پنت کے دستِ مبارک سے اُن کی صحافتی سرگرمیوں کے احترام میں All India Small & Medium News Papers Federation کا Certificate of Merit پیش ہوا۔

اُن کا ایک بڑا اور معروف کارنامہ INSTITUTE FOR PEACE AND CULTURAL EVOLUTION تھا جس کی بنیاد انھوں نے سوامی رام تیرتھ نگر، نئی دلّی میں کئی سال پہلے رکھی تھی۔ اِس پُر وقار ادارے کا نام سفارت خانوں (Diplomatic Circles) میں بڑے احترام سے لیا جاتا تھا۔

اِس بین الاقوامی سنستھا کے اغراض و مقاصد جوگھئی صاحب کے کھلے، کشادہ دل و دماغ اور روشن ضمیر کے ضامن ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کی خاطر درپیش ہیں۔

PEACE IF YOU WILL

Aims and Objects of the Institute

191 سے بعد کے مضامین حیدرآباد سے قمر جمالی اور محمود حامد نے بطورِ شمارہ ۳۱۔۳۲ بھجوائے ہیں۔

□□

PEACE IF YOU WILL

The human society on this planet of ours is not very old. When we talk of ancient times we mean only a period of two to four thousand years which if understood in comparison to the life of the universe may be a fraction of a small duration. This rather reminds us of the limitations of human capacity. But man who believes to have brought his fires from heaven does not care to look on these limitations. He compares himself to animals and thinks proudly of his own achievements. On the other hand when he thinks of God, he only brings the Almighty down to the level of human beings - only a bit more powerful.

It is really commendable that this "wonderful piece of work"–the man, ıas so soon become conscious of the necessity of living and developing on this planet as a one whole. Scientific and technological researches made in such a short time of his life on earth, and, particularly in the last two centuries, have brought the human beings closer to each other. Economical and political evolution among various compartments of human society is imposing on us the obligation to treat this world as a single unit.Interchange of citizenship, interdependence of trade and commmerce, common political aspirations for higher standards of living are creating common Interests among the men and women of this world. And yet, regretably enough, we see that the aim that mankind should be able to live in an ideal communion and peace is a diatant oasis – a matter of wishfull dreaming – not a conscious ideal or an urgent practcial necessity inducing us to move with devotion for its realization. In certain quarters the subject is snuffed out as a mere prattle or an after dinner discussion when having satiated your hunger you can talk with lightness. Several practcial means adopted to bring about some sort of

formal unity have corne to nothing and it looks as if the matter is not being taken seriously. All have, anyhow, come to realize that what is required is the redical overhauling of the very making of human nature, rather than the pruning and shapping of what is externally visible.

Success or failure in life, in the case of an individual, depends on what he is and what he aims at. This is also true about a particular society, a nation or a race. Their achievements in particular feilds are, firstly, the outcome of the principles of their persuits, which give them the fire and the confidence, and secondly, the laws that guide and mould their actions in the struggle. A man is not the composition of mere chemical and physical properties; you cannot completely conceive of him as a mere biological phenomenon. This "wonderful piece of work" has to cross the region beyond his physical being to find his complete self in the realm of spirit where he may revel in the expression of his aspirations. This great desire in man for tasting the forbidden fruit from the gardens of heaven is the cause of all his restlessness and worry which keeps him busy through out his life. This hunger in man is the very essence of his life; that is what, in fact, makes his life worth living, makes his pleasure enjoyable and worst pains bearable – so much so, that he is, at times, prepared to secrifice his very state of being physically alive in presuit of its fulfilment. It verily, brings him in competition with others of his species and has created such differences as those appear in the shapes of nations, races, religions etc. The division of mankind into hostile camps and antagonism among these camps has its roots in his inherent pasion for self fulfilment. The conflicts in human affairs are, thus, primarily due to division in human soul and it would be unfair and misleading to ascribe tham only to the differences in economic standard. A society can be transformed outwardly in its looks by improvement in the standrads of living but can be remade only by changing the hearts and minds of its men and women. If you are able to bring home to the peopleof the world the correct idea of happy life and the means to achieve it,giving them to realize that to understand the idea of happy living itself would involve a revolution within - a war against mans wrong thinking and cowardly selfish behaviour towards others, then a lot os noise about socialistic distribution of the

amenities of life will become unnecessary and ideal socialism will become a realized fact. Happiness, in the world of the present times, is not the legacy of the materially previllaged persons. Almost all of them are most unhappy and are passing their days in desparation – pressed under worries and fear. The present economic competition and stress on money and material gains as the means to happiness have brought nothing but misery and madness, both among the rich and the poor, and have been great cause of turning them into inhuman beasts – selfish, mean and cowardly. Our education, our development from childhood to youth and manhood, have one single aim, that is, to prepare ourselves for competing and excelling others–not in human virtues of love, co-operation and mutual sympathy but in lifeless material gains which instead of bringing real happiness only show us a mirage where things are not as they seem. We are trained to be selfish, selfcentred and narrow-minded cowards, cleverly searching for the opportunities to take advantage of others weaknesses. The necessity of strict socialist rule, which has been decidedly recognised as the only cure for the ills of the present times, is portent of the developing aberration in human character rather than any "progressive" improvement in his making. Strict administrative pressure of any kind is necessitated to control the free-play of baser animal instinct in man, which indicates that the society requires such external control because it is suffering from acute ailments beyond the normal control of the administrative organs. A political institution is to be considered good if it is mainly concerned with and is concentrated upon building up its members as persons capable of free activity, having good taste and skill in the art of living. It is shocking to see that not a single state in the present human society including India has been able to stand the above test and that is why, inspite of our best wishes, we find ourselves helpless and are not able to excercise any control on the present state of affairs in the world. We are being mis-guided and deceived; we are being hypnotized to do the things which we do not will, like helpless victims of

world forces which are proceeding to an end unknown to us. Scientific and techonological advancement has brought us quite near our goal and we are now able to see that it is possible for us to provide happy, rich and dignified life to every human being ; and yet we are heading towards death and destruction with fear written at our faces.

The time has now come when we cannot afford to wait any longer and shall have to remove the "fault" in us. We should not get bewildered and lost in present speed of scientific progress, but keep our heads cool and learn to behave as members of an international community by developing in ourselves inward awareness and social compassion. While the scientist has shown to us the 'shape of things to come' and has brought us close to the gates of heaven we have to see and understand how to enjoy the bliss of heavenly life rather than fall prey to the snares and turn it into hell. We should not lose hope; because behind the weakness there is somthing of cognible magnitude in the making of man. Every one of us has his own self inside him. We have only to change our methods of superficial approach. We should adopt means to enlighten the man about his true self and to make him see the true spirit of the completeness of human life free from greed and fear which have become basis of our present archaic and competitive society. In order to change and improve the society you have to bring about improvement in the human character and to make the men and women aware of the ideals that should guide them. Our efforts should be centralized on the idea of right education and an organized fight against traditional misguiding ideals of patriotism, racialism, religious fanaticism, lust for domination, self agrandisement and greed for material gains which have since long over-powered us, and have earstwhile held us from enjoying the immence wealth of pleasures that the nature has in reserve for us. The two antagonistic ideologies facing each other with suspicion and distrust in various compartments of this unhappy world shall have to be warned against the use of destructive methods. The present world is not the same as it was when these ideologies came forth, and the present situation demands that

they should throw aside the cudgles and come forward with saner thinking and more healthy approach to the problem. In case their followers are true to the basic idea and are prepared to shake off the extremes they would surely find a meeting place to resolve their differenses and tackle the problem without prejudices and misgivings. Those who have any faith in the human soul would agree with me that it is possible to bring about a happy union between the two. The spirit of man never failed whenever it willed. We have before us the past history of man showing how he struggled through failures always moving forward inspite of set backs and adversities. This spirit in man has not yet died and is bound to remain alive.

We shall, however, have to set up and follow a practiable programme by means of world-wide organizational set up to mobilize the abilities of honest thinking men and women at present living their lives in suffocation due to stagnation of their capabilities in the world where only opportunists are holding the feild. It is indeed very huge task but the least impossible one. We shall have to do the spade work and lay the foundation on which the superstructure of the edifice will be raised by the coming generations. Foundations are more important and have to be laid on solid grounds to give inspiration, courage and sense of direction to the efforts of millions to come.

Raghunath Ghai
Promoter

Aims and objects of the Institute

1. To set forth and carry forward inter-cultural evolution in the world and therby to lay the foundations of lasting peace and prosperous life for mankind.

2. To eradicate the evils of racial discrimination, to resolv economic disparity among nations to dispel hatred, fear and distrust among politicians and diplomatic heads and to completely estop the use of brute force and violence in the settlement of disputes.

3. To direct the energies of the human society to bring about organic unity, health and whole-some-ness of the human world and to dismental the barriers created by groupism, un-scruplous oppourtunism and lust for domination over others.

4. To cultivate the sense of responsibility and discipline among people by respect for justice, liberty, equality and fraternity.

5. To set forth new ideas and to suggest appropriate principles for their pursuit to the younger generations by ameliorating the mode of education according to the needs of the time in view of the situation created by the speedy advancement of science and technology.

6. To assist the United Nation Organization and its various agencies in their programme of promotion of world unity to pave the way for some sort of effective and powerful world authority or a rudimentary world government to bridle and control the irresponsible behavior of certain groups of people or nations and to rule out the destructive use of atomic energy.

7. To bring forth into social conciousness the inherent feeling of brotherhood of man to develop this sense as an active force for the unification of human society.

8. To set forth a current of evolution in the human concience for shapping a better future for humanity, preserving peace and averting war, by improving the political climate, by strengthening the confidence among nations, by fostering politics of co-existence, by continuous flow of science technology and by socialization of human resources abridging economic disparity among nations.

9. To bring forth an atmosphere of optimism and confidence showing that, inspite of set backs and weakness, mans unconquerable will is bound to achieve for him higher objectives of life and win over the evils of selfishness, greed and narrow mindedness.

10. To promote synthesis of scientific outlook of the West and philosophic moral sence of the East so as to tame the in-human energies, of such scientific discoveries as atom, for the good of the man.

آئندہ شمارہ۔نمبر ۳۳

ایک جھلک

مضامین

۱۔ ہندوستان کا نظام جمال ——————(مصنف پروفیسر شکیل الرحمٰن)

مبصر بلراج ورما

بُدھ جمالیات سے جمالیات غالب تک۔ (تین جلدوں میں)

۲۔ عازم کون ہے؟——————پروفیسر آر کنولؔ

۳۔ افسانے میں فضا آفرینی——— ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

۴۔ اندر اِک آسمان (مصنف گیانیشور مولے) محمود ہاشمی۔محمد صلاح الدین پرویزؔ

حقانی القاسمی اور نظام صدیقی

۵۔ سلام بن رزاق ——————نورالحسنین

۶۔ یوسف سرمست——————ڈاکٹر نسیم الدین

۷۔ تم نے فراق کو دیکھا تھا ——————پروفیسر کرامت علی کرامت

تراجم

۱۔ کوُروکھشیتر (نظم) اُڑیا ——————پروفیسر کرامت علی کرامت

۲۔ زنداں نامہ غالب (فارسی)——————مضطر مجازؔ

۳۔ چند بنگالی۔اڑیا اور چینی نظمیں ——————رام پرکاش راہی

۴۔ Heart Beats انجم شکیل کی انگریزی نظمیں۔رام پرکاش راہی

شکیل الرحمٰن

جمالیاتِ رُومی

چار امتیازی جمالیاتی جہات

ایک پرانی تمثیل ہے، چند دوست جمع ہوئے خوب شراب پی، خوب کھایا، خوب رقص کیا، ہر شخص مستی میں جھوم رہا تھا، پورے چاند کی رات تھی، وہ ایک دریا کے کنارے آئے سوچا کشتی لے کر سیر کی جائے، کشتی بان موجود نہ تھا، چاندنی رات میں دریا کا حسن انھیں مست کر رہا تھا، رات کافی گزر چکی تھی، ہر جانب خاموشی تھی، ان کے پاؤں نشے کی وجہ سے ڈگمگا رہے تھے، خوب لہک لہک کر گانے لگے، رقص کرنے لگے، کشتی پر بیٹھ گئے، پتوار ہاتھ میں لے کر ان میں سے دو دوستوں نے کشتی چلانا شروع کی۔ وہ تیز تیز آگے بڑھ رہے تھے اس لیے کہ وہ پتوار تیز تیز چلا رہے تھے۔ کئی گھنٹے گزر گئے سب یہی محسوس کر رہے تھے کہ وہ کشتی میں سفر کر رہے ہیں، صبح ہونے کو آئی، خوشگوار ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں، آہستہ آہستہ اب وہ ہوش میں بھی آنے لگے۔ ایک دوست نے کہا ''ہم رات بھر چلتے رہے اب کنارے پر پہنچے ہیں ذرا یہ تو دیکھ لیں یہ کون سی جگہ ہے، ہمیں گھر بھی لوٹنا ہے، صبح ہو گئی ہے۔'' ان دوستوں میں ایک کنارے پر اترا، چند لمحوں تک اُس پر حیرت طاری رہی پھر وہ کسی پاگل کی طرح ہنسنے لگا اور وہیں زمین پر لوٹنے لگا۔

ساتھیوں نے پوچھا ''بات کیا ہے! تم اس طرح ہنس کیوں رہے ہو؟''
پاگل کی طرح ہنسنے والے دوست نے ہنستے ہوئے کہا ''ذرا کشتی سے تو اُترو پھر دیکھو کیا ہوا ہے۔'' سب کشتی سے اتر گئے۔ پھر سب اسی طرح ہنسنے لگے کہ جس طرح وہ پہلا دوست ہنس رہا تھا۔ وہ کشتی چلاتے ہوئے یہ بھول گئے تھے کہ انھوں نے کشتی سے رسّی کھولی ہی نہیں، کشتی وہیں کھڑی ہے کہ جہاں تھی، رات بھر وہ جدّ و جہد کرتے رہے، یہ سوچتے رہے کہ وہ چاندنی رات میں کشتی پر بیٹھ کر دریا کی سیر کر رہے ہیں، وہ تو ایک اِنچ بھی آگے نہیں بڑھے تھے۔ یہ حالت ہر اُس شخص کی ہوتی ہے جو یہ سوچ لیتا ہے کہ اس نے حقیقت سمجھ لی، سچائی کو پالیا یا سچائی کے قریب آ گئے۔ دماغ کا نشہ غلط فہمی پیدا کرتا رہتا ہے اور اس کا احساس نہیں ہوتا۔ مولانا رومیؒ نے مثنوی میں ایک سچائی اس طرح بیان کی ہے کہ وہ شخص جو خوابوں کی دنیا میں رہتا ہے، خواب میں پیاس لگتی ہے اور خواب ہی میں وہ ندی کی جانب دوڑتا ہے، اسے ندی نہیں ملتی، وہ فینٹاسی کی دُنیا میں ہوتا ہے لہٰذا حقیقت اور سچائی سے دور رہتا ہے۔ مولانا رومیؒ کی جمالیات حسّی اور باطنی سطح پر سچائی اور اس کے حسن و جمال کے تئیں بیدار رکھتی ہے۔

کلامِ رومیؒ کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے چار امتیازی جمالیاتی جہتوں کا احساس بڑی شدّت سے ہوا۔ پہلی جہت ''جاگرتی اور بیداری'' کی ہے۔ شاعر زندگی کے جلال و جمال کے تئیں بیدار کرنا چاہتا ہے، اس کی خواہش ہے کہ کائنات کے حسن و جمال کی پہچان ہو، انسان میں خالقِ کائنات کی تخلیقات کو سمجھنے کا شعور پیدا ہو، زندگی بہت خوبصورت ہے، اس کی تاریخ کی سچائیوں میں بڑے معنی خیز جمالیاتی تجربے ہیں، انسان اور کائنات اور انسان اور اللہ کے درمیان عشق کا خوب صورت رشتہ ہے۔ ایسی جاگرتی پیدا ہو، ایسی بیداری آئے کہ اللہ کے حسن، کائنات کے جلال و جمال اور انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کی سچّی پہچان ہو سکے۔ اس کے لیے ذہن کو روحانی تربیت کی ضرورت ہے۔ مولانا رومیؒ کے مطابق سینوں کو مانجھنا پڑتا ہے۔ آئینے کی صفائی دل کی صفت بن جاتی ہے جو لاانتہا صورتوں کو قبول کرنے والا ہے۔ حسن و جمال کی ایک صورت وہ ہے جو چینیوں کے فن میں ہے، رنگ

روغن اور خوب صورت نقشوں اور خاکوں سے جمالیاتی انبساط عطا کر۔ نے کی کوشش اور دوسری صورت وہ ہے جو رومیوں کے فن میں ہے، نہ رنگ نہ روغن، سادگی کا حسن، سادگی کا جلوہ، رنگا رنگی میں مٹی کی چمک دمک اور خوشبو ہے، سادگی میں عالمِ وحدت کی جانب اشارہ، جاگرتی ایسی ہو کہ 'عالم کثرت' اور 'عالم وحدت' دونوں کی پہچان ہو سکے۔

دوسری جہت کا تعلق 'دل' سے ہے۔ عشق کا مرکز دل ہے لہٰذا دل ہی عشق کرنے پر اُکساتا ہے۔ خالقِ کائنات جو خود اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے اس سے محبت کا رشتہ قائم ہو جائے تو زندگی، موت اور موت کے بعد کی زندگی کا جمال ظاہر ہو جائے۔ ایک مذہبی شخص اپنے کٹر پن سے نہیں بلکہ اپنے کھلے ہوئے دل سے پہچانا جاتا ہے۔ مذہب سے وابستہ شخص اپنے کھلے ہوئے دل اور اس دل کے اندر محبت کی خوشبو سے جانا جاتا ہے۔ عشق الٰہی کے مرکز پر جو پھول کھلتا ہے اس کی خوشبو زمین سے عرش تک پہنچتی ہے۔ عشق اور عشق کے رشتوں کا جشن اسی مرکز پر منایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں خود بینائی کا نور، دل کا نور ہے:

نور نورِ چشم خود نور دل ست

بینائی کا نور دلوں کے نور سے حاصل ہوتا ہے:

نورِ چشم از نورِ دلہا حاصل ست!

دل کی بصیرت کا نور خدا کا نور ہے:

باز نور نورِ دل نورِ خدا ست

جو عقل اور حس کے نور سے پاک اور جدا ہے:

کوز نور عقل وحس پاک وجداست

وہ سرخ اور سبز اور گلابی کو کب دیکھ سکے گا:

کے بہ بینی سرخ و سبز و بور را

جب تک ان تین سے پہلے نور کو نہ دیکھ لے گا:

تانہ بینی پیش ازیں سہ نورا!

رنگ کا دیکھنا، بیرونی روشنی کے بغیر نہیں ہوتا یہی حال اندرونی خیال کے رنگ کا ہے:

نیست دید رنگ بے نور بروں
ہم چنیں رنگِ خیالِ اندروں

وہ آنکھ یا وہ نگہ جو دل کے اندر ہوتی ہے اس کے متعلق مولانا رومیؒ کہتے ہیں:

چشم داند فرق کردن رنگ را
چشم داند لعل را و سنگ را
چشم داند گوہر و خاشاک را
چشم را زاں می خلد خاشا کہا

یعنی آنکھ رنگ میں غرق کرنا جانتی ہے آنکھ لعل اور پتھر کو پہچانتی ہے، آنکھ موتی اور تنکے کو جانتی ہے اسی لیے آنکھ میں تنکا کھٹکتا ہے۔

تیسری جمالیاتی جہت یہ ہے کہ شاعر چاہتا ہے کہ فطرت کے رموز و اسرار کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، جیسے جیسے سمجھتے جائیں گے جمالیاتی بصیرت اور جمالیاتی انبساط حاصل ہوتا جائے گا۔ فطرت یا نیچر کی معنویت کیا ہے؟ جو مشکلات اور پریشانیاں آتی ہیں اور انسان کبھی کبھی جن اذیتوں سے گزرتا ہے ان کی سچائی کیا ہے؟ الوہی عشق سے مشکلات اور پریشانیوں کو دور کرنے اور اذیتوں پر فتح حاصل کرنے میں کس طرح کامیابی ہوتی ہے اور اس کے کیا نتائج سامنے آتے ہیں، مشکل دُور ہوتی ہے، کوئی پریشانی ختم ہوتی ہے تو جمالیاتی آسودگی حاصل ہوتی ہے اور ایسی جمالیاتی آسودگی سے باطن میں کتنا سکون پیدا ہوتا ہے۔ الوہی عشق سے ایک جانب مشکلات دُور ہوتی ہیں اور انسان بہت سے خطروں کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتا ہے اس کے ساتھ ہی اس عشق سے موت کی سچائی کا شعور حاصل ہوتا ہے اور موت کی جمالیات پورے وجود میں کس طرح کی چاہت اور آرزو پیدا کرتی ہے۔ 'وحدت کا شعور' (Unity-Consciouness) حاصل ہوتا ہے تو پر اسرار سفر کی آرزو کس طرح بے چین کرتی ہے۔ دل کا آئینہ اس سطح پر پاک وصاف ہو جاتا ہے لہٰذا انسان آب و خاک سے بالاتر نقش دیکھنے لگتا ہے، نقش بھی دیکھتا ہے اور نقاش کو بھی

دیکھتا ہے:

آئینہ دل چوں شود صافی و پاک نقشہا بینی بروں از آب و خاک

ع ہم بہ بینی نقش و ہم نقاش را!

کہتے ہیں:

تا بود کز دیدگانِ ہفت رنگ دیدۂ پیدا کند صبر و درنگ

رنگہا بینی بجز ایں رنگہا گوہراں بینی بجائے سنگہا

گوہرے چہ بلکہ دریائے شوی آفتابِ چرخ پیمائی شوی

یعنی ممکن ہے کہ سات پروں والی آنکھوں کی بجائے صبر اور استقلال ایک آنکھ پیدا کردے جس سے ان رنگوں کے علاوہ تو اور رنگ دیکھے۔ سنگ ریزوں کی بجائے تو موتی دیکھے، موتی کیا بلکہ تو دریا بن جائے۔ آسمان کو طے کرنے والا سورج بن جائے۔

لطف گشت و نور شد مرنا راُو

یعنی وہ محبت بن گیا، اس کی آگ نور بن گئی!

اور چوتھی جمالیاتی جہت 'وصل' یا وحدت ہے۔ وصل اور وحدت کے ساتھ ہی ایک انتہائی خوب صورت اور پراسرار آہنگ سنائی دینے لگتا ہے۔ مولانا رومیؒ نے اس آہنگ کو صوفیانہ آہنگ (Mystical Symphony) میں تبدیل کردیا ہے۔ وصل، حیرت کے جمال کی انتہا ہے۔ مولانا رومیؒ نے اسے اللہ کی جانب بڑھ کر وحدت کی بات نہیں کی ہے بلکہ اللہ کے اندر سفر کرنے کی بات کہی ہے۔ یہاں موت کی جمالیات شدّت سے متاثر کرتی ہے۔ یہ جمالیات زماں و مکاں سے کہیں آگے اپنے حد درجہ معنی خیز اور پراسرار پروں کو کھولتی ہے، ایک پر کھلتا ہے اور جلال و جمال کا ایک پراسرار منظر سامنے ہوتا ہے۔ مولانا رومیؒ نے یہاں دنیا کے بہت سے شعرا اور خصوصاً صوفی شعرا سے اوپر اٹھ کر Deathless Consciousness کو حد درجہ محسوس بنادیا ہے، یہاں وقت کا تصور ہی گم ہوجاتا ہے۔

مردہ بدم زندہ شدم گریہ بدم خندہ شدم
دولت عشق آمد و من دولت پایندہ شدم

(مولانا رومیؒ دیوان شمس تبریزی)

زلیخا کے تعلق سے وہ اشعار یاد کیجیے کہ جن کا ذکر میں نے پچھلے صفحات میں کیا ہے اور غور فرمایئے کہ زلیخا کس طرح ایک عاشق کے پیکر میں ڈھل گئی ہے۔ مولانا رومیؒ نے کچھ آگے بڑھ کر کیا کہا تھا؟ انھوں نے کہا تھا جب تم سچّے دل سے ہمیشہ کے لیے محبت میں گم ہو جاتے ہو تو تمہاری رُوح اللہ میں جذب ہو جاتی ہے، روح کے متعلق بات کیجیے تو اللہ کے متعلق ہوتی ہے اور اللہ کے بارے میں بات کیجیے تو وہ روح کے بارے میں ہوتی ہے۔ زلیخا نے یوسفؑ سے بے پناہ محبت کی، یہ راز ظاہر نہ ہو جائے اس کے لیے اس نے مختلف اصطلاحیں وضع کر رکھی تھیں 'سپند' سے مراد یوسف ہیں، اس لفظ سے اس دھونی کا خیال آتا ہے کہ جس کے دھوئیں کو نظرِ بد سے بچنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اسی طرح 'اگر' کا لفظ ہے کہ جس کی خوشبو حضرتِ یوسفؑ کے وجود کو ظاہر کرتی ہے۔ زلیخا نے کالے دانہ سے لے کر اگر تک ہر چیز کا نام یوسف رکھا تھا، ان کا نام ان ناموں میں چھپا ہوا تھا، وہ کہتی موم آگ سے نرم ہو گیا تو بتانا مقصود یہ ہوتا کہ یار مہربان ہو گیا ہے اگر کہتی چاند نکل آیا ہے یا اس بید کی شاخ سبز ہو گئی ہے، کہتی پانی میں عمدہ لہریں پیدا ہو رہی ہیں، پتّے تالیاں بجا کر رقص کر رہے ہیں یا پھول نے بلبل سے راز کہہ دیا ہے تو مقصد یہی ہوتا کہ یوسف کا ذکر کر رہی ہے:

ور بگفتے دوش دیگے پختہ اند
یا حوائج از پزش یک لختہ اند

اگر کہتی کل رات انھوں نے دیگ پکائی ہے یا مصالحہ پکنے سے ایک جان ہو گئے ہیں تو اشارہ عشق میں وحدت کی جانب ہوتا۔ اس نے اس طرح ہزاروں نام ملا رکھے تھے اسی طرح کہ جس طرح عاشقِ خدا اللہ کے ہزاروں ناموں کو اپنے دل میں ملائے رکھتا ہے، بھوکی ہوتی پیاسی ہوتی تو یوسفؑ کا نام لیتی اور بھوک پیاس مٹ جاتی، موسم سرما میں یوسفؑ

کے ذکر سے بدن میں حرارت اور گرمی پیدا ہو جاتی۔ اللہ کے ذکر سے بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ حرارت اور گرمی آ جاتی ہے۔ مولانا روم کی چوتھی جمالیاتی جہت اس طرح ابھرتی ہے:

چونکہ باحق متصل گردید جاں
ذکر آں نیست ذکر ایں نست آں

یعنی جب جان اللہ سے وابستہ ہو گئی تو اللہ کا ذکر اس کا ذکر اور اس کا ذکر اللہ کا ذکر ہے۔ عاشق خود سے خالی ہو جاتا ہے اور عشقِ محبوب سے پُر ہو جاتا ہے، پھر پیالے سے وہی ٹپکتا ہے جو اس میں ہوتا ہے۔ مولانا رومیؒ کی چوتھی جمالیاتی جہت کی یہ بہت ہی خوب صورت مثال ہے:

موت کی شیرینی اور مٹھاس کا یہ احساس دیکھیے:

جزوِ مرگ ارگشت شیریں مَرترا
داخکہ شیریں میکند کل را خدا

اگر موت کا جزو تیرے لیے شیریں ہو گیا ہے تو سمجھ لے کہ خدا **کل** کو میٹھا کر دے گا۔ مولانا رومیؒ کے لڑکے سلطان ولد نے لکھا تھا کہ ایک دن میں نے اپنے والد سے کہا کہ ''آپ کے کچھ احباب جب آپ کو نہیں دیکھتے تو انھیں بے حد تکلیف ہوتی ہے، ان کی خوشیاں گم ہو جاتی ہیں۔'' میرے والد نے جواب دیا ''وہ احباب جو میری غیر موجودگی میں خوش نہیں ہوتے وہ حقیقتاً مجھے جانتے ہی نہیں، جو مجھے جانتا ہے وہ میرے بغیر بھی خوشی محسوس کرتا ہے، وہ میری محبت میں ڈوب جاتا ہے، میرے تعلق سے سوچنے لگتا ہے، میرے خیالات پر غور کرتا رہتا ہے اور خوشی محسوس کرتا ہے۔'' مولانا رومیؒ نے اپنے بیٹے سے کہا ''تم جب بھی تصوف کی مٹھاس اور شیرینی میں ڈوبے رہو یہ سوچتے رہو کہ یہ شیریں کیفیت، میں ہوں تمہارے اندر—!'' سلطان ولد نے آگے لکھا تھا ''میرے والد اکثر کہتے جب بھی تم مجھے تلاش کرو مسرتوں میں ڈوب جاؤ، ہم لوگ، ہم سب مسرت وانبساط ہی کی دنیا میں تو ہیں۔''

غور فرمائیے یہ کیسا خوب صورت یقین اور کتنا دلکش عقیدہ ہے، اسی لیے میں نے کہا

ہے کہ تصوّف مذہب کا شیریں نغمہ ہے، یہ کُل باطنی تجربے کی دلکش موسیقی ہے، مولانا کا جمالیاتی انبساط غیر معمولی نوعیت کا ہے، مولانا رومیؒ نے کہا ہے کہ اللہ نے مجھے 'شرابِ عشق' سے خلق کیا ہے، میں خود وہ عشق ہوں، موت مجھے گرد نہیں بنا سکتی، اگر تم اندر جھانک کر دیکھو گے تو تمہاری روح کے گلستاں میں ایک میخانہ نظر آئے گا۔ تصوّف کی شیریں لذیذ شراب جو نشہ طاری کرتی ہے اس سے میں شمس تبریز کی روح کے بلند مینار کے گرد چکّر لگاتے ہوئے بہت دور نکل جاتا ہوں، میری روح ایک لمحے کو نہیں رُکتی بس اڑتی ہی رہتی ہے، پرواز ہی کرتی رہتی ہے لہٰذا میری قبر یہ چاہے گی تم سب یہاں خوب رقص کرو تیز تیز اور ہر جانب نغمے اُچھالتے رہو۔

□□

شکیل الرحمن

دکن کی مصوّری اور خطاطی

دکنی مصوری کے جونمونے حاصل ہیں وہ بہت قیمتی ہیں، ان سے دکن میں مصوری کی روایت کے تسلسل کی بھی پہچان ہوتی ہے اور بدلتے ہوئے رجحانات اور تجربات کی بھی، بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈہ اور بیدر کے جوفنی نمونے سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں موجود ہیں اُن سے ہند اسلامی فن کی قدر و قیمت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، ان تصویروں سے سلطنتوں کے اسالیب کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، افسوس ہے کہ وجے نگر کے دور کی تصویریں موجود نہیں ورنہ پتہ چلتا کہ ان کے اسلوب نے احمد نگر، گولکنڈہ، بیجاپور اور بیدر کے آرٹ کو کن سطحوں پر متاثر کیا ہے، وجے نگر کے دیواری نقوش سے کسی حد تک اسلوب کو سمجھا جا سکتا ہے اور اس کی روشنی میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس اسلوب نے دکنی مصوری کی علاقائی صورتوں کو کہاں اور کس حد تک متاثر کیا ہے۔

۱۳۴۷ء میں جو بہمنی حکومت قائم ہوئی وہ ۱۵۶۵ء میں پانچ سلطنتوں میں تقسیم ہوگئی، درمیان میں بیدر، شمال میں برار، شمال مغرب میں احمد نگر، مشرق میں گولکنڈہ اور جنوب مغرب میں بیجاپور! یہ پانچوں سلطنتیں دکنی مصوری کے مراکز بن گئیں، سولہویں اور سترہویں

صدی میں ان مراکز پر عمدہ اور خوب صورت تصویریں بنائی گئیں جن کی وجہ سے دکنی مصوری کا دبستان وجود میں آیا۔

دکنی مصوری کی جو تصویریں حاصل ہیں ان کی مندرجہ ذیل خصوصیات زیادہ متاثر کرتی ہیں:

- ڈرامائی کیفیتیں
- جذبوں کا اظہار
- نرم و نازک طریقۂ اظہار
- مبالغے کا حسن
- دلفریب رنگوں کا استعمال / پرکشش رنگ آمیزی

احمد نگر کی بہت کم تصویریں حاصل ہیں، جو ہیں وہ شکستہ حالت میں ہیں، ان تصویروں کی سب سے بڑی خصوصیت شوخ رنگوں کا فنکارانہ استعمال ہے۔ تصویر کاروں نے سنہرے پس منظر کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ پندرہویں صدی کے ایرانی فنکاروں کے اثرات نمایاں ہیں، احمد نگر اور ایران کا رشتہ قائم ہوا، ایران کی شہزادیاں یہاں آئیں تو ان کے ساتھ تبریز کے فنکار اور مصور بھی آئے کہ جنھوں نے اپنی روایت کی روشنی میں تصویریں خلق کیں۔ پندرہویں صدی کے ایرانی فن کے اثرات موجود ہیں۔ ترکمانی فکر و نظر کی روشنی ملتی ہیں۔ ان تصویروں کی دو بڑی خصوصیتیں توجہ طلب بن جاتی ہیں۔ ایک ہندوستان کی انسان دوستی جگہ جگہ جھلکتی ہے اور پھر انسان کے جسم کے آہنگ کا احساس، یہ دونوں دکنی مصوری کی امتیازی خصوصیات بن جاتی ہیں۔

سولہویں صدی کے اواخر میں احمد نگر کے تین سلطانوں نے فن مصوری کی سرپرستی کی۔ حسین نظام شاہ اول (۶۵-۱۵۵۴ء) مرتضٰی اول (۸۸-۱۵۶۵ء) اور برہان دوم (۹۵-۱۵۹۱ء) سیاسی استحکام کی وجہ سے مصوری کا فن پروان چڑھا۔

احمد نگر کی سب سے قدیم تصویروں میں ''تعریف حسین شاہی'' کا نسخہ ہے جو اس وقت بھارت اتہاس منڈل، پونا میں محفوظ ہے۔ اس میں بارہ تصویریں ہیں جن میں تاریخی نقوش ملتے ہیں۔ اسے بلاشبہ احمد نگر کا ایک بڑا کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ حسین نظام شاہ کی بیوہ خانزادہ ہمایوں نے تصویریں بنوائیں۔ کام مکمل نہ ہوسکا، صرف چودہ تصویریں تیار

ہوسکیں کہ جن میں بارہ موجود ہیں، ان تصویروں میں درباروں کے مناظر اور جنگ کے واقعات اہمیت رکھتے ہیں۔ تصویروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دیواری تصویروں کی جو روایت وجے نگر میں موجود تھی فنکار اس سے یقیناً متاثر تھے، عورتوں کے پیکروں کو نقش کرتے ہوئے وہ جین اور ہندو مصوری سے متاثر نظر آتے ہیں۔ تیز اور شوخ رنگوں کا استعمال بھی ہے اور ساتھ ہی بعض تصویروں میں سادگی کا حسن بھی جھلکتا ہے۔ سبز، زرد، نارنجی، گلابی اور نیلے رنگوں کا استعمال زیادہ ملتا ہے، (ہنڈولا راگ، احمد نگر کا ایک عمدہ کارنامہ تصور کیا جاتا ہے جو دہلی کے نیشنل میوزیم میں ہے) 'تعریف حسین شاہی' میں حسین نظام شاہ اول اور خانزادہ ہمایوں کی خوبیوں کا ذکر ہے، اس میں وجے نگر کی فوج کی شکست کا تو ذکر ہے سلطان کے انتقال کا ذکر نہیں ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ یہ کتاب ۱۵۶۵ء میں مکمل ہوئی۔ درباری ماحول کو پانچ تصویروں میں۔ انتہائی فنکارانہ طور پر پیش کیا گیا ہے اور وجے نگر کے خلاف جنگ کو چھ تصویروں میں ایک انتہائی انوکھی تصویر ہے (29a) کہ جس کا موضوع انتہائی پراسرار ہے۔ ایک خوب صورت نوجوان لڑکی درخت کو چھودیتی ہے تو اس درخت پر پھول لد جاتے ہیں!

بیجاپور اور گولکنڈہ میں زیادہ تصویریں بنی ہیں، مزاج اور اسلوب کے پیش نظر ان سلطنتوں کی تصویریں مغل آرٹ سے کچھ الگ نظر آتی ہیں، ہندوستانی اسالیب کی روایات کے اثرات گہرے ہیں، دکنی سلطانوں نے ترکی سے تعلقات قائم کر رکھے یہی وجہ ہے کہ تصویروں پر ترکی اثرات بھی ملتے ہیں، گولکنڈہ اور بیجاپور کے سلطانوں نے چونکہ موسیقی سے گہری دلچسپی لی تھی اس لیے راگ راگنیوں کی تصویریں بھی بنائی گئیں اور کئی راگ مالائیں تیار ہوئیں۔ بیجاپور کے شاہ عادل ابراہیم دوم (۱۵۸۰ء۔۱۶۲۶ء) کی ایک معروف شبیہ میں ایک آلۂ موسیقی بھی موجود ہے۔ ابراہیم دوم موسیقی کا عاشق اور رسیا تھا، اس نے خود جانے کتنے بول بنائے تھے، شبیہ سازی میں بیجاپور کے فنکار دوسرے فنکاروں سے آگے تھے، لباس کی تصویر کشی میں انتہائی محتاط اور کپڑوں کی باریکی پر گہری نظر رکھنے والے تھے، پس منظر میں پودوں اور پھولوں کی پیش کش ضروری جانتے تھے، اس سے

کمپوزیشن میں کشش پیدا ہو جاتی تھی، بعض ماہرین کا خیال ہے کہ بیجاپور کے فن پر اُس راجپوت مصوری کا اثر ملتا ہے جو بیکانیر میں مقبول تھی، گولکنڈہ کی زیادہ تر تصویریں سلطان قلی قطب شاہ کے دور میں بنی ہیں، ہزاروں قیمتی تصویریں ضائع ہو چکی ہیں، جو محفوظ ہیں وہ ایک منفرد اسلوب کی نمائندگی کرتی ہیں۔

کہا جاتا ہے بیجاپور کے پہلے سلطان یوسف عادل شاہ (۱۴۹۰۔۱۵۱۰ء) نے ترکی اور ایران سے علماء شعرا اور مصوروں کو بلایا تھا اور اس کا لڑکا اسماعیل عادل شاہ خود ایک ایک مصور تھا، اس طرح بیجاپور میں ایک فضا بن گئی تھی کہ جہاں عمدہ تصویریں بھی بن رہی تھیں۔ اس سلسلے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے اس لیے کہ اس دور کی تصویریں موجود نہیں ہیں۔ بیجاپور کا ایک شاہکار 'نجوم العلوم' ہے کہ جس کی تصویریں ابراہیم عادل شاہ دوم (۱۵۸۰ء۔۱۶۲۷ء) کے دور میں تیار ہوئی تھیں۔ 'نعمت نامہ' جو اس وقت نیشنل میوزیم نئی دہلی میں ہے اسی عہد کا مخطوطہ ہے کہ جسے مصور کیا گیا تھا، اس میں صرف دو تصویریں ہیں جن میں ایک ابراہیم عادل شاہ کی ہے۔

دکنی مصوری کا ایک حاوی رجحان شبیہ سازی کا رہا ہے، سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں بہت سے 'پوتریت' موجود ہیں، ان میں ابراہیم عادل شاہ اور ایرج خان، کی شبیہیں فنی اعتبار سے بہت عمدہ ہیں۔

'ہاتھیوں کی لڑائی' غالباً سترہویں صدی کی تصویر ہے جو عمدہ فنکاری کا نمونہ ہے، سالار جنگ میوزیم میں یہ تصویر اپنے عہد کی سب سے بہتر نمایندگی کر رہی ہے، سبحان علی نام کے ایک مصور نے نقش کیا ہے جو حقیقت پسندی کا عمدہ نمونہ ہے، ہاتھیوں کے تحرک اور مہاوتوں کے تاثرات نے تصویر کو زندگی بخش دی ہے۔

گولکنڈہ کی ابتدائی تصویروں میں ''دیوانِ حافظ'' کی تصویروں کا ذکر کرنا ضروری ہے، ''دیوانِ حافظ'' کا یہ نسخہ برٹش میوزیم میں ہے، اس میں صرف پانچ تصویریں ہیں جن کا تعلق کتاب سے نہیں ہے، قلعے اور دربار کے نقش میں، نوجوان سلطان تخت پر ملتا ہے، لمبی سیدھی تلوار جو دکن کی علامت رہی ہے سلطان کے ہاتھ میں ہے، گولکنڈہ کے دربار کے

لباس کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، رقص کرتی لڑکیاں اس دور کی پیشہ ور رقاصاؤں جیسی ہیں، تیز شوخ رنگوں کا استعمال ہے، سنہرے رنگ کا فنکارانہ استعمال ملتا ہے، صفوی دبستان کی خصوصیات ملتی ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ (۱۶۱۱۔۱۶۲۶ء) کی تصویروں اور شبیہوں میں سلطانوں کے مخصوص لباس کی جانب خاص توجہ ہے، "دیوان قلی قطب شاہ" کی تصویروں پر ایک جانب دبستانِ بخارا کا اثر ہے تو دوسری جانب ہندوستانی فن کا! عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں (۱۶۲۶۔۱۶۷۲ء) مصور رنگوں کے معاملے میں زیادہ بیدار نظر آتے ہیں، انتہائی پرکشش رنگ استعمال کئے گئے ہیں، منظر نگاری کو اہمیت دی گئی ہے اور مناظر کی پیش کش میں رنگوں کو زیادہ جاذبِ نظر بنایا گیا ہے، اس زمانے میں بڑے بڑے کپڑوں پر بھی عمدہ تصویریں بنائی گئی ہیں۔

'چسٹر بیتی لائبریری' (CHESTER BEATHY LIBRARY) میں 'یوگنی' کی تصویر بہترین تصویروں میں شمار ہوتی ہے، کہا جاتا ہے یہ ملکہ سبا ہے، حضرت سلیمان کو پیغام بھیجنے کے لیے ایک پرندے سے گفتگو کر رہی ہے، بری منظر بھی خوب صورت ہے۔

بیدر کے فن کے عمدہ نمونے (آخر سولہویں صدی یا ابتدائی سترہویں صدی) 'بھوگ بال' کے مخطوطے میں ملتے ہیں، کل ۴۶ر تصویریں ہیں جو سالار جنگ میوزیم میں موجود ہیں، موضوع سے گہرا تعلق رکھتے ہوئے جنسی زندگی اور جنسی عوامل کو پیش کرتی ہیں۔ ۴۶ میں ۲۷ر تصویروں کا موضوع عشق، پیار اور جنس ہے۔

'بھوگ بال' قدیم دکنی اردو میں ہے، یہ 'کوک شاستر' کا ترجمہ ہے، عورت اور مرد کے اقسام مباشرت، جنسی امراض اور طریقۂ علاج وغیرہ اس کے موضوعات ہیں، کسی قریشی بدری نے سلطانِ وقت کے لیے مرتب کیا تھا، رنگوں کا استعمال فنکارانہ ہے، جسم، ساڑی، تہبند، چولی، گال وغیرہ کے رنگوں کی جانب خاص توجہ ہے 'آسن' وغیرہ کی کمپوزیشن بھی عمدہ ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے دواوین کی تصویریں، بھوگ بال

کے نقش، کلیاتِ سعدی اور کلیاتِ شیرازی کی تصویریں اور کئی شبیہیں اور پوٹریٹ دکنی مصوری کی انفرادی خصوصیتوں کے تئیں بیدار کرتے ہیں۔

نوٹ:

دکن کی مصوری اور خطاطی کے نمونے جن سے متاثر ہو کر شکیل صاحب نے اپنا مقالہ 'دکنی مصوری' کی تخلیقات مرتب کیا ہے۔ اب ہندوستان اور بیرون کی چیدہ چیدہ آرٹ گیلریوں اور میوزیموں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

حیدر آباد کے سالار جنگ میوزیم کے علاوہ اس عظیم مصوری کے چند اہم شاہکار پراگ، بمبئی اور پونا (ہندوستان میں) اور آکسفورڈ، پیرس، برلن، ڈبلن، لینن گراڈ، استنبول و نیویارک (بیرون میں) میں محفوظ ہیں۔

—— ایڈیٹر تناظر

□□

قرآن کا اثر اردو کی حمدیہ شاعری پر

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

حاصل واصل بر حصول و اصول   محرم سرِّ سائل مسئول

داور دورِ کرہ، دوّار   مالک الملک عالم الاسرار

فانی کے یہ حمدیہ اشعار محض اس لئے اہمیت کے حامل ہیں کہ ان میں غیر منقوطہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں شعری حسن و جمال سے یہ یکسر عاری ہیں۔

آزادیِ ہند سے قبل ایک عشرہ اور بعد کے ایک دہے میں کچھ ایسے اردو شعرا اردو کو ملے ہیں جن کا غالب رجحان مذہبی رہا ہے۔ ان میں سید عاشق حسین سیماب اکبرآبادی اور مولانا ظفر علی خاں معروف ہیں۔ سید فضل الحسن حسرت موہانی کو غزل سے انسیت اور سیاست سے لگاؤ ہونے کی وجہ سے ان کی اکثر غزلوں میں قومی جذبات ہی کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دانستہ طور ہی پر کیوں نہ ہو انھوں نے "مذہب" کو اپنی شاعری میں نہیں برتا۔

سیماب کے یہاں البتہ مذہبی عناصر ملتے ہیں۔ انھوں نے قرآن مجید کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ جو پاکستان سے غالبا شائع ہوچکا ہے۔ "کلیم عجم" اور "کارامروز" میں بھی حمدیہ اشعار مل جاتے ہیں۔ ان کے یہاں اشعار میں اسالیب کا اختراع اور تنوع پایا جاتا ہے ان کی شعری فکری صلاحیت غزل سے زیادہ نظم میں ابھرتی ہے۔

رہے مولانا ظفر علی خاں (م ۱۳۷۶ھ ۱۹۵۶ء) تو ان کی شاعری اسلامیات سے کشید کئے

" کاشانہ" پوسٹ آفس کال گاؤں، ایوت محل 445203

ہوئے عطرو رنگ و بو کا گویا مجموعہ ہے ۔ اللہ تعالی کی حمد سرائی میں محو ہوجاتے ہیں تو قرآنی آیات ان کی اپنی مادری زبان میں ڈھل کر نظم کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

میں سورہ الصفا کی آیت " **یریدون لیطفئو النور اللہ بافواھہم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکفرون** " کی روح گویا سمودی گئی ہے ۔ دوسری آیتِ کریمہ " **ان اللہ لایغیر** ۔۔۔ الخ " کا یہ منظوم ترجمہ بھی ملاحظہ کیجئے ۔

خدانے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

دور جدید میں کچھ ایسے شعراء بھی گزرے ہیں جنھوں نے شاعری کی قدیم روایات کی پاسداری کی اور اپنی شاعری کو مذہب کے لئے مختص کرلیا ۔ سعدیِ دکن سید احمد حسین امجد حیدرآبادی کی شاعری اسی زمرے میں آتی ہے ۔ یہ اپنی رباعیات کی وجہ سے اردو ادب میں کافی مشہور و مقبول ہیں ۔ ان کی رباعیات کا بیشتر موضوع قرآنی آیات اور احادیثِ نبوی سے اخذ کیا ہوا ہے ۔ سلوک و معرفت کے اسرار و غوامض اور تصوف کے ادق مسائل کی عقدہ کشائی انھوں نے اپنی شاعری میں نہایت فنی چابکدستی سے کی ہے اسی لئے اربابِ نظر انھیں عصر حاضر کا "سعدی" کہتے ہیں ۔ ان کی رباعیات (حمدیہ) کے چند قرآنی موضوعات یہ ہیں ۔ " **ھوالباقی** "، " **لاحول ولا قوۃ الا باللہ** "، " **شھد اللہ انہ لاالہ الا ھو** " وغیرہ ۔ ایک رباعی " **الست بربکم** " کی توضیح امجد نے اس طرح کی ہے ۔

مجھ میں چھپی ہوئی کوئی شئے تیری — نغموں میں مرے ضرور ہے لے تیری
صورت سے تو آشنا نہیں ہیں آنکھیں — آواز کہیں سنی ہوئی ہے تیری

(امجد : رباعیات امجد حصہ دوم : حیدرآباد طبع سوم ص ٦)

اس رباعی کے تیسرے مصرع میں " **لاتدرک الابصار** " کو کتنے **خوب صورت معنی** میں پیش کیا گیا ہے ۔ امجد کی یہ رباعیات ان کی قادرالکلامی اور فن کی پختگی کا نمونہ ہیں ، جن میں طر

یقت و عرفان کے موضوعات بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ کلاسکی شاعری میں امجد کی رباعیات بہترین اضافہ ہے ۔ ان رباعیات میں حقائق و اسرار حیات کی توضیح و تشریح قرآن و احادیث کی روشنی میں کی گئی ہے ۔ یہ رباعیات سلیس و عام فہم ہونے کے علاوہ وجد آفریں بھی ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف اول کے اختتام تک اردو شاعری مختلف تجربات سے گزری مختلف تحریکات کا سامنا کرتی رہی ۔ یہاں پہنچ کر " غزل " ایک پامال صنف سخن سمجھی جارہی تھی ۔ لیکن علی سکندر جگر مرادآبادی (م ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۰ء) پھر بھی تغزل کی محفل سجائے ہوئے بیٹھے تھے ۔ ان کی شاعری کی شاہراہ میخانے سے ہوکر ساقیِ کوثر کی بزم تک پہنچتی ہے ۔ اس راہ میں ہمیں بتخانہ بھی ملتا ہے اور بیت اللہ بھی ۔ وہاں عالمِ ناسوت بھی ہے اور عالم لاہوت بھی ۔ وہاں کیف و سرور کے سامان بھی ہیں اور لطفِ سرشاری بھی ۔ ان کی شاعری میں درس بیداری بھی ہے اور خودفراموشی بھی ۔ انھوں نے داغ کے چٹخاروں میں فانی کی یاسیت او راصغر کی طریقت کو ملا کر اپنی شاعری میں رنگ بھرے ہیں جس کی وجہ سے ان کی شاعری خشک و یابس نہ رہ کر خوشگوار اور رنگین بن گئی ہے ۔ ان کی شاعری میں وصال کے مزے سے زیادہ ہجر کا کیف ملتا ہے اور یہی کیف و سرور حقیقی عشق سے روشناس کراتا ہے ۔

شاعری کے متعلق جگر کا اپنا نظریہ تھا کہ " جو شاعری خالق فطرت سے بیگانہ رہے اس میں کبھی حسن پیدا نہیں ہوسکتا ۔ ۔ ۔ ۔ جس نے ذرے ذرے کو جمال بخشا ہے اور جس نے کلیوں کو چٹک دی ہے اور تاروں و چمک دی ۔ اس کے وجود کے احساس ہی سے شاعری میں جمال پیدا ہوتا ہے ۔ اس کے بغیر شاعری کچھ بھی نہیں ۔ " (بحوالہ معارف : اعظم گڑھ جولائی ۱۹۸۱ء، ص ۱۲) اسی وجود حقیقی کا احساس ان کے حمدیہ اشعار میں جا بجا نظر آتا ہے ۔

" تجھ سے میں دور کسی وقت نہیں ہوں غافل "

دل میں بیٹھا ہوا کوئی یہ صدا دیتا ہے (۶۵)

اللہ اللہ ! سنتے ہو تم رگ جاں سے قریب

اب تو ہر نشتر کو پیوستِ رگ جاں کیجئے

مندرجہ بالا دونوں اشعار میں " **نحن اقرب الیہ من حبل الورید** " کی توضیح کتنی خوب

صورت اور کس قدر بہتر شاعرانہ انداز میں کی گئی ہے ۔ حق تو یہ ہے کہ جگر نے اپنے " بلبل عنقا نگاہ تصور " اور " طائر جبریل " فکر تخیل سے شاعری کا وہ دلنواز پیکر تراشا ہے جس میں رعنائی خیال بھی ہے اور شان بے تابیِ جمال بھی ہے ۔ وہ ایک " حسن شعلہ خو کی تصویر بھی ہے " اور " بے کسان فرقت کی گفتگو بھی " وہ ایک " عرضِ تمنا " بھی اور " خونِ تمنا " بھی ۔ وہ " ساز لن ترانی " کی آواز بھی ہے اور حسن و نغمہ ، جوانی بھی ۔ وہ سراپا حقیقت بھی ہے اور مجسم فسانہ بھی ۔ " وہ بیان عشق و مستی بھی ہے اور " حدیث دلبرانہ بھی ۔ ان کی شاعری جگر کی کاوشوں کا ثمرہ ہے جو جگر کا خون کرنے سے حاصل ہوئی ۔

جگر کے معاصرین میں صفی اورنگ آبادی کے یاں مجذوبانہ رنگِ شاعری ملتی ہے ۔ اپنی ایک مناجات میں وہ خدا کو یوں مخاطب کرتے ہیں ؎

تیرا یہ حکم ، مانگ ہر ایک چیز مجھ سے مانگ

میری دعا ، کہ دے مرے پروردگار دے (۶۶)

قرآن حکیم میں بار بار تاکید آئی ہے کہ تم مجھ سے مانگو میں تمھاری حاجتیں پوری کروں گا ۔ مثلاً سورہ الاعراف میں وارد ہے " ادعو ربکم تضرعا " یعنی اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے ۔ دسری جگہ ارشاد باری تعالی ہے ۔ " ادعونی استجب لکم " (سورہ المومن) اللہ کے رسول محمد عربی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وصلعم نے بھی دعاء کی اسی اہمت کی مد نظر رکھتے ہوئے فرمایا تھا کہ تم میں سے ہر شخص کو اپنی حاجت خدا سے مانگنی چاہیے حتی کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے ۔ بہر حال صفی کے یہاں نص قطعی اور حدیث نبوی کا شاندار سنگم ملتا ہے ۔

شاعر انقلاب شبیر حسین خاں جوش ملیح آبادی (م ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء) اپنی حریت پسندی کی وجہ سے اگرچہ مذہب بیزار سے ہوگئے تھے لیکن پاکستان پہنچ کر ان میں کافی تبدیلی آگئی تھی اور اسی تبدیلی نے انھیں " سورہ الرحمن " کا منظوم ترجمہ کروایا ۔ ایک تو سورہ رحمن خود ہی قرآن حکیم میں اللہ کی زبردست حمد ہے انھوں نے اردو زبان میں پیش کرکے اپنی عقیدت کو جلا بخشی ۔ جوش شروع میں اشتراکی نظریہ کے حامی تھے لیکن خدا کے منکر نہیں تھے ان کے دل میں اللہ کی

بے انتہا عقیدت و محبت تھی ۔ جو ان کے اس منظوم آزاد ترجمہ سے ظاہر ہوتی ہے ؎

یہ سحر کا حسن، یہ سیارگاں اور یہ فضا   یہ معطر باغ، یہ سبزہ، یہ کلیاں دلربا
یہ بیاباں، یہ کھلے میدان یہ ٹھنڈی ہوا   سوچ تو کیا کیا، کیا تجھ کو قدرت نے عطا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا   (۶۷)

جس طرح سورہ رحمٰن میں " فبانی الاء ربکما تکذبان " کی متواتر تکرار سے ایک طرح نغمگی پیدا ہوگئی ہے جوش کے اس منظو ترجمہ میں بھی " کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا " کی تکرار سے خوش آہنگی پیدا ہوجاتی ہے ۔

حالیہ دور میں حفیظ جالندھری اور فضا ابن فیضی کی شاعری کا زمانہ " نگار " کے دور کو چھوتا ہے ۔ حفیظ جالندھری نے نیاز فتح پوری کے " نگار " سے لے کر اپنی موت (م ۱۴۰۱ھ / ۱۹۸۱ء) تک ایک طرف تو عظمت اللہ خاں کے بحور و قوافی میں کئے گئے تجربات کو اپنایا تو دوسری طرف اقبال کے تفکر اسلامیہ کو قبول کیا ۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں کیف و روانی اور غنائیت و لطافت بھی آگئی اور اسلامی افکار و اقدار کی آمیزش بھی ہوگئی ۔ ان کے یہاں خدا کی محبت کا سرچشمہ عقیدت و ایمان کی قلبی جھیلوں سے پھوٹتا ہے ، جس میں روحانیت کے سوتے بھی آکر ملتے ہیں اور عقل و فکر کی موجیں بھی اٹھتی ہیں ۔ ان کا " خامہ ، انوار فشاں " حمد کے نورانی موتی اس طرح بکھیرتا ہے ؎

کس کے دربار میں مصروف عقیدت ہوں میں
سربسر غوطہ زنِ بحر محبت ہوں میں
کس کے پرتو سے پُر انوار ہے چہرہ میرا
کہ تماشائی ہے ہر دیدہ بینا میرا
خامہ انوار فشاں مدح شہنشاہ میں ہے
برق ایمن کا اثر ایک پُر کاہ میں ہے

رہے فضا ابن فیضی ، تو جس طرح ماہنامہ " نگار " میں انھیں شرف قبولیت ملی تھی ویسی ہی آج بھی وہ اپنی شاعری کی وجہ سے مقبول ہیں ۔ " جدید " اور " جدیدیت " کے فلک

شگاف نعروں کی گونج میں بھی انھوں نے روایت پسندی اور قدامتی اقدار کی لے کو مدھم نہیں ہونے دیا۔ اسالیب میں جدت اور تراکیب لفظی میں ندرت نے ان کی شاعری کو بڑی ہی موثر بنادیا ہے۔ "مفرس" اور "معرب" الفاظ کے استعمال میں وہ بہت محتاط رہتے ہیں تاکہ شعری نزاکت متاثر نہ ہوجائے۔ وہ دور از کار استعارات اور بوجھل ابہام سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ "سر شاخ طوبیٰ" ان کی کہی گئی نعتوں کا مجموعہ ہے۔ "خوشہء سبز" کے عنوان سے اس کتاب میں جو باب ہے اس میں حمد و مناجات ہیں۔ جو حمدیں اس باب میں درج ہیں ان کے عنوانات سارے کے سارے قرانِ حکیم سے ماخوذ ہیں۔ جیسے پہلی حمد کا عنوان **"هو الله احد"** دوسری کا **"فلا تدعوا مع الله احدا"** اسی طرح **"هوالظاہر والباطن"**، **"خالق کل شی ء"**، **"نوره کمشکواة"**، **"له اسماء الحسنیٰ"**، **له مقالیں السموات والارض"**۔ **"لا تدرکه الابصار"** وغیرہ۔

"نوره کمشکواة" کے ذیل میں فضا خدا کی شایوں بیان کرتے ہیں۔

نظر شگفتہ ، دل آسودہ ، جان روشن ہے
ترے چراغ سے ، سارا مکان روشن ہے (صفحہ ۳۲)

"لا تدرکه الابصار" کی توضیح وہ اس طرح کرتے ہیں۔

جلوہ بیرنگ ، تماشا جاری پھر بھی نادیدہ ہے پیکر اس کا (صفحہ ۴۱)

غرض کہ پاکیزگی جذبات الفاظ کا حسن اور بحور کی نغمگی ان کے کلام کا خاصہ ہے اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔

دور جدید کے بعض ترقی پسند جدیدیت کے ہمنوا شعراء اپنی انتہا پسندی اور جارحانہ طرز فکر سے جامے سے باہر نکل کر کفر و الحاد اور شرک و انکار تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہیں ان کے دل کے کسی گوشے میں ایمان و اقرار کی چنگاری بھی چٹک جاتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی (ولادت ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۶ء) جب "اے جبر مشیت ترا قانون کہاں ہے" کہہ کر خدا کو للکارتے ہیں تب ایمان کی چنگاری بھڑک کر ان کے دل میں "تذبذب" پیدا کردیتی ہے اور پھر وہ کہہ اٹھتے ہیں:

اگر نجوم میں تو ہے تو چاند میں ہے کون — ترے جمال کی تقسیم ہو نہیں سکتی
ازل، ابد کا تصور فقط تصور ہے — ترے وجود کی تقویم ہو نہیں سکتی
جو قوتیں ہوں تری منتشر تو سچ کہہ دوں — کہ اس جہان کی تنظیم ہو نہیں سکتی

آخری شعر میں قرآن مجید کی آیت " ماکان معه من اله " (المومنون) کے مفہوم کو کتنے خوبصورت انداز میں منظوم کردیا گیا ہے ۔

جدیدیت کے علمبرداروں ن ۔ م ۔ راشد ، میراجی وغیرہ کے یہاں خدا کا تصور بڑا دھندلا ہے رہے جدید شعراء تو ان میں احسان دانش ، عمیق حنفی ، حامد اللہ افسر میرٹھی ، منیر نیازی ، مجید امجد ، غلام ربانی تاباں وغیرہ نے مذہب کی طرف نظر التفات کی ہے ۔ ان کے علاوہ ماہر القادری ، نعیم صدیقی ، سید احمد عروج ، حافظ رام نگری ، حفیظ کیانی وغیرہ نے خالصتا مذہبی نوعیت کا ادب تخلیق کیا ہے ۔ یہاں مختصرا ان کے کلام کا جائزہ لیا جارہا ہے ۔

احسان دانش (م ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء) کے یہاں تصور الہ کا نمونہ دیکھئے ؎

خدا وہ ہے کہ جس کی ، عظمت و جبروت کے آگے
خود انسان سجدہ کرنے کے لئے مجبور ہوجائے

عمیق حنفی خدا کے آگے اپنی سرکشی کا سر ڈال دیتے ہیں ۔ " صلصلة الجرس " میں وہ خدا کی حمد و ثنا کچھ اس انداز سے کرتے ہیں :

" اک خدا ہے دوسرا کوئی نہیں " — آپ اپنا نام اپنی ذات اپنی کائنات
وہ سدا بیدار جاری اور ساری — وہ عمل روح عمل سمتوں پہ بھی طاری

سوچئے تو دور حد منطق و ادراک سے
کیجئے محسوس تو وہ ہے رگ جاں کے قریب (۶۸ الف)

اس پورے بند میں قرآن حکیم کی کئی آیات کو منظوم کردیا گیا ہے ۔ پہلے دو ٹکڑوں میں " احد " و صمد " کی توضیح ہوئی ہے دوسرے دونوں مصارع میں " آیتہ الکرسی " کی ابتدائی آیات کی تفسیر ہے اور آخری مصارع میں " لا علم لنا " اور " نحن اقرب " کے مفہوم کو پیش کردیا گیا ہے ۔ اس طرح بالکل ہی نئے اور موثر انداز میں شاعر نے خدا کی

توصیف کی ہے۔

افسر میرٹھی کی شاعری میں حفیظ جالندھری کا رنگ نمایاں ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی کی طرح انھوں نے بچوں کے ادب پر خاصی توجہ دی ہے۔ اللہ کا تصور بچوں کا دلوں میں بٹھانے کے لئے انھوں نے مترنم بحور میں بہت سی حمدیں لکھی ہیں۔ جنھیں پڑھ کر قوم کے نونہالوں کے پاکیزہ دل امنگوں سے بھر جاتے ہیں۔

منیر نیازی خدا کی حمد و ثناء بڑے اخلاص و عقیدت سے کرتے ہیں۔ جذبۂ ایمانی جب ان کے دل کو گرما دیتا ہے تو وہ کہہ اٹھتے ہیں۔

اسی کا حکم جاری ہے زمینوں آسمانوں میں
اور ان کے درمیان جو ہیں مکینوں اور مکانوں میں
ہوا چلتی ہے باغوں میں تو اس کی یاد آتی ہے
ستارے چاند، سورج ہیں سبھی اس کے نشانوں میں (۶۹)

منیر کے حمدیہ اشعار کو پڑھ کر کیا سورہ البقرہ کی یہ آیات زبان پر نہیں آتیں ؟ " **لله ما فی السموت و ما فی الارض و ان تبدو ما فی انفسکم او تخفو و یحاسیکم به** "۔۔

" **والله علی کل شیء قدیر** " (سورہ "البقرہ")

ایک اور پاکستانی شاعر مجید امجد نے اپنے مجموعۂ کلام "شب رفتہ" میں خدا کے متعلق ایک ایسا تصور پیش کیا ہے۔ جس کے پڑھنے سے معاشرے میں پھیلی ہوئی تفرقہ پسندی اور اونچ نیچ کی گہری خلیج کی کریہہ صورت سامنے آجاتی ہے۔ وہ "اچھوت ماں" کی زبانی کہلواتے ہیں:

خبر ہے کچھ تجھ کو رلاؤ! مرے ننھے مرے بالک
ترا بھگوان پر میشر ہے! اس سنسار کا پالک
کہا رہتا ہے پرمیشر اس آکاش کے پیچھے
کہیں دور اس طرف۔ تاروں کی بکھری تاش کے پیچھے
نہیں سمجھے کہ اتنا دور کیوں اس کا بسیرا ہے
وہ اونچی ذات والا ہے اور اونچا اس کا ڈیرا ہے (۷۰)

ماہر القادری کا شمار ایسے شعرا، میں کیا جاتا ہے ، جنھوں نے اسلامی نظریات اور اخلاقی اقدار جیسے موضوعات لے کر اپنی شاعری کو مزین کیا۔ ان کے یہاں ایمان و یقین کا سوز و ساز لطافت فکر و خیال، پاکیزگی جذبات اور بصیرت، افروز کیف و سرور کی وہ فراوانی ہے کہ قاری پڑھتا ہے اور وجد کرنے لگتا ہے۔ اقبال کی طرز میں لکھے ہوئے یہ حمدیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

دعائے شام و سحر لا الہ الا اللہ　　یہی ہے زاد سفر لا الہ الا اللہ
سکون قلب و جگر لا الہ الا اللہ　　کمال فکر و نظر لا الہ الا اللہ　(۱)

ان شعرا، کے علاوہ ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض اور حلقہ، احباب کے گل سرسید اور جدیدیت کے موئد عبدالعزیز خالد ایسے دبنگ نام ہیں جن پر جدید اردو شاعری فخر کرتی رہے گی۔ ان میں آخر الذکر کے یہاں نہ صرف اسلامی عناصر کی بہتات ہے بلکہ یہودی و نصرانی اور یونانی و ایرانی اساطیر کو بھی برتا گیا ہے۔ "**فارقلیط**"، "**ملتحمنا**"، "**زنجیر رم آہو**" وغیرہ ان کے شعری مجموعے ہیں۔ اولین دونوں میں تو نعتیہ کلام ہے لیکن "**زنجیر رم آہو**" دینیات سے معریٰ ہے۔ خالد نے معرب و مفرس تراکیب لفظی سے اپنے اشعار کو بوجھل بنادیا ہے۔ طرفہ یہ کہ یونانی اساطیر اور یہودی و نصرانی روایات کے بغیر وہ آگے بڑھتے ہی نہیں۔

رہے فیض تو انھوں نے اپنی شاعری میں بالراست مذہب کو نہیں اپنایا یہی وجہ ہے کہ حمدیہ عنصر بھی ان کے یہاں اتفاقیہ طور پر ہی ملتا ہے۔ مثلاً۔

حیراں ہے جبیں آج کدھر سجدہ روا ہے
سر پر ہے خداوند، سر عرش خدا ہے　(۲)

متذکرہ شعرا، کے علاوہ دور حاضر کے صدہا شاعر اپنی کلک بے نوا سے توحید باری تعالیٰ کے نغمے بکھیر رہے ہیں۔

ف۔ س۔ اعجاز جو ایک اچھے صحافی، کامیاب شاعر اور نثر نگار و مترجم ہیں۔ انھوں نے اپنے مجموعوں کے نام رکھے ہیں "لا شریک"، "مالک یوم الدین" وغیرہ۔ "لا شریک" کی ابتداء انھوں نے ایک حمدیہ شعر سے کی ہے جو فارسی شعر کا ترجمہ ہے۔

ہر گیا ہے کہ بر زمیں روید　　　　وحدہ لاشریک لہ گوید

ف۔ س۔ اعجاز نے اسے اردو کا لباس اس طرح پہنایا ہے۔

زمیں پر اگنے والی گھاس کی ہر پتی کہتی ہے

کہ وہ اکیلا ہے، کوئی بھی اس کا شریک نہیں　(ص ۳)

" موسم بدل رہا ہے " ان کی غزلیات کا مجموعہ ہے اس کی ابتداء وہ حمد سے کرتے ہیں جس میں بڑی زبردست غنائیت ہے۔ آھنگ ولے کی بلندی اور الفاظ کے دروبست نے اس میں بلاکی روانی پیدا کردی ہے۔ کہتے ہیں:

سب تعریفیں تیری ہیں، سب حمد و ثنائیں تیری ہیں

تیری ہی بزرگی واجب ہے ہر لب پہ دعائیں تیری ہیں　(ص ۱۱)

" مالک یوم الدین " کی پہلی نظم ہی حمدیہ ہے۔ اس میں " یوم آخرت کا مالک " اللہ تعالی کی کبریائی بڑے موثر انداز میں بیان کی گئی ہے۔

رؤف خیر حیدرآباد کے جدید نوجوان شعراء کی صف میں بلند قامت دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں کے ناموں ہی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مذہبی آدمی ہیں۔ " ایلاف "، " اقراء " اور " شہداب " ان کے شعری مجموعے ہیں جن میں مشرقی اصناف شاعری بھی ہیں اور مغربی صنف سخن، ترائیلے اور سانیٹ وغیرہ۔ رؤف خیر کی شاعری میں ان کا اپنا لہجہ ہے۔ قرآنی اصطلاحات کی بجائے وہ قرآنی آیات اور احادیث و اسلامی روایات کو اشاروں کنایوں میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ تقدس بھی مجروح نہیں ہوتا اور بات کی صحیح تفہیم بھی ہوجاتی ہے۔ " شہداب " میں ان کی حمد کے تیور ملاحظہ ہوں۔

لگا حرف ہر اک سبک تر خدایا　　　کروں حمد تیری میں کیوں کر خدایا (ص ۱۱)

" ادعونی استجب لکم " کی توضیح وہ کتنے خوبصورت انداز میں کرتے ہیں:

میں حاجت مند ہوں حاجت روا تو　　　مرا مولا، مرا مشکل کشا تو

بھلا کیسے کسی سے جاکے مانگو　　　کہ تو کہتا ہے میرے پاس آتو　(ص ۱۴)

سلیم شہزاد یہ نام جدید اردو تنقید، تحقیق اور شاعری پر محیط ہے۔ ان کے قلم نے ان

تینوں میدانوں میں اپنا مقام منوایا ہے ۔ شاعری میں " دعا پر منتشر " اور " تزکیہ " ان کے مجموعہ کلام ہیں ۔ ان دونوں مجموعوں کی ابتداء انھوں نے " حمد غزلیہ " سے کی ہے ۔ یہ انوکھی ترکیب بھی انھیں کی ہے ۔ حمد و نعت کے متعلق وہ خود رقمطراز ہیں :

" حمد ، نعت اور دعا، شعری اظہار کے وہ پیرائے ہیں جن میں ذات وصفات کا ذکر کرتے ہوئے مرکوز نظر مخصوص ہوتا ہے ۔ مگر اس تخصیص میں جو وسعت ، گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے اس کے آگے جدا جدا ہر ذات اور اس کی ہر صفت کی توسیع مبالغ کے بعد بھی ہیچ نظر آتی ہے ۔ " (تزکیہ ص ٦)

شہزاد نے حمدیہ اشعار میں بعض جگہ قرآنی اصطلاحات کو بھی برتا ہے ۔ مثلا وہ فرماتے ہیں :

انا زینا کی تفسیروں میں
آسمانوں کو ستاروں سے (زمینوں کو چراغوں سے) سجائے اللہ
برق ، قندیل ، شرر ، چشم ، گہر ، اشک ، ستارہ جگنو
سارے الفاظ یہ روشن ہوں اگر ان میں کوئی موجہ ، انوار بہائے اللہ
قم باذنی و انا ربکم الاعلی و اقرا کی جلاکر شمعیں
کبھی صیون ، کبھی طور و حرا میں نظر آئے اللہ ۔ (تزکیہ ص ٨ ۔ ٩)

اب آخر میں علاقہ ، وودربھ (جس میں قدیم علاقہ ، برار ضم ہوگیا ہے) کے جدید شعراء کا ذکر ہوگا جن کے کلام اور شاعری نے اردو ادب میں ایک اہم مقام حاصل کیا ۔ ان شعراء میں بزرگ شاعر غنی اعجاز اپنی منفرد آواز رکھتے ہیں ۔ شاعری کی قدیم روایات کی وہ آج بھی پاسداری کرتے نظر آتے ہیں ۔ مختصر لیکن مترنم بحور کے چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں اپنے خیالات کو سمیٹنا انھیں خوب آتا ہے ۔ بھرتی کے اشعار سے ان کی اکثر غزلیں پاک و صاف رہتی ہیں ۔ عام فہم زبان اور سیدھے سپاٹ انداز میں وہ اپنی بات اس ڈھنگ سے اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں کہ دل میں پیوست ہوجاتی ہے اور ذہن پر ایک تاثر چھوڑ جاتی ہے ۔ ان کے حمدیہ اشعار میں سیدھی

بہاؤ نہیں جھرنے کی سی روانی ہے ۔

شمس و بدر و ہلال سب تیرے — یہ جلال و جمال سب تیرے
کل بھی تیرا تھا آج بھی کل بھی — وقت کے خدوخال سب تیرے
میرا ہر شعر ہے تیرا اعجاز — یہ ہنر یہ کمال سب تیرے

("گردسفر" ص ۱۴)

پروفیسر سید یونس انگریزی ادب کے پروفیسر ہیں لیکن اردو جو ان کی مادری زبان ہے اور اس سے والہانہ انسیت رکھتے ہیں ۔ اس زبان میں ایسے شستہ شعر کہتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ آدمی " اردو والا " ہے ۔ انھوں نے قدیم شعری روایات کی پاسداری کی ہے ۔ ان کی غزلوں میں " غم جاناں " کی بہ نسبت غم دوراں " کا زیادہ آوازہ ہے حمدیہ اشعار میں کہیں کہیں قرآنی خیالات کی ترجمانی بھی ان کے یہاں ہوجاتی ہے ۔ اوپر عمیق حنفی کے جس حمدیہ شعر کو نقل کیا گیا ہے اس کی بازگشت پروفیسر یونس کے اس حمدیہ شعر میں بھی سنائی دیتی ہے :

پرے ہے گو حدِ ادراک سے مقام ترا
قریب تر زرگ جاں بھی ہے قیام ترا

(انکشاف ، ص ۵)

علاقہ ۔ برار کے ایک جدید لہجے کے شاعر حفیظ مومن اپنی شاعری میں بھی مومنانہ شان رکھتے ہیں ۔ نپے تلے الفاظ میں اپنی بات شعری پیکر میں پیش کرنے کا انھیں اللہ نے سلیقہ دیا ہے ۔ انھوں نے عصر حاضر کی پیچیدہ صورت حال میں ناآسودہ اور تلخ زندگی کے کئی گوشوں کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے ۔ حمد میں البتہ ان کا لہجہ انفس و آفاق سے پرے کسی اور دنیا کا پتہ دیتا ہے ۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں :

ترے کلام سے پہلے جہان کو سن لوں
کسی کی بات نہ بھائے گی تیری بات کے بعد

("ورق ورق لمحے" ص ۱۵)

دلدار ہاشمی پونوی نے اسی خیال کو دوسرے انداز سے باندھا ہے :

جہاں کی ساری کتابوں کو پڑھ کے دیکھ لیا
تری کتاب سے بڑھ کر کوئی کتاب نہیں

اسی علاقہ کے ڈاکٹر محبوب راہی، اقبال خلش، فصیح اللہ نقیب، انوار نشتر اور منصور اعجاز ایسے شعراء ہیں جن کے حمدیہ اشعار میں توازن و وقار ہے۔ ڈاکٹر مدحت الاختر اور ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر کا کلام تو برصغیر میں جانا پہچانا ہے۔ ان کے یہاں بھی حمدیہ عناصر مل جاتے ہیں۔ جن میں بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن کا اثر و نفوذ دکھائی دیتا ہے۔
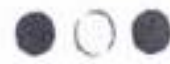
●○●

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ

آغاز سے 2000ء تک

ڈاکٹر سلیم اختر — قیمت: ۳۵۰ روپے

کلیاتِ حسرت

رئیس المتغزلین مولانا سیّد فضل الحسن حسرت موہانی

قیمت: ۳۰۰ روپے

بھگت سنگھ شہید (تین ڈرامے)

بھاگوان پوتا۔ انقلابی پُتر۔ ناستک شہید۔

ڈاکٹر چرن داس سدھو — قیمت: ۱۵۰ روپے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت

اور اُس کی علامتیں

پروفیسر ڈاکٹر فضل الہی — قیمت: ۳۵ روپے

قرۃ العین ☆ انتظار حسین ☆ عبداللہ حسین

تین ناول نگار

رضی عابدی — قیمت: ۱۰۰ روپے

اردو غزل کے موضوعات

ڈاکٹر علی احمد جلیلی

غزل ایک شعری رویہ کا نام ہے ۔ غزل کی شاعری کے لئے نہ تو کچھ مضامین محدود و مخصوص ہیں نہ ہی ممنوع لیکن کلاسیکیت اور روایت کی پاسداری نے ایک طویل عرصہ تک غزل کو ایک محدود دائرہ میں محصور رکھا ۔ میر سے مرزا تک غزل ایک ہی راستے پر گامزن رہی جس میں یکسانیت کا عنصر زیادہ تھا ۔ لیکن بعد کے تجربات بتاتے ہیں کہ صنف غزل پوری انسانی زندگی اور اسکی تبدیلیوں کو اپنے طور پر ہمیشہ قبول کرتی رہی ہے ۔

یوں تو غزل اپنے طویل سفر میں ہر دور میں اپنا چہرہ کچھ نہ کچھ بدلتی رہی لیکن سب سے پہلے ترقی پسند اثرات نے اس پر چھاپہ مارا جو کمیونسٹ روس سے درآمد ہوئے تھے ۔ مارکسی نظریات اور اسکی افادیت کے نقطہ نظر سے غزلیں لکھی جانے لگیں ۔ سماجی کشمکش کو نمایاں کرنا ضروری سمجھا گیا ۔ مارکسی پروپگنڈہ ادب کی پہچان بن گیا جسکے نظریہ میں مفلس و نادار کی پستی اور انحطاط کا سبب سرمایہ دار ہیں ۔ اس تحریک نے جابرانہ استحصال کنندوں ۔ سامراجی توسیع پسندوں کے خلاف ایک ایسا ادب تخلیق کیا جس پر مقصدیت اور افادیت کی چھاپ تھی ۔ ایسی غزلوں میں غریب اور سرمایہ دار کا ۔ مزدور پیشہ کا ۔ کھیتوں اور کسانوں کا ترقی پسندانہ لہجے میں بیاں ہے ۔ چنانچہ اس فکر شاعری میں طبقاتی کشمکش ۔ محنت کا استحصال ۔ سماجی نابرابری اور معاشرہ کے اقدار وغیرہ کے شعری پیکر ملتے ہیں ۔ اس تحریک کے تحت جو غزلیں کہی گئیں ان کا نمونہ ذیل کے اشعار ہیں ۔

جلیل منزل 22-1-733/1 سلطان پورہ ۔ حیدرآباد ۔ 500024

پسینہ پونچھ رہا ہے تھکا ہوا مزدور
یہ وقت شام ہر اک اہلِ زر پہ بھاری ہے　　حسن شوق

کھیتوں میں مل رہا ہے کسی کا سفید خوں
میرے لہو کے رنگ کی فصلیں کہاں سے آئیں　　فروغ احمد

اس کارگہ دہر میں دولت کے پجاری
مفلس کا لہو پی کے بھی معصوم رہے ہیں　　سہیل احمد

یوں زمیں سے خون کے شعلے اٹھیں گے کب تلک
ہاتھ میں پرچم اٹھا اے ہمت مردانہ سرخ　　جاں نثار اختر

قتل گاہ سے لیکر قاتلوں کے دامن تک
خونِ ناحق مزدور کا سراغ ملتا ہے　　محمد صفدر

ہشیار سامراج کہ زنجیر ایشیا
ٹوٹے گی تیرے سلسلہ، جان و تن کے ساتھ　　مجروح

جگمگ جگمگ لال سویرا جاگ اٹھے ہیں محنت کش
کروٹ کروٹ میں خوابیدہ بیداری سی بیداری ہے　　افضل پرویز

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ، گندم کو جلادو　　اقبال

غریب اور ابھی کچھ لہو کے گھونٹ پئیں
ہے انقلاب غریباں کا انتظار ابھی　　احسان دانش

یہ ایک عبوری اور ہیجانی دور تھا جو بہت جلد ختم ہوگیا۔ جو شاعر مارکسیت کی نذر نہیں ہوئے انھوں نے ترقی پسندی کی وضاحت اور عصریت کو اپنے طور پر اظہار خیال کیلئے اپنایا۔ اسے ترقی پسندی ہی کی دین سمجھنا چاہیے کہ غزل کے موضوعات میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ بقول اختر انصاری

نئے دور نے مجھکو آواز دی ہے　　بلاتی ہیں مجھکو نئی سیر گاہیں

چنانچہ یہ تبدیلی کچھ تو روایت کی توسیع کی صورت میں اور کچھ حالات کے تقاضوں کے تحت ہوئیں۔ پھر جب ترقی پسند ادب کی مقصدیت سے پیچھا چھڑا کر آزادی سے پہلے اور بعد جب غزل اپنے انتشار سے متصادم ہوئی تو نئے مواد و مضمون کی گنجائش فراہم ہوئی اور موضوعات غزل رفتہ رفتہ کئی عنوانات میں بٹ گئے۔

۱۔ آزادی اور فسادات

آزادی ملی اور تقسیم کے ساتھ ہی ہندو پاک میں نفرت و حقارت کے حیرت انگیز بربریت کے انسانیت سوز مناظر دیکھنے کو ملے۔ بالخصوص اقلیتوں کو جن شدید جسمانی و روحانی اور مادی نقصانات اور ترک وطن کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کے خلاف سب سے بلند آواز شاعروں نے اٹھائی۔ ان کے افکار و فسادات۔ قتل و خون۔ آتشزنی۔ تاراجی۔ بربادی۔ خوف و ہراس اور دہشت کے مرقع ہیں:

آغوش میں لئے ہوئے انسانیت کی لاش
اترا رہا ہے ساحل گنگ و جمن ابھی — نامق فاروقی

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں — فیضؔ

یہ موڑ بھی ہمیں لایا لہو کے سنگم پر
نئی حیات ملی بھی تو موت کے بدلے — رضا ہمدانی

آتے کبھی نہ اپنے گلستاں کو چھوڑ کر
ہم اک حسیں بہار کے دھوکے میں آگئے — احمد ریاض

بستیاں ہوگئیں بے نام و نشاں راتوں رات
ایسے طوفان بھی آئے یہاں راتوں رات — خاطر غزنوی

کسے خبر ہے کہ کل کونسی ہوا چل جائے
کہ خاک و خوں میں ہے لتھڑی ہوئی بہار ابھی — احسان دانش،

ایک اک رنگِ ملامت سے کیا ہے تعمیر
کیسے اس شہر کو چھوڑوں کہ مرا گھر ہے یہاں شہاب جعفری

یوں چلی حالات کی آندھی قیامت آگئی
خشک پتوں کی طرح سب لوگ ہیں بکھرے ہوئے افضل نہاسی

تبدیل ہوچکی ہیں جہنم میں بستیاں
تسکین پاسکی نہ دلوں کی جلن ابھی

بشیر بدر نے ناصر کاظمی کے ایک شعر کے حوالے سے تقسیم ہند کے بعد کے فسادات کے ایک پہلو کو اجاگر کیا ہے۔

کیا قیامت ہے کہ ہے ایام گل دُلہنیوں کے ہاتھ پیلے ہوگئے

"ناصر کاظمی کی پوری شاعری کے مزاج کو محسوس کرتے ہوئے اس شعر میں اُسکے علاوہ اور کچھ نہیں ملیگا کہ یہاں ان لڑکیوں کا المیہ پیش کیا گیا ہے جس میں ترک وطن اور فسادات کے ہنگامے میں انھیں اپنا سب کچھ دینا پڑا۔ ٹھیک ہے تہذیب ہے رسم ہے کہ لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں، پھولوں کا موسم آتا ہے۔ تب ان کے ہاتھ پیلے ہوتے ہیں۔ اب کے کیا قہر ہوا کہ نہ ڈھول بجا، نہ گھر سجا، نہ بارات آئی اور ہاتھ پیلے ہوگئے۔ جنس کے اس قہر کو شعری پیکر میں جس جذبہ نے جنم دیا ہے وہ خالص جنسی ہیجان کا جذبہ ہے۔" (آزادی کے بعد غزل ص ۶۵)

فسادات کے یہ مناظر یہیں ختم نہیں ہوئے بلکہ ہمارے معاشرہ کا ایک جزو بن گئے ہیں۔ آج صورت حال یہ ہے کہ معاشرہ ایک گرتا ہوا مکان ہے لیکن اس کی دیواریں سفید ہیں کہ وہ سلامت ہیں اقلیتی فرقہ کی غیر محفوظیت اور شدید خوف و ہراس کے ساتھ زندگی کے مثبت عقائد سے کھلواڑ کرنے اور تمام رشتوں کی شکست و ریخت کا تجربہ آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ اس کا اظہار دور حاضر کے شاعروں کے پاس یوں ملتا ہے۔

ابھی ہیں گھر کے اندر سو رہا تھا
ابھی میں گھر سے باہر ہوگیا ہوں محمد علوی

خنجر بکف تھے لوگ کھڑے اس کے ارد گرد
نکلا نہ ایک شخص بھی جلتے مکان سے پرکاش فکری

دو روز سے شہر میں کرفیو لگا ہوا
نکلا ہوں آدھی رات کو میں گھر سے بے خطر طلحہ رضوی

میں اور امن کی کس سے سلامتی مانگوں
شریف لوگ تو مارے گئے فسادوں میں بشیر سیفی

کچھ دکھائی نہ دیا زخموں کی بارش کے سوا
اب کے پتھراؤ بہت اونچی عمارت سے ہوا اظہر عباسی

کل یہاں ظلم نے کاٹی تھیں سروں کی فصلیں
نم ہوئی ہے تو اسی شاخ سے خنجر نکلا وحید اختر

لہو کے دھبوں سے پہچان بن گئی ورنہ
ہمارے گھر کا پتہ بھی کسی کو یاد نہ تھا قیصر الجعفری

تمام شہر ہی پہنے ہوئے ہے دستانے
میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں مصطفیٰ زیدی

سہمے ہوئے ہیں اپنی خاموشیوں سے لوگ
مردہ نہیں یہ شہر مگر تم صدا تو دو خورشید اسلام

ہمارے شہر کو ظلمت میں یوں کمی آئی
کہیں بھی کوئی بستی تو روشن آئی علی احمد جلیلی

۲۔ سیاسی سماجی اور تمدنی اقدار کی شکست

آج کے دور کی سب سے ممتاز خصوصیت بے اطمینانی اور اضطراب ہے۔ آج کے چلتے پھرتے جیتے جاگتے انسان کی زندگی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اقرار کی

ناپائیداری کا احساس عام ہو چلا ہے ۔ چنانچہ آج کی فکر میں جو احساس سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ مایوسی، تھکن، اضمحلال اور انتشار ہے جس نے زندگی کے تار و پود بکھیر دیے ہیں ۔ غربت، بیکاری، بھوک اور معاشرہ کی بیماری سے جہاد ہو رہا ہے ۔ ہم قاتل بھی ہیں مقتول بھی ہیں زماں و مکاں کی تمام حدیں ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہیں ۔ آج کا نوجوان سماج میں جس جسمانی، روحانی کرب اور ذہنی الجھنوں سے گزر رہا ہے ۔ وہ پہلے کے شاعروں کو پیش نہیں آئی تھیں ۔

ان دنوں اجنبیت اور بیگانگی کا یہ حال ہے کہ دنیا ہنگاموں اور انسانوں سے بھری ہوئی ہے لیکن ان انسانوں میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس کو اپنا کہا جاسکے اور جس سے ہمدردی، خلوص، دوستی اور محبت کے رشتے استوار کیے جائیں ۔ ہر خیال و احساس پر بینوائی کی چادر ہے ۔ لوگ ملتے ہیں، لیکن فاصلے بڑھے ہوئے ہیں ۔ تنہائی، نارسائی، کسمپرسی، بے گھری، عدم اعتماد، تشکیک، بے اطمینانی، غیر محفوظیت، زندگی کی بے معنویت، دم توڑتی قدروں اور سماجی ٹوٹتے رشتوں سے انسان اس قدر خود شکستہ ہوتا جارہا ہے کہ اسے اپنے کھونے کا اندیشہ ہے ۔

ذیل کے اشعار اس مزاج فکر کی عکاسی کرتے ہیں جن سے جدید حسیت، عصری مسائل اور ان سے پیدا شدہ احساسات اور تفکرات کا بھرپور اظہار ہوتا ہے ۔

آدمیت کس قدر مایوس ہے
جیسے کوئی آدمی باقی نہیں — صبا اکبرآبادی

نہ حوصلے ۔ نہ تمنا ۔ نہ ولولے ۔ نہ امنگ
نہ جانے کونسی منزل پر رک گئی ہے حیات — زہرہ نگاہ

نئے چہروں سے جی گھبرا رہا ہے
تمام شہر کو دھندلا دکھائی دیتا ہے — نیاز بدایونی

بنائے تھے جو رہ سے دوستوں کے
وہ پتھر میرے گھر ...نے لگے ہیں — عمار

آگ اپنے ہی لگا سکتے ہیں
غیر تو صرف ہوا دیتے ہیں — ظفر زیدی

ہزار چہرے ہیں موجود آدمی غائب
یہ کس خرابے میں دنیا نے لاکے چھوڑ دیا — شہریار

نہارہے ہیں بدن وقت کے اجالوں میں
دلوں کے پاس اندھیرا دکھائی دیتا ہے — جانی

دنیا وفا شعاروں کا خوں چوستی رہی
انسانیت خموش مگر دیکھتی رہی — نسیم کاظم

خبر نہیں ہے کسی کو بھی خستگی کی مری
مجھے نہ ہاتھ لگاؤ کہ ٹوٹ جاؤں گا — سلیمان اریب

۳۔ مظاہر قدرت اور جذبوں کی تجسیم

مواد غزل میں اس طرح بھی ایک بڑا خوشگوار اضافہ ہوا کہ نئی غزل کے شاعروں نے منظر نگاری کو بھی اپنی فکر میں شامل کرلیا۔ یہ منظر نگاری نہیں بلکہ مشاہدوں، تجربوں کی ذہنی اور محسوساتی پیچیدگی کو استعاراتی انداز میں پیش کرنے کا عمل ہے۔ جذبات کا رشتہ جب کائنات اور مظہر کائنات سے قائم ہوا تو شاعر کو ان میں نئی معنویت کا ایسا انداز محسوس ہوا کہ انسان اور اسکے احساسات اور جذبات مناظر قدرت میں جاری و ساری خارجی اشیاء میں جو مرتسم ہوتے ہوئے عجیب کیفیات کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ دریا، پہاڑ، ریت، برف، جھرنے، آبشار، چاند سورج اور شجر حجر اسکی اپنی کائنات کا جزو بن گئے ہیں۔

خارجی مظاہر کا اظہار و احساسات و جذبات کی سطحوں پر مختلف انداز سے ہوتا ہے۔ ذیل کے اشعار میں یہ مناظر ایسی داخلی دنیا کو پیش کرتے ہیں جن کے استعاراتی انداز بیان نے جذبوں کی تہیں چڑھادی ہیں۔ غزل کے مضامین کو نیا پیراہن ملا ہے۔

سمٹ کے رہ گئے آخر پہاڑ سے قد بھی
زمیں سے ہر کوئی اونچا دکھائی دیتا ہے — شکیب جلالی

اے درد میں ڈوبے ہوئے لوگو کبھی تم نے
برسات میں چڑیوں کا نہانا نہیں دیکھا　　قتیل شفائی

سایے میں آتے ہی وہ آدمی یاد آتا ہے
جس نے کچھ سوچ کے یہ پیڑ اگایا ہوگا　　اظہار حیدر

آؤ پت جھڑ میں کبھی حال ہمارا دیکھو
خشک پتوں کے بکھرنے کا تماشا دیکھو　　جمیل جالبی

بارشوں میں کسی پیڑ کو دیکھنا
شال اوڑھے ہوئے بھیگتا کون ہے　　بشیر بدر

کس قدر زخم زخم چہرا ہے
چاند بھی آدمی سا لگتا ہے　　مجید الاسلام

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے
مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے　　ساغر اعظمی

دیکھ کے زرد رو پہاڑ ساری تھکاں اتر گئی
کون زمیں پہ رکھ گیا بارِ سفر اتار کے　　احمد مشتاق

تمام اونچے درختوں سے بچ کے چلتا ہوں
مجھے خبر ہے کہ سایہ کسی کے پاس نہیں　　ایاز شکیب

مناظر فطرت کے غزل میں در آنے اور اسے موضوع سخن بنانے کی ایک صورت یہ بھی سامنے آئی ہے کہ شاعر جس منظر سے متاثر ہوتا ہے اس مشاہدہ کو بیانیہ طور پر شعر کا روپ دیتا ہے۔ ایسے اشعار غزل میں کسی نظم کا شعر معلوم ہوتے ہیں، ان میں شاعر اپنے جذبات شامل نہیں کرتا بلکہ قدرت کی نیرنگیوں کے جن پہلوؤں کا مشاہدہ کرتا ہے اسے نظم کر دیتا ہے۔ تاہم ان کے اندر جھانکنے پر اور بہت کچھ نظر آتا ہے جسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

جہاں سوکھتی گھاس بکھری پڑی ہے
یہ تختے ہیں پھولوں سے بھر جانے والے　　احمد مشتاق

ابھی کچھ اور یخ بستہ سیاہی کو پگھلنے دو
ابھر آئے گا یہ منظر ذرا سورج نکلنے دو — روحی کنجاہی

وہی ہے گھونسلا ٹہنی کے پیچھے
مگر چڑیوں کا وہ جوڑا نہیں ہے — اشک

لو دے اٹھے چنار کے پھیلے ہوئے درخت
ابھرا جو کل پہاڑ پہ چاند اک چٹان سے — ناصر شہزاد

ندی کے پانی میں جسوقت چاند اترا تھا
بہت سے پیڑ کھڑے راستے کو تکتے تھے — اقبال متین

پھر درختوں پہ خامشی چھائی
پھر ہواؤں نے پر سمیٹے ہیں — کیف انصاری

سخت ہوتے ہوئے آبشاروں کے روپ
برف کی طرح موسم پگھلتا ہوا — مظہر امام

طاق میں بیٹھا ہوا بوڑھا کبوتر رودیا
جس میں ڈیرا تھا اسی مسجد میں تالے پڑگئے — بشیر بدر

۴۔ شہر دیہات اور گاؤں

غزل جیسے ارتقائی منزل طے کر رہی ہے اس کا کینوس وسیع ہوتا جاتا ہے۔ عصری تقاضوں کے تحت آج غزل کا پھیلاؤ طرب گاہوں، شبستانوں اور چمنستانوں سے نکل کر شہر کے بازاروں، فٹ پاتھوں، کارخانوں، دیہات کے ہاٹ، چوپال، کھیت اور کھلیانوں تک ہوگیا ہے۔ اس سے غزل کے اسلوب میں بھی اضافہ ہوا اور مواد میں بھی۔ اب غزل میں جا بجا ایسے اشعار نظر آتے ہیں جو آج کی شہری زندگی کے حقیقی ترجمان ہیں، شہروں کی گہما گہمی، الجھن، گھٹن سے فرار، کبھی گاؤں کی طرف بھی یہ اشعار لے جاتے ہیں۔ ان میں شہری اور دیہاتی زندگی کا تقابل بھی ملتا ہے۔ مثلا

جس شہر میں فٹ پاتھ بھی خالی نہیں ملتے
اس شہر میں رہنے کو مکاں ڈھونڈ رہا ہوں — انجم الہ آبادی

الجھن ۔ گھٹن ہراس تپش کرب ۔ اضطراب
وہ بھیڑ ہے کہ سانس بھی لینا محال ہے — منظور احمد

آنکھوں کی آیتوں میں توانائی آئے گی
دیکھے گا سبز کھیت کو بینائی آئے گی — خلیل رامپوری

جس میں ہم لوگ چراغوں کی طرح جلتے ہیں
آؤ وہ شہر زمانے کو دکھایا جائے — جامی

کیا تمھیں بھی سنائی دیتا ہے
شہروں شہروں یہ چیختا منظر — رؤف خلش

ہمارے گاؤں کے کچھ پیڑ اب بھی
ہوا کا رخ بدلنے کو کھڑے ہیں — یونس مظفری

دیکھ لینا یہ نگل جائے سارے شہر کو
چمنیوں سے اٹھ رہا ہے جو دھواں اس شہر میں — احتشام اختر

کہاں کا رت جگا چوپال کیسی
الاؤ تک یہاں ٹھنڈے پڑے ہیں — آشفتہ چنگیزی

تمہارا شہر کیا اس کا بدل دے پائے گا ہم کو
ہم اپنے گاؤں کی گلیوں میں ساون چھوڑ آئے ہیں — والی آسی

۵ ۔ رومانیت ۔ غزل کا جمالیاتی عنصر

اردو غزل کے ارتقاء میں یہ بات واضح ہے کہ معنوی اور داخلی تنوع کے باوجود آج بھی غزل اپنے جمالیاتی قدروں سے محروم نہیں ہوئی ہے ۔ آج بھی پرانی اور نئی غزل کی قدر مشترک وہ رومانیت ہے جس پر غزل کے ایوان کی دیواریں تعمیر ہوئی ہیں ۔ اتنا

ضرور ہوا کہ ترقی پسند گرفت سے آزاد ہونے کے بعد غزل کی عشقیہ شاعری ایک نئے زاویے کے ساتھ ہو رہی ہے۔

دور حاضر میں عشقیہ شاعری کے دو پہلو نمایاں ہیں۔ آج بھی بہت سے شعراء کے یہاں حسن و عشق کی ثابت اور طے شدہ اصولوں کی شاعری کلاسیکی روایات کی تقلید میں اسلوب کی تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ ویسی ہی ہو رہی ہے۔

ایسی راتیں بھی ہم پہ گزری ہیں
تیرے پہلو میں تیری یاد آئی — خلیل الرحمن اعظمی

حضور یار کچھ آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں — ناہید

یاد رکھو تو دل کے پاس ہیں ہم
بھول جاؤ تو فاصلا ہے بہت — محمود ایاز

میری دیوانگی، دل پہ کوئی پیکر ناز
کھل کھلا کر جو ہنسا بند قبا ٹوٹ گئے — مخمور سعیدی

کہیں پتی کہیں کانٹا کہیں شاخیں کہیں پھول
وہ میرے سامنے آئے ہیں گلستاں بن کر — احمد مشتاق

جیسے وہ لوٹ کر بھی آئیں گے
مدتوں تک کھلی رہیں بانہیں — شہرت بخاری

اسے بلا کے ملا عمر بھر کا سناٹا
مگر یہ شوق کہ ایک بار پھر بلاؤں اسے — ندیم قاسمی

دنیا نہ کائنات کا مارا ہوا ہوں میں
اک حسن بے ثبات کا مارا ہوا ہوں میں — سلیمان اریب

خوب ہے صاحب محفل کی ادا
کوئی بولا تو برا مان گئے — زہرہ نگار

رومانی شاعری کا دوسرا پہلو روایتی ضوابط سے اختلاف کی صورت میں ہے۔ مثال پسندی اور آدرش کی جگہ حقیقت پسندی اور ارضیت نے لے لی ہے۔ معاشرہ میں چونکہ عورت مرد کی نفسیات مصروفیات اور ان کے تعلقات کی اخلاقی قدریں بدل چکی ہیں اب انسانوں کی حسیت تصوری اور خیالی نہیں رہی۔ وفاداری کی شرط باقی نہیں رہی۔ روایتی محبوب آج جیتی جاگتی گوشت پوست کی عورت ہے۔ عورت کے کردار کے ساتھ مرد کے کردار بھی تسلیم و رضا سے گریز کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ واردات و معاملات حسن و عشق میں حقیقت پسندانہ اور نفسیاتی اظہار آگیا۔

ذیل کے اشعار ان تمام تبدیل شدہ محرکات کی آئینہ داری کرتے ہیں جن میں روایت سے بغاوت اور مثالی محبت سے انحراف ہے۔ عورت مرد کے مختلف کردار اور ان کی بدلتی ہوئی ہیجانی کیفیت کا اظہار ہے۔

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں ایسے حجابوں میں ملیں — احمد فراز

یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو — ناصر کاظمی

دن آرزو کے یوں ہی اداسی میں کٹ گئے
وہ اپنے دکھ میں اپنی پریشانیوں میں تھا — ریاض مجید

میں آہی جاؤں گا اور تو بھی مل ہی جائے گا
اس اعتماد سے تو میرا انتظار نہ کر — عتیق احمد

اجرت عشق و وفا ہے تو ہم ایسے مزدور
کچھ بھی کرلیں گے۔ محبت نہیں ہوگی ہم سے — افتخار جالب

اس کی یادوں سے ہے مجھے پرہیز
اے صبا اب نہ آئیو تو بھی — جون ایلیا

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کردیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے — فیض

تم بھی گھبرا گئے ہو قربت سے
تھک گئے ہم بھی شادمانی سے — شہریار

میں سوچتا ہوں کہ دل کا دیا بناؤں اسے
مجھے جلایا ہے جس نے میں اب جلاؤں اسے — مختار راشد

۶۔ نظمینے

آج کی غزلوں میں کچھ ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں جن کا کوئی تعلق غزل کے موضوعات سے نہیں ہوتا۔ ان کے پس منظر میں کوئی ایسا منظر ہوتا ہے جو کسی روداد یا واقعہ سے متعلق ہوتا ہے۔ انھیں نظمینہ کہا جاسکتا ہے جو طویل نظم کا موضوع بن سکتے ہیں۔ لیکن ایک شعر میں اسکو سمیٹ لیا جاتا ہے۔ کچھ سما ہوا کچھ پھیلا ہوا۔ یہ اشعار بظاہر غیر غزل معلوم ہوتے ہیں۔

اک لڑکی ایک لڑکے کے کاندھے پہ سوئی تھی
میں اجلی دھندلی یادوں کے کمرے میں کھوگیا — بشیر بدر

ہوس کی آگ کو آنسو نے کردیا سیراب
وہ بن کے آئی تھی عورت ذرا سی بچی تھی — قمر اقبال

پتھر ابالتی رہی اک ماں تمام رات
بچے فریب کھا کے چٹائی پہ سوگئے

میں نے کہا یہ دیکھو، یہ میں، یہ ہوا، یہ رات
اس نے کہا، یہ میری پڑھائی کا وقت ہے — احمد مشتاق

کسی کی بھابھی کسی کی بیٹی
غریب کا خاندان کیا ہے — مظفر حنفی

اسے یہ شوق کہ ہر روز اک نیا ہو بدن
دلال اب کے جوا لایا اسی کی بیٹی تھی

منڈیروں پر پرندے پچھاۓ
پس دیوار پھل پکنے لگا ہے — پریم کمار

زیر دیوار کوئی چشم براہ
اور کوئی بام قصر پر بے خواب — محسن احساں

پڑھائی لکھائی کا موسم گیا
کتابوں میں خط آنے جانے لگے — بشیر بدر

ایک مدت کے بعد ملے ہو اچھے ہو
تم بھی کیا امریکا میں رہتے ہو

یہی گوشہ تھا ، یہی میز ، یہی کرسی تھی
کہنیاں ٹیکے مرے سامنے وہ بیٹھی تھی — ظفر اقبال

☆ ☆ ☆

میر انیس کی اقلیم سخن

سید محمد عقیل

میر انیس نے اپنے مرثیوں میں بہت سی دعائیں مانگی ہیں۔ کچھ مقبول ہوئیں کچھ نہ ہوئیں۔ چند دعائیں یہ تھیں کہ جب تک چاند سورج میں چمک باقی ہے میری شاعری بھی باقی رہے اور اقلیم سخن پر میرا قبضہ رہے اور یہ کہ مدّاحِ مولا کا شرف میرے خاندان میں جس طرح چلا آیا ہے، اسی طرح باقی رہے۔ اور بہت سی دعائیں ہیں مگر اقلیم سخن پر قبضہ رہنے کا جیسے انھیں یقین تھا کہ وہ اپنے فن کے خود بڑے پارکھ تھے اور چھان پھٹک کر خود بھی اسے دیکھا کرتے تھے۔ کچھ دعائیں یہ بھی تھیں کہ کاش میرا یہ چمنِ نظم گلزار ارم بن جاتا اور جنت کی طرح اس چمن نظم کو بھی ابدیت حاصل ہوجاتی۔ اگرچہ میں گمنام ہوں مگر کاش اعجاز بیانوں میں میرا بھی شمار ہوجائے اور پھر وہ آخری بات کہ؎

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلم رو سے نہ جائے

اور مبداء فیاض سے یہ کچھ بعید بھی نہ تھا کہ ایسا ہو بھی جاتا۔ مگر میر انیس نے صرف دعائیں مانگنے ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے فن کو سجانے اور اسے عروج دینے کی ہر وہ کوشش کی جو ان کے وقتوں میں فن کی بلندی کا معیار سمجھی جاتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ شاعری اور علی الخصوص مرثیے کے فن کو جہاں تک ان کے اجداد پہنچا چکے تھے انیس چاہتے تھے کہ اپنے خاندان کی اس شعری

روایت کو آگے لے جائیں اور ان میں کچھ ایسا اضافہ کریں کہ جیسی کہ انھوں نے دعا کی ہے ،مرثیہ اسی کے شایان شان ہوجائے ۔

یہ ایک عمرانی مسئلہ بھی ہے کہ انسان اپنی خاندانی روایات کی پاسداری کرتا ہوا ہی عموماً آگے بڑھنے کی تمنا رکھتا ہے اور یہ بھی کہ جب اسے دوسروں کے مقابلے میں اپنا تحفظ یا اپنی سربلندی ملحوظ ہوتی ہے تو اسے اپنی فکر اور اپنے فن کے لئے نئے منطقے بنانے پڑتے ہیں ۔ تاریخی اور تجزیاتی اعتبار سے ، اگر میر انیس کی خاندانی روایات کو دیکھا جائے تو انھیں فیض آباد اور وہاں کی روایتوں سے دلچسپی ہوسکتی ہے اور چونکہ میر انیس نے اپنی عمر کے چالیس بیالیس سال فیض آباد میں گزارے تھے ۔ اس لئے ان کی فکری اور ادبی روایات جو انھیں اپنے گھرانے اور فیض آباد کے ماحول گلاب باڑی کی فضا سے ملی تھیں بہت مضبوط ہوچکی تھیں ۔ میر حسن کی مثنویوں میں ساری فضا اور فیض آباد کی دلچسپیاں اس صورت سے جلوہ گر تھیں کہ لکھنو کی ہوحق کی زندگی انھیں ہمیشہ بے مزہ معلوم ہوتی رہی جس کے لئے میر حسن اتنے مکھر (VOCAL) ہوگئے کہ انھوں نے ایک مثنوی بھی در مذمتِ لکھنو لکھ ڈالی جس کا انھیں خمیازہ اٹھانا پڑا اور سحر البیان جیسی مثنوی کے لئے لکھ لٹ آصف الدولہ کے دربار سے انعام میں محض ایک دوشالہ ملا ۔ لیکن مثنوی سحرالبیان میں فطرت نگاری کی جو حقیقی محسوساتی تصویر ملتی ہیں وہ اردو کی نیچرل شاعری میں شاید ہی کہیں ممکن ہوسکی ہو ۔ میر انیس اپنے مرثیوں میں اپنی اس روایت کو کہیں اور کبھی نہیں بھول سکے ،اگرچہ مرثیوں میں اس روایت کے لئے موقعے زیادہ نہ تھے ۔ اور فطرت کی یہ حقیقی متحرک اور محسوساتی شاعری جس کے ساتھ ساتھ میر خلیق کی سلاستِ زبان مستزاد تھی ، یہ سب کچھ میر انیس کے خون میں جیسے حل ہوگئے تھے ۔ اور یہ تمام صورتیں ان کے مثنویوں میں ہمیشہ رواں دواں رہیں ۔ اگرچہ میر انیس کی نیچر شاعری پر یہ اعتراضات برابر ہوتے رہے کہ یہ منظر نگاری کربلا کے ریتیلے اور بے آب و گیاہ میدان میں کیا جواز رکھتی ہے اور اس کے جوابات بھی دئے جاتے رہے ہیں ۔ یہاں ان کا اعادہ مناسب بھی نہیں کہ ان پر بڑی بحثیں ہوچکی ہیں ۔ یہاں صرف یہ نظر میں رکھنا چاہئے کہ عقیدت اور آستھا پتھروں میں پھول کی رغبت اور مظاہر فطرت سے رحم ، تخویف اور محبت کی امیدیں وابستہ رکھتی ہے ۔ ابتدائی انسانوں کے جنگوں کی جبلت ، میراجی کو فطری انسانی خواہشات کی طرف لے جاتی ہے ۔ خیالی لوسی (Lucy)(جو اصلا

ورڈس ورتھ کی وہ بیٹی ہے جو پیرس میں اس کی محبت کی نشانی تھی اور جو کبھی گراس مئیر اور ونڈر میئر نہیں آسکی) شاعر ورڈس ورتھ کے گردو پیش کے سبزہ و گل کی دنیا میں ڈوکاٹج (Dove Cottage) کے گرد و پیش، دھوپ، بارش اور سبز فضاؤں میں سانسیں لیتی ہوئی پیش کی جاتی ہے جسے ورڈس ورتھ خود بتا دیتا ہے۔

But the Sweet face of lucy Gray will

never more be seen.

اسی طرح شیلی صاحب پرا میتھیوز ان باونڈ میں فرماتے ہیں:

The erawing glaciers pierce me with the
spears of their moon_freezing crystals
The bright chains eat with their burnning cold
into any borns.

اور عیارِ عقل، سب کا جواز پیش کردیتی ہے کہ فنی اور فکری رومانیت میں یہ سب ممکن ہوسکتا ہے کہ یہ ترحم کے اجزا (Elements of Pathos) کے صرف کا بھی مسئلہ ہے۔ پھر فطرت کی کیف سامانیاں اور قوت نمو، اگر واقعات کے پیچ وخم میں تخلیق کو ارتقائی اقدام میں مدد کرتی ہوں تو پھر جغرافیائی اور تاریخی حد بندیاں بھی شاعر کے تخیل کے لئے ٹوٹ سکتی ہیں بشرطیکہ ان میں شعری صداقت، فکری خلوص اور تخلیقی جست شامل ہو میر انیس نے جب یہ تصویر پیش کی

چپ تھے طیور، جھومتے تھے وجد میں شجر — تسبیح میں تھے برگ وگل و غنچہ و ثمر
محو ثنا کلوخ و نباتات ودشت و در — پانی سے منہ نکالے تھے دریا کے جانور

تو اسی کے ساتھ ساتھ اس کا جواز بھی یہ پیش کیا کہ یہ سب اعجاز کی صورتیں تھیں۔ اس بند کی بیت یہ ہے کہ

اعجاز تھا کہ دلبرِ شبیر کی صدا — ہر خشک و تر سے آتی تھی تکبیر کی صدا

یہ صورتیں میر انیس کے مرثیوں میں رواں دواں رہی ہیں جن کا دوسرا سرا

پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے — تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے

تک پہنچتا ہے اور یہاں بھی " تم قربان صنعتِ قلم آفرید گار۔ ان تصویروں کا جواز بن جاتی ہے۔ اور یہ سب میر انیس کی تخلیقی جست میں مذہبی نہیں کرتی بلکہ ان المناکی کا پس منظر بن کر اس درد و غم کے ابھارنے میں معین بھی ہوتی ہیں جو سامعین کو اپنے ساتھ لپیٹ لیتا ہے سامعین جو بیانیہ کے الفاظ میں ڈوب کر المیہ (Catastrophe) کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔

یہ تمام وراثت میر انیس کے ساتھ ہمیشہ چلتی رہی۔ اس میں ان کے اپنے طور طریقے، اپنے گھر کی زبان اور گلاسری، انھیں اپنے ماحول کی شاعری سے واضح طور پر الگ کرتے ہیں جس کے لئے اپنے معترضین سے میر انیس نے یہ بھی کہا کہ " صاحبو یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ " (حقا کہ یہ خلیق کی ہے سر بسر زباں) تاہم ان کی نظر، اس پر ہمیشہ رہی کہ اگر ان کی اس تخلیق میں درد و غم اور تاثیر ہی نہ رہی جو حاصلِ مرثیہ ہے تو صناعی اور تخلیقیت بیکار محض ہے یعنی سب کچھ ہوسکتا ہے مگر

" مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے، والی پابندی مرثیہ جیسی نظم میں مقصد اول ہونا چاہیے۔ ہاں الفاظ کے صرف اور مضمون کے عالی ہونے میں مہارت اور فن کاری جیسی شرطیں بھی لازمی ہیں اور اس کی کوشش میر انیس نے اپنے مرثیوں میں ہر ہر قدم پر کی ہے لیکن ان کے فن کا مقصد، اگر کوئی صرف آرائش و زیبائش اور صنائع لفظی و معنوی کو سمجھتا ہے تو وہ میر انیس کی اقلیم کا مسافر نہیں ہوسکتا کہ اصل مقصد تو درد و غم کا اظہار ہے۔ میر انیس جانتے تھے کہ اگر مرثیہ سامعین کو درد و غم اور الم کے اس منطقے میں نہیں لے جاتا جہاں تین دن کی بھوک پیاس، اعزا و انصار کی بے کسی کی موت، خیام حسینی اور اہل بیت رسول کے لوٹے جانے اور پھر کربلا سے شام تک کا وہ جاں گزا سفر، سامعین پر اپنے غم و الم کی چادر نہیں پھیلاتا تو ہماری تزئین اور کمال فن کا اظہار بیکار محض ہو کر رہ جائے گا۔ یہ ساری سٹنگ (Setting) تزئین اور ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی مہارت اور کوشش، انھیں درد کی باتوں کے اظہار کے لئے تھی اور اس اظہار کے لئے جب تک مرثیہ نگار اطناب کی شاعری کے توازن پر قدرت نہ رکھتا ہو وہ ایک کامیاب مرثیہ نگار نہیں ہوسکتا۔ یہاں آرٹسٹ انیس اور مرثیہ نگار انیس دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مرثیے میں ہر منزل پر ایک واقعہ آتا ہے۔ اطناب کی شاعری میں اسی لئے توازن بے حد ضروری ہے جو اثر انگیزی بھی اپنے ساتھ ہر ہر قدم پر لیئے ہو

" واقعات کی ناپ تول اور ان کے کتر بیونت کا فن بھی مرثیہ نگار اچھی طرح جانتا ہو تاکہ لندھور بن سعدان کی داستان" کی پھبتی سے بھی بچ سکے۔ میر انیس میں ان کے بزرگوں نے یہ صلاحیتیں دیکھ لی تھیں جب ہی انھیں غزل چھوڑ کر مرثیے کی طرف توجہ دینے کی رائے دی تھی۔

انیس کے دور میں شاعری کی اقلیم، صنائع و بدائع، بات میں بات پیدا کرنے کی کوشش اور الفاظ و معانی کی تمام جہتوں کو پیش کر دینے ہی کو فن کا معیار تسلیم کرتی تھی۔ اہمیت اس میں بھی تھی کہ لفظ کی جتنی بھی پرتیں ہوں، شعر، سب کی طرف اشارا کرے اور تمام اور معانی ،اگر عیاں نہ ہوں تو کم از کم ان کی طرف ذہن قاری کی تفہیمی حس ضرور متوجہ ہو جائے۔ پھر صنعتوں کی پیشکش میں، اگر ایک صنعت سے کئی صنعتیں برآمد ہو جائیں تو یہ صورت شاعر کی قادر الکلامی کے لئے سند تھی۔ میر انیس نے اس سے بھی سیکڑوں تجربے کیے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں مختلف صنعتوں کے جگنو بھی چمکتے ہیں لیکن لیکن وہ یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ سونا کیا ہے اور ملمع کیا ہے اور یہ کہ ملمع کبھی سونے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن فن اور آرٹ کی تمام پیچ در پیچ صورتوں سے گزر کر مرثیے کے اشعار کو رلا دینے کا سامان بھی ضرور ساتھ رکھنا چاہئے۔ اس لئے جب کسی نے ان سے رعایت لفظی و معنوی کے استعمال کی شکایت کی تو انھوں نے یہی جواب دیا تھا کہ آخر لکھنو میں رہنا بھی تو ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ صنائع لفظی و معنوی سے کلام کو مزین کرنا، میر انیس کا اصل مقصد شاعری نہ تھا۔ اور اس طرح

ہاتھ اڑ کے جا پڑا کئی ہاتھ ایک ہاتھ میں — بولے نہنگ خوب نہیں یہ اگر مگر

حرفوں سے حرف لکھنے میں ہو جاتے ہیں جدا — کس طرح ذوالفقار کی برشش کی ہو ثنا

خس خانہ، مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر — مردم تھے ساتھ پردوں کے اندر عرق میں تر

پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں — گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں

کو مروجہ فن اور رنگ شاعری پر محاکمہ ہی سمجھنا چاہئے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

میر انیس کی فنی وراثت، میر ضاحک، میر حسن اور میر خلیق سے وابستہ تھی۔ جہاں الفاظ کے ابعاد زبان کا تحرک اور معنی کی جہتیں، اشاروں کنایوں میں اپنا مافی الضمیر ادا کرنا ہی جانتی تھیں بلکہ انھیں ان صورتوں کا بھی اندازہ تھا کہ سامعین پر یہ زبان کیسے

کیسے اثرات مرتب کرسکتی ہے ۔ اسی میں میر انیس نے توصیف، تعریف، رقت، دبدبہ، مصائب اور محظوظ ہونے کی بات بھی شامل کرتی تھی کہ بہرحال شعر سننے والے اس بات کے بھی متمنی ہوسکتے ہیں مگر فن کی تمام دوسری صورتیں دائروی (Peripheral) ہیں ۔ اصل مقصد تو مصائب ہی تھا۔ دلی سے غزل کی زبان جو تجربے لے کر آئی تھی، اس کی حدیں تھیں کہ یہ زبان مینی ایچر (Miniature) پینٹنگ بنانے اور تاثرات کی ایک جہت کا تجربہ تو جانتی تھی مگر یہ زبان اس توسیع کی مدد نہیں کرسکتی تھی جو انسان کے تمام حواس خمسہ اور اس کی مختلف نیرنگیوں کو محیط ہوسکے ۔ پھر انسانی زندگی کے جو مختلف رشتے تھے اور ان رشتوں سے منسلک ہوکر جو جذبات پیدا ہوتے ہیں اور ان کے جو مختلف موڑ برجستہ پیدا ہوجاتے ہیں، ان سب کی اظہاریت میں یہ کہاں تک کام آتی کہ غزل، وارداتِ قلب کے انفرادی تجربے تو بہت سارے بیان کرلیتی ہے مگر رشتوں کے اجتماعی تجربے، مختلف احساسات اور مواقع کے ساتھ، گردو پیش اور تاریخ سے پیدا ہونے والی رثائی صورتوں کو جذب کرکے، بیان اور اس کی اظہاریت پر پھیل جانے کی صلاحیت نہیں رکھتی کہ اس کے لئے بیرونی کائنات کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔ اور بیرونی کائنات کے تجربوں اور صورتوں میں حل ہوکر جو تاسف ابھرتا ہے اسے خالص جذبات کی زبان اور علی الخصوص غزل کی زبان کما حقہ، نہیں بیان کرسکتی ۔مثال کے لئے یہ دو بند ملاحظہ ہوں ۔

نیم وا چشم سے حر نے رخِ مولا دیکھا
زیرِ سر زانوئے شبیر کا تکیہ دیکھا
مسکرا کر طرفِ عالمِ بالا دیکھا
شہ نے فرمایا کہ اے حرِ جری کیا دیکھا؟
عرض کی حسن رخِ حور نظر آتا ہے
عرش سے فرش تلک نور نظر آتا ہے

مجھ کو لینے چلے آتے ہیں فرشتے یا شاہ
ملک الموت بھی کرتا ہے محبت کی نگاہ
خلد سے شیر خدا نکلے ہیں اللہ اللہ !!
لو برآمد ہوئے شبر بھی پدر کے ہمراہ
تکیے سراحمدِ مختار کی پیاری آئی
دیکھئے آپ کے نانا کی سواری آئی

تصورات کی یہ Predestined کیفیات اور صورتیں، جذبات کی یہ تہیں، واقعے میں روایات کی لپیٹ رسیدہ اور الفاظ کی نفسیاتی اور ڈرامائی کشش کے ساتھ ساتھ سامعین کے دل کھینچ لینے والی صورت کا یہ بیان نہ دلی سے آئی ہوئی زبان کے تجربوں میں ممکن تھا اور نہ لکھنو رائج، میرا

سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں "والی زبان، جذبات۔ عمرانی تجربوں، تاریخ اور روایت کی ایسی جمی ہوئی پرتوں کے اظہار پر قدرت رکھتی تھی۔ اس میں میر انیس کے یہ اعلانات کہ

قلم فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ — شمع تصویر پہ گرنے لگیں آآ کے پتنگ

" خون برستا نظر آئے جو دکھاؤں صف جنگ

سجایا ہم نے مضامیں کے تازہ پھولوں سے — بسادیا ہے، ان اجڑی ہوئی زمینوں کو

سنگ ہو موم، وہ تقریر عطا کر یارب — نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یارب

" یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی

معنی کا یہ بھی حال ہے حسن قبول سے — خوشبو سحر کو جیسے نکلتی ہے پھول سے

پائی نہیں کبھی یہ حلاوت نبات میں — مضمون نو ٹپکتے ہیں یا بات بات میں

سبک ہوچکی تھی ترازوئے شعر — مگر ہم نے پلہ گراں کردیا

بڑی حد تک مصدّق نظر آتے ہیں۔

نثر ہو یا مصوری، موسیقی ہو یا شاعری، ہر تخلیق میں، تخلیق کار اپنے کچھ اصول بنا کر، انھیں کے مطابق اپنی فکر اور اپنے فن کا اظہار کرتا ہے۔ کبھی یہ انفرادی ہوتا ہے اور کبھی اپنے متبعین کے ساتھ اجتماعی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ سوچتا تو ایک فرد ہی ہے مگر جب اس کے ہمصفیر دوسرے فن کار مل جاتے ہیں تو وہی سوچ اور طریقے ایک اسکول بن جاتے ہیں۔ اسے چاہیے نظریہ سمجھ لیا جائے یا ایک مخصوص طرز کی پسند۔ مگر اس کے بغیر کسی بھی میدان فکر و فن میں نئے جہات اور راستے پیدا کرنا مشکل ہے۔ محض روایت پر چلنے والے محدود صورتوں میں کچھ مینا کاریاں تو کرسکتے ہیں مگر کسی انقلابی تبدیلی کا امکان محض روایت پرستی کے ساتھ ممکن نہیں۔ میر انیس سے پہلے میر ضمیر نے مرثیے کے لئے کچھ اصول بنائے تھے اور انھیں اصولوں کو مرثیوں نے اس وقت اختیار بھی کرلیا جبھی میر ضمیر نے تفاخر سے وہ بات کہی تھی کہ

" جو جو کہے اس طرز میں شاگرد ہے میرا

مگر یہ بات ۳۳۔ ۱۸۳۲ء کی ہے جب میر انیسؔ کی تین پشتیں بھی گزر چکی تھیں اور میر انیس خود بھی ایک مشاق مرثیہ گو ہوچکے تھے۔ پھر میر مستحسن خلیق کے مرثیوں میں وہ تقسیم بھی ملتی ہے

جس پر میر ضمیر نے طرز نوی کا دعویٰ ۳۳ - ۱۸۳۲ء (۱۲۴۹ھ) میں کیا ہے ۔ اگر ڈاکٹر ضمیر اختر کے اعداد شمار درست ہیں تو میر خلیق اپنی وفات ۱۸۴۴ء تک دو سو مرثیے کہہ چکے تھے اور میر خلیق کے مرثیوں میں رخصت، جنگ، شہادت، بین وغیرہ سب کچھ موجود ہے ۔ مگر یہاں یہ بحث نہیں اٹھائی جاتی ۔

میر انیسؔ نے شاعری اور مرثیہ گوئی کے جو بھی طریقے اپنے خاندان سے سیکھے تھے ان کی توسیع، قدیم دائروں کو بہت کچھ توڑا کر انھوں نے ان شرطوں کے ساتھ کی جو ان کے خیال میں مرثیوں کی بہت سی کمیوں کو پورا کر سکتی تھیں اور مرثیے کو ایک بلند شعری اور تخلیقی فکر کے منطقے میں داخل بھی کرتی تھیں ۔ اگرچہ اس کا اعلان انھوں نے اپنے بیٹے میر عسکری رئیس کی زبان سے کرایا جو خود کوئی اچھے مرثیہ نگار نہ تھے ۔ وہ شرطیں یہ تھیں۔

(۱) لفظ بھی چست ہو مضمون بھی عالی ہووے (۲) ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد (۳) بات جو منہ سے نکلتی ہے وہ سنجیدہ ہے (۴) مختصر پڑھ کے رلادینے کے ساماں ہیں جدا (۵) دبدبہ بھی ہو، مصائب بھی ہوں، توصیف بھی ہو، دل بھی محفوظ ہو، رقت بھی ہو، تعریف بھی ہو ۔ بس اسی فریم ورک میں میر انیس کے تمام مرثیے گھومتے ہیں اور انھیں صورتوں سے میر انیسؔ کے مرثیوں کو پرکھنا بھی چاہیئے ۔ ان کے تمام اچھے مرثیے علی الخصوص (۱) جب کربلا میں داخلہ، شاہ دیں ہوا (۲) جاتی ہے کس شکوہ، سے رن میں خدا کی فوج (۳) پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح (۴) بخدا فارسِ میدانِ تہوّر تھا حرُ (۵) جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے، سب انھیں اصولوں اور شرطوں سے سجے ہوئے ہیں اور مرثیہ : نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری، تو میر انیس کی شاعری اور مرثیہ نگاری گویا بوطیقا ہے ۔ ان تمام مرثیوں میں میر انیس نے اپنی تمام شرطوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ جن سے ان کی شاعری، بڑی شاعری بنتی ہے ۔

مرثیے میں رقت کی شرط، ایک اہم شرط اس لئے بھی ہے کہ مرثیہ گویوں نے اس صورت کے لئے مرثیے کہے بھی تھے ۔ اس وقت کے لکھنوی سماج اور علی الخصوص، مجلسی سماج، میں رقت ایک ٹیکنیکل لفظ بھی بن گیا تھا ۔ کیونکہ "گریہ بر مصائب حسینؑ" مرثیے کی بنیادی شرط تھی ۔ مرثیہ نگار، مرثیوں میں خواہ کتنے ہی پینترے کیوں نہ دکھائے لیکن اس کے بیان سے اگر

سننے والوں پر رقت طاری نہ ہوئی تو ایسا بیان اور ایسی مجلس، معیار سے گری ہوئی سمجھی جاتی تھی۔ یہ بات بھی سنی گئی کہ کمزور قسم کے ذاکرین اور مرثیہ گو، کبھی کبھی معاوضہ دے کر اپنی مجلسوں میں رونے والوں کو لاتے تھے جو مجلسوں میں بیٹھ کر زور شور سے گریہ کرتے۔ ایسے کرایے کے رونے والوں کو لکھنؤ ہی کی اصطلاح میں "میر بکائی" کہا جاتا تھا۔ اسی سے مرثیے میں رقت کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مگر اس رقت، پیدا کرنے کے لئے بھی مصائب کی حدیں مقرر تھیں تبھی میر انیس نے "مختصر پڑھ کے رلادینے کے سامان ہیں جدا" والی بات کہی تھی اور اسی لئے میر انیس، اپنے مرثیوں میں بے حد مختصر بین لکھتے بھی تھے یہ الگ بات ہے کہ میر انیس جذبات، ان کے مبیج اور محرکات کے بڑے نباض تھے اور بیان واقعہ کے پیچ و خم میں وہ ایسی سچویشن پیدا کرلیتے تھے کہ بین کی منزل نہ ہونے کے باوجود سامعین اسی سچویشن سے اس کے انجام کو دیکھ سکیں اور متاسف ہوں۔ یہ تاسف واقعے کے مختلف موڑ، سلسلوں، کشمکشوں، تشویش، سرفروشی یا سماجی بلندی و پستی کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتا ہے۔ میر انیس کے یہاں رقت کے، مبیج صرف مصائبِ کربلا ہی نہیں ورنہ بقول آتش:

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے، لکھ دینا ہی کافی تھا۔ میری انیس، ان انسانی اقدار، اخلاقی کمٹ منٹ جو اسلام کی جزویات میں سے تھا، شعور اور زندگی کی طہارت اور خیرالبشر والی میراث کی شکست و ریخت سے پیدا ہوئی آشفتگی کو بھی مرثیوں میں پیش کرکے غم و افسوس کی وہ صورت پیدا کرتے ہی جن سے رقت، کا ٹیکنیکل لفظ روایت سے اوپر اٹھ کر غم کا ایک ایسا ہالہ بنا لیتا ہے جس میں شعری بلندی عالی صورتیں لے کر پیش ہوتی ہے۔ چنانچہ

جب کربلا میں داخلہ، شاہ دیں ہوا — دشت بلا نمونہ، خلد بریں ہوا

سے لے کر

مجھ کو لڑنا نہیں منظور یہ کیا کرتے ہو — تیر جوڑے ہیں جو تم نہ تو خطا کرتے ہو
کیوں نبی زادے پہ غربت میں جفا کرتے ہو — دیکھو اچھا نہیں، یہ کام برا کرتے ہو

یا

تھا بس کہ روز قتل شہ آسماں جناب — نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب
تھی نہر علقمہ بھی خجالت سے آب آب — روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب

تک غم کے ہالے ، شعری بلندیوں کے ساتھ پھیلتے جاتے ہیں اور یہ صورتیں پس منظر سے مہیج اور محرک کا کام کرتی رہتی ہیں ۔ کبھی براہ راست اور کبھی چشم تصوران کے لئے امدادی کردار ادا کرتی ہے ۔ جو عقیدہ ، فریضہ اور رسمیات سے عام انسانی ہمدردیوں تک پھیل جاتی ہے ۔ انسانی ہمدردی کا یہ رشتہ اسی " رقت " سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہے جس کا ذکر کیا گیا ۔ اسی انسانی ہمدردی کی بنیاد ، خاندان کے وہ رشتے ہیں جن سے افراد وابستہ ہوتے ہیں ۔ میر انیس کے یہاں خاندانی رشتوں کے ان نرم گوشوں کو بھی تلاش کرنا چاہئے جو پھیل کر کائناتی انسانی ہمدردیوں تک پہنچتے ہیں جس کا سب سے بڑا مبلغ (خود حضرت امام حسین کا کردار ہے جسے اصول اسلام کی تجسیم سمجھنا چاہئے ۔

مرثیے کی دوسری شرطیں ، دبدبہ ، توصیف ، تعریف اور ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد ، کے لئے ، میر انیس کے مرثیوں میں جنگ کے نقشے ، صنائع و بدائع کے اچھوتے اور روایتی ڈھنگ کے استعمال ، صبح و شام کے نقشے ، مناظر فطرت اور ان کے مونتاژ بنانے میں الفاظ کے صرف اور ان کی عضویاتی تعبیت (Organicfitness) میں ہر جگہ دیکھی جاسکتی ہیں جن کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ۔ ہر عظیم شاعر کی طرح ، میر انیس کو بھی اپنی فن کاری کی بلندیوں کا احساس تھا جبھی انھوں نے کہا تھا :

نظم ہے یا گوہر شہوار کی لڑیاں انیسؔ — جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں
جسے دیکھ کر ہووے مانی کی حیرت — وہ تصویر رنگیں بیاں کھینچتے ہیں
مری قدر کر اے زمینِ سخن — تجھے بات میں آسماں کردیا

ان تمام دعووں میں میر انیسؔ نے کہیں اپنے شعری سانچوں کی بات نہیں کی ہے کہ میں نے مسدس ، اسلام یا رباعیات کے فن کو بلند کیا ہے ۔ ہاں ایک جگہ نثر میں سجع اور نظم معلی کی موزونیت کی بات ضرور کی ہے ۔ مگر یہ تخلیقی سانچوں کے بجائے شاید سبک دہلوی کی بات ہے جس میں معنی آفرینی ، الفاظ کے صرف ، تہداریوں اور ان کی مدد سے بیان میں توضیح اور موزونیت کی باتیں ہیں ، جہاں حسنِ کلام ، لطفِ بیان ، فصاحت و بلاغت اور اشعار کی تشکیل میں الفاظ کی سنگ کی باتیں ہیں جو پڑھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ سکیں اور ان کا حسی اور جمالیاتی احساس متاثر

ہوسکے ۔ یہاں ان تمام صورتوں کے لئے کلام سے مثالیں پیش نہیں کی جارہی ہیں ۔ جس نے بھی میر انیس کے کلام کا سرسری مطالعہ کیا ہے وہ ان مثالوں سے بخوبی واقف ہے ۔

یہاں، میر انیس کے سلسلے میں ایک اور صورت کی طرف ذہن جاتا ہے اور وہ یہ کہ کیا میر انیس کے ذہن میں اپنی ادبی وراثت اور اس دور کے لکھنؤ میں ترقی کرتی ہوئی ناسخیت سے ٹکراؤ تو نہیں تھا جس میں نفسِ مضمون چھوڑ کر صرف، الفاظ کی حک و اصلاح، صنعت سازی اور خالی خولی ذہنی اڑان کی باتیں تھیں یا پھر خلوت و جلوت کی تصویروں سے شعری فضا سازی کی کوشش کی جاتی تھی۔ میر انیس کو اپنی دہلوی وراثت سے، دردمندی، جذبات نگاری، سادگی اور ادائے معانی کے ساتھ ساتھ مظاہرِ فطرت کو پیش کرنے کا وہ طریقہ ملا تھا جس پر رنگِ تکلف کا غازہ نہ تھا۔ ان کے دادا میر حسن کی مثنوی سحرالبیان خود اس کی جیتی جاگتی مثال ہے ۔ اور ان کے والد میر خلیق کا مرثیہ

"گھر سے جب بہرسفر سید عالم نکلے " اس جذبات نگاری کی مثال ہے جو انسانی ہمدردیوں کے راستے سے آتی ہے ۔ اس دور کی لکھنوی شاعری میں مجموعی طور سے تصنّع، تکلفات، نیوٹ اور لحاتی طور پر دل خوش کرنے کی صورتیں تھیں ۔ یہاں تک کہ رثائی تخلیقات بھی ان لحاتی دل خوش کرنے والی صورتوں سے بچ نہ سکی تھیں اور میر امانت کے مرثیے کا یہ مصرعہ " شامی کباب ہوکے پسندِ قضا ہوئے " اس کی مثال ہے ۔ یہ تکلفات، خالی خولی تخیلات کے ساتھ غزل پر چھائے ہوئے تھے ۔

" چاندنی نام ہے شبدیز کی اندھیاری کا " سے لے کر

بتی اس کے میل کی بتی اگر کی ہوگئی　　　ریزہ ریزہ میل، صندل کا برادہ ہوگیا　(ناسخ)

اگری کا ہے گماں، شک ہے ملاگیری کا　　　رنگ لایا ہے ڈوپٹہ ترا میلا ہوکر　(جراءت)

جیسی صورتیں، اس لکھنوی رنگ شاعری میں عام ہیں ۔ ناسخیت نے دہلوی جذبات نگاری سادہ بیانی اور شاعری کے قدرے لچک دار اصولوں پر خاصی ضرب لگائی مگر اصول شعری میں عروض، ردیف و قافیہ کی صحت، ان کے آہنگ اور سڈول ہونے کی فکر بھی کی ۔ تنافر حرفی، تعقید، فکِ اضافت یہاں تک کہ توالی اضافت وغیرہ سے اجتناب برتنے کا حکم لگایا گیا، اضمار قبل الذکر تفہیمی بُعد پیدا کرتے ہیں اس لئے ان سے پرہیز لازم ہے کی ہدایت کی گئی ۔ دولخت اور ایطاء سے اشعار کا

حسن غارت ہوجاتا ہے ان خرابیوں سے بچنا ضروری ہے اور یہ وہ باتیں تھیں جن پر آج تک شعرائے اردو کاربند ہیں ۔ پہلوئے ذم پر ہر وقت نظر رکھنا ۔ بندش الفاظ کا سلیقہ فارسی ۔ ہندی الفاظ کی ترکیبوں کو ترک کرنا سب ناسخ اسکول ہی کی کوششیں تھیں ۔ ایسا نہیں ہے کہ ناسخ اسکول نے شعری صورتوں کو بہتر بنانے کی کوشش نہ کی ہو ۔ عبدالغفور نساخ اور محمد یحیٰ تنہا (مراۃ الشعراء) کی ناسخ اسکول کی شعری روایات پر تنقیدوں میں " ہنرش نیز بگو " بھی ہونا چاہئے تھا ۔ ناسخ اسکول نے بہت سے نئے الفاظ بھی وضع کئے جو ایک خاص سچویشن ہی میں استعمال ہوسکتے تھے ۔ نئے نئے محاورے بھی بنائے ۔ نازک خیالیوں کو بھی ترقی دی مگر یہ ساری کوششیں شعری تخلیقات کو عظمت نہیں بخش سکیں ۔ نہ ہی فکری سطح بلند ہوسکی ۔ میر انیس کے لئے یہ بھی ایک طرح کا ٹکراؤ تھا ۔ زبان و بیان اور جس زمینِ سخن کی باتیں میر انیس کرتے ہیں ، عجب نہیں کہ وہ ناسخ کے اسکول سے ایک چیلنج کے طور پر قبول کی گئی ہوں ۔ اسی وجہ سے میر انیس پر ناسخیت کے اثرات بھی کام کرنے لگتے ہیں ۔ تلوار کو دولہن بناکر پیش کرنے اور بہت سے اشعار اور مصرعوں میں دور کے عام مذاق کو قبول کرلنے میں ٹکراؤ بھی ہے اور مفاہمت بھی ۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

زیبا تھا دمِ جنگ ، پری وش اسے کہنا | معشوق بنی ، سرخ لباس اس نے جو پہنا
اس اوج پہ بھی سر کو جھکائے ہوئے رہنا | جوہر تھے کہ پہنے تھی دولہن پھولوں کا گہنا
سیبِ چمنِ خلد کی بو باس تھی پھل میں | رہتی تھی وہ شبیر سے دولھا کی بغل میں

چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے | چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارہ جیسے
برچھیاں چل گئیں اس پر جسے دیکھا بھالا | آگیا دام میں جس شخص پہ ڈورا ڈالا

یہاں ناسخ اسکول کی معاملہ بندی اور اس رنگین زندگی کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں جن سے لکھنو کی سماجی زندگی گزر رہی تھی ۔ میر انیسؔ کے اسلاف کی مرثیہ گوئی میں یہ تصویریں یا ایسی کوششیں راقم کو کہیں نظر نہیں آئیں ۔

مرثیہ ایک بیانیہ شاعری ہے ، مگر یہ بیانیہ ایک خاص مقصد کے لئے مرکوز بیانیہ ، بنایا گیا تھا اس کی فضا میں ایک تقدس ، احترام اور بیانات کے بھی حدود تھے مگر لکھنو میں جو رنگ شاعری مطبوع ہورہا تھا ، اسے رد کرنا آسان نہیں تھا کہ اس نے الفاظ اور اظہاریت کے طریقوں میں ایک

حسن غارت ہوجاتا ہے ان خرابیوں سے ۔بچنا ضروری ہے اور یہ وہ باتیں تھیں جن پر آج تک شعرائے اردو کاربند ہیں ۔ پہلوئے ذم پر ہر وقت نظر رکھنا ۔ بندش الفاظ کا سلیقہ فارسی ۔ ہندی الفاظ کی ترکیبوں کو ترک کرنا سب ناسخ اسکول ہی کی کوششیں تھیں ۔ ایسا نہیں ہے کہ ناسخ اسکول نے شعری صورتوں کو بہتر بنانے کی کوشش نہ کی ہو ۔ عبدالغفور نساخ اور محمد یحیی تنہا (مراۃ الشعراء) کی ناسخ اسکول کی شعری روایات پر تنقیدوں میں " ہمزش نیز بگو " بھی ہونا چاہئے تھا ۔ ناسخ اسکول نے بہت سے نئے الفاظ بھی وضع کئے جو ایک خاص سچویشن ہی میں استعمال ہوسکتے تھے ۔ نئے نئے محاورے بھی بنائے ۔ نازک خیالیوں کو بھی ترقی دی مگر یہ ساری کوششیں شعری تخلیقات کو عظمت نہیں بخش سکیں ۔ نہ ہی فکری سطح بلند ہوسکی ۔ میر انیس کے لئے یہ بھی ایک طرح کا ٹکراؤ تھا ۔ زبان و بیان اور جس زمینِ سخن کی باتیں میر انیس کرتے ہیں ۔ عجب نہیں کہ وہ ناسخ کے اسکول سے ایک چیلنج کے طور پر قبول کی گئی ہوں ۔ اسی وجہ سے میر انیس پر ناسخیت کے اثرات بھی کام کرنے لگتے ہیں ۔ تلوار کو دولہن بناکر پیش کرنے اور بہت سے اشعار اور مصرعوں میں دور کے عام مذاق کو قبول کرلنے میں ٹکراؤ بھی ہے اور مفاہمت بھی ۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

زیبا تھا دمِ جنگ ۔ پری وش اسے کہنا — معشوق بنی ۔ سرخ لباس اس نے جو پہنا

اس اوج پہ بھی سر کو جھکائے ہوئے رہنا — جوہر تھے کہ پہنے تھی دولہن پھولوں کا گہنا

سیبِ چمنِ خلد کی بو باس تھی پھل میں — رہتی تھی وہ شبیر سے دولھا کی بغل میں

چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے — چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارہ جیسے

برچھیاں چل گئیں اس پر جسے دیکھا بھالا — آگیا دام میں جس شخص پہ ڈورا ڈالا

یہاں ناسخ اسکول کی معاملہ بندی اور اس رنگین زندگی کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں جن سے لکھنو کی سماجی زندگی گزر رہی تھی ۔ میر انیس کے اسلاف کی مرثیہ گوئی میں یہ تصویریں یا ایسی کوششیں راقم کو کہیں نظر نہیں آئیں ۔

مرثیہ ایک بیانیہ شاعری ہے ۔ مگر یہ بیانیہ ایک خاص مقصد کے لئے مرکوز بیانیہ ۔ بنایا گیا تھا اس کی فضا میں ایک تقدس ۔ احترام اور بیانات کے بھی حدود تھے مگر لکھنؤ میں جو رنگ شاعری مطبوع ہورہا تھا ۔ اسے رد کرنا آسان نہیں تھا کہ اس نے الفاظ اور اظہاریت کے طریقوں میں ایک

خاص مزہ اور کسی حد تک ، ایک حسن تو پیدا ہی کیا تھا ۔ ٹکراؤ کی یہ صورت میر انیسؔ کے لئے خاصی پریشان کن تھی ۔ ناسخ اسکول کی چلائی ہوئی نئی ادبی آواہ گارد کو پس پشت ڈال دینا آسان نہ تھا ۔ ایسی صورت میں ایک مفاہمت لازمی سی بات تھی اور یہ مفاہمت میر انیسؔ نے کی بھی جیسا کہ تلوار کے سلسلے میں اوپر اشعار پیش کئے گئے ۔ رعایاتِ لفظی و معنوی، صنائع و بدائع کا محض الفاظ کا کھیل دکھانے والا استعمال بھی میر انیسؔ کے یہاں ملتا ہے جس کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جاچکا ہے ۔ دبدبہ ، اور توصیف ، کی بات بھی ، اسی فضا اور کیفیت سے نکلی تھی ۔ الفاظ کی بلند آہنگی اور اس کی شان و شوکت اور اردو شاعری میں قصیدے کی راہ سے داخل ہوئے تھے ۔ توصیف ، اگرچہ بعد کی کیفیت ہے مگر دبدبہ ، شعری صلاحیتوں کی تصدیق و تسلیم سے پیدا ہوتا ہے ۔ اور شعری تصدیق و تسلیم ، مروجہ رنگ شاعری پر یا تو فوقیت حاصل کرکے پیدا ہوتے ہیں یا رنگِ شاعری کو بہتر راستوں سے گزار کر ۔ میر انیس نے دونوں صورتوں کی تکمیل کی کوشش کی ہے ۔ دوسری صورت تو میرانیس کے نقادوں نے ہر موقعے پر بیان کی ہے ۔ مگر دبدبہ ، شاعری ، کی پہلی صورت ، اس طرح پیش کردیتے ہیں جیسے وہ محض اتفاقی (Casual) ہو ۔ راقم کا خیال ہے کہ یہ صورت اتفاقی نہیں ہے ۔ یہ بھی اس وقت کے نئے رنگ شاعری میں حصولِ سبقت یا کم از کم مماثلت کی کوششیں ہیں ۔ توانائی اضافت ، الفاظ کی شوکت ، اور ان کے اجتماع سے پیدا ہونے والی آوازوں میں اندرونی مہارت اور ظاہری ہئیت ، قصیدے کی طرح شکوہ الفاظ کی طرف رغبت اور خود اپنا Plantioc Number flow والا خاندانی سلیقہ ، ان سب کے اظہار سے میر انیس نے اپنے دبدبہ ، شعری کی تکمیل کی تھی جو رنگ زمانہ سے مقابل ہوکر اپنی انفرادیت منوانے کی کوشش کرتا ہے اور اسی سلیقے سے میر انیس کا شعری برتاؤ (Poetic Behaviour) ناسخیت پر غالب بھی آتا ہے اور ان سے بہت آگے بڑھ جاتا ہے اور انتخاب ، اظہاریت اور شوکتِ الفاظ کی اپنی ایک الگ دنیا بھی بناتا جاتا ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔

میں ہوں سردارِ شبابِ چمنِ خلدِ بریں ۔۔۔ میں ہوں خالق کی قسم دوشِ محمد کا مکیں
میں ہوں ، انگشترِ پیمبر خاتم کا نگیں ۔۔۔ مجھ سے روشن ہے جہاں ، مجھ سے منور ہے زمیں
بالا قد و کلفت و تنومند خیرہ سر ۔۔۔ روئیں تن و سیاہ دروں آہنی کمر

ہے فصل ہے وصیِ نبیؑ مالک الرقاب　ضرغامِ دیں، مدینۂ علمِ نبیؑ کا باب
کہف الوریٰ، سراجِ ہدیٰ حجت خدا

وہ تخشع، وہ تضرع، وہ قیام اور قعود　وہ تذلل، وہ دعائیں، وہ رکوع اور وہ سجود

ابرِ کرم، خدیوِ عجم، خسروِ عرب　عالی ہمم، امامِ امم، شاہ تشنہ لب

کوتاہ و گردِ صاف، کنوتی۔ کمر۔ کفل　کیا خوشنما کشادگی، و سینہ و بغل

سیماب کی طرح نہیں آرام ایک پل　پھرتا تھا اس طرح کہ پھرے جس طرح سے کل

راکب نے سانس لی کہ وہ کوسوں روانہ تھا　تارِ نفس بھی اس کے لئے تازیانہ تھا

پھر آؤں مثلِ حکمِ خدا کائنات میں　پر کیا کروں کہ باگ ہے صابر کے ہاتھ میں

گھوڑے کی یہ تمام کیفیتیں کم و بیش، سودا اور ذوق کے قصیدوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ سودا کے قصیدے " سنگ کو اتنے لئے کرتا ہے پانی آسماں " میں اس محیرالعقول حد تک سرعت کا بیان مل جائے گا۔

ٹک اچک جاوے عناں اس کی جو قاشِ زین ہے
اس طرح اڑ جائے جوں چہرے سے رنگِ عاشقاں

اور " ہاتھوں پہ ہو گر جام لباب تو نہ چھلکے " میں، مرکب کی سبک روی کے لئے بھی قصائد میں بڑے تراشیدہ اشعار مل جاتے ہیں۔ راقم کا خیال ہے کہ دبدبہ کے لئے قصیدوں پر میر انیس کی نظر تھی۔ خصوصاً جب حضرت امام حسینؑ کے گھوڑے کی تعریف یا کردار حسینی یا جنگ کے موقعوں پر تلوار کی کاٹ کی خوبیاں بیان ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی ان صورتوں کے لئے دبیر بھی ایک چیلنج بنتے تھے جیسا کہ شبلی اور دوسرے ناقدین نے متحد الخیال مضامین کے لئے لکھا ہے۔ دبیر پر بھی ناسخ اسکول کا اثر ایجابی صورت میں تھا۔ دبیر سے مقابلے کی بات ناسخیت ہی کے مقابلے میں محض مستزاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ شاید لوگ موازنہ، میں بہت زیادہ الجھ گئے۔ اور ردو الموازنہ، المیزان، اور موازنہ، سے متعلق دیگر بحثوں نے اس وقت کے لسانی آہنگ، تقلید، انکار اور میر انیس اور ان کے متبعین کے ذریعہ لکھنو کے لسانی ڈھانچے اور الفاظ و اصوات کی دنیا میں جو ایک تبدیلی آرہی تھی اس پر نہ کسی نے کوئی خاص دھیان دیا اور نہ اس کا کوئی سائنٹفک ڈھنگ کا محاسبہ ہوا۔

لیکن اگر واقعی میر انیس اپنی اتنی بڑی تخلیقی قوت محض دبیر سے مقابلے کے لئے صرف کر رہے تھے تو یہ بہت معمولی سی بات ہوئی۔ جس کی انیس جیسے عظیم فنکار سے توقع نہیں کرنی چاہئے۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ تقابلی صورتیں، مضامین اور الفاظ کے صرف میں پیدا ہو بھی گئی ہیں۔ مگر خالی، انھیں صورتوں کو میر انیس کا شعری اور تخلیقی نصب العین سمجھنا، میر انیس کے ساتھ نہ تو انصاف ہے اور نہ ان کے تخلیقی سرمایے کا کوئی اچھا محاسبہ

میر انیسؔ نے اپنی زبان اور اپنی شاعری کی دنیا بہت کچھ خود بنائی تھی اگرچہ انھوں نے ازاراہ انکسار کہا یہی ہے کہ "حقا کہ یہ خلیق کی ہے سربسر زبان"۔ مگر جو بھی میر انیس کی زبان کو لسانیاتی معیار پر پرکھے گا اسے میر خلیق اور میر انیس کی زبان، اس کے صرف، اس کی مختلف الجہاتی یا ابعاد (Dimension) میں بڑا فرق نظر آئے گا۔ یہ بات محلِ نظر ہے۔ خلیق کے مرثیوں کی زبان میں سادگی تو ضرور ہے مگر اس میں دہلوی زبان کا پس خوردہ بھی ہے۔ مثلا ان کے یہاں وہ تمام متروکات مل جاتے ہیں جو لکھنؤ میں مروج نہیں رہ گئے تھے۔ خود دہلوی شعراء، جو لکھنؤ میں آکر بس گئے تھے وہ بھی ان متروکات کو چھوڑ چکے تھے جیسے

ہوویں، وِلے، کبھو، دیویں گے، ٹک، آن کر یہ جاوے گی، کبھو، دیکھو، بچو، ووہیں، کے تئیں، لوہو میں ڈبایا، مائی، جائے عجب، دھڑکے ہے، آئیو، تم پاس، نِت وغیرہ۔

میر انیس نے کہیں کہیں اپنے ابتدائی مرثیوں میں ایسی زبان سے کچھ الفاظ لئے بھی ہیں جیسے

- کمتی نہیں پانی کی سلامت رہیں عباس
- اس پر بھی تشنگی میں نہ تسکیں ذری ہوئی
- ہتھوانس کے تیغ، اکبر مہ رو یہ پکارے
- بیٹھ جاؤ وہیں مجلس میں جہاں جاگہ ملے

مگر مجموعی طور سے ان پر لکھنؤ میں نئی بنی ہوئی زبان اور اس زبان سے پیدا ہونے والی طرفگی کے اثرات ہیں جسے میر انیسؔ نے چھان پھٹک کر اپنے مزاج اور اپنے لسانی رویوں میں ڈھال لیا تھا۔ تاہم ان کا مالِ شعری اور مقصدِ شاعری، سامعین کو کیسے چھوڑ سکتا تھا جسے آج کی تنقیدی زبان میں قاری اساس شاعری کہہ سکتے ہیں کیوں کہ انھیں سامعین کے لئے ہی تو مرثیے کی شعری بساط بچھائی گئی تھی شاید یہی سبب ہے کہ مرثیے کے حزنیہ ماحول میں دور کے شعری مذاق کی گوارا صورتوں کو

میر انیس نے قبول کرلیا تھا۔ ان کے الفاظ اور کبھی کبھی اشاروں میں وہ صورتیں ابھرتی ہیں جو تغزل کے ماحول سے آئی تھیں کہ سامعین کو باندھے رکھنے کے لئے یہ ناگزیر بھی تھا۔ ان میں سے کچھ باتیں تلوار کے سلسلے میں پچھلے صفحات میں کہی جاچکی ہیں۔ مزید مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ع ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے ۔۔۔ بل کھا کے زلف رخ پہ کسی کی اکڑ گئی

ع غصے سے آفتاب ہوئے مہوشوں کے رنگ ۔۔۔ بسمل پہ کیا گزر گئی قاتل کو کیا خبر

ع پریوں کے غول تخت سلیماں کے ساتھ ہیں ۔۔۔ خورشید محو حسن حُسینِ حسین ہوا

ع وہ زلف و رخ وہ پیار کی باتیں کدھر گئیں ۔۔۔ کشمکش تھی کہ عرق میں گل تر ڈوب گیا

وغیرہ ایسی صورتیں اور کیفیات ہیں جنھیں غزل اور علی الخصوص اس وقت کے لکھنؤ کی غزل کے ماحول کا دباؤ سمجھنا چاہئے اور بس۔ میر انیس کے دعوے "رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری" کو بس اسی دباؤ تک محدود رکھنا چاہئے۔ جسے انیس کے بعد کے مرثیہ نگار، ایک شگوفہ سمجھ کر ساقی نامہ، شب ہجر کی کیفیات، گلا کاٹ کر کے مرجانے کی خواہش، بلبل اور گل کے بوس و کنار کے مناظر، اور غزل کے دوسرے لوازم تک کھنچتے چلے گئے۔

آئندہ شمارہ نمبر ۱۳۳ ایک جھلک

فکشن

۱- منی افسانے (غمگسار۔روح کا کرب۔ریت کی دیوار۔المیہ۔بولتی خاموشی۔جرم او نچائی نجات۔اصول ———— مبینہ امام

۲- مسرت (ہندی کہانی) ———— مکتی ورما

۳- سوالیہ نشان ———— قمر جمالی

۴- پنجرہ ———— محمود شکیل

۵- پری کتھا ———— محمود ایوبی

۶- سندھائن ———— ڈاکٹر محمد مظفرالدین فاروقی

۷- شوراتری ———— قیصر تمکین

۸- دروازہ ———— محمود حامد

۹- شکنتلا ———— غزال ضیغم

۱۰- سُرمئی ہیولا ———— مصطفٰی شہاب

تمثیل

موت پر فتح ———— جیالال ساز

کال چکر ———— بلراج ورما

شعرونغمہ

نظمیں: ستیہ پال آنند۔ابراہیم اشک۔محسن جلگانوی۔رؤف خیر۔حسن فرخ۔مومن خان شوق

غزلیں: راشد آذر۔رؤف خلش۔علی ظہیر۔کلدیپ گوہر۔عاجز ہنگنگھاٹی۔غوث محمد غوثی شہزاد۔شان بھارتی۔عبرت بہرائچی۔یوگندر بہل تشنہ۔ذکی طارق۔فاروق شکیل۔اخلاق۔ شفیع اللہ خاں راز۔شاہد کلیم۔جمیل شاد

نقد حافظ شیرازی

ابراہیم اشک

اردو زبان و ادب میں دیوان غالب کی جتنی شرحیں لکھی گئی ہیں شاید ہی کسی دیگر زبان و ادب کے عظیم شاعر کو سمجھنے اور پرکھنے کی غرض سے اس طرح کا کام ہوا ہو ۔ غالب کے بعد کسی حد تک شاعر مشرق علامہ اقبال کی شاعری کو یہ مرتبہ حاصل ہے کہ اس کی جانچ پرکھ سب سے زیادہ کی گئی ہے ۔

ہندوستان کے فارسی شعراء میں امیر خسرو، عبدالقادر بیدلؔ، ملا فیضیؔ اور غنی کاشمیری کا گراں قدر سرمایہ ختم ہوتا جارہا ہے ۔ بیدل کے ایک لاکھ سے زیادہ اشعار نایاب ہوکر رہ گئے ہیں ۔ یہ اس ملک اور قوم کی بد نصیبی ہے ۔ دنیائے ادب میں بیدل کالیداس، بھرتری ہری، شیکسپیر، گوئٹے، فردوسی، حافظ، سعدی اور مولانا روم سے کسی طرح کم درجہ کا شاعر نہیں ہے ۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے اتنے عظیم شاعر کا کلام آج محفوظ نہیں ہے ۔ کسی محقق نے اس طرف دھیان نہیں دیا ۔ بیدل پر تحقیق ضروری ہے کہ اسے پڑھ کر غالب کے فکر و خیال روشن ہوئے ہیں ۔ بیدل کا کلیات اور اس کا ہندوستان کی زبانوں میں ترجمہ بھی ضروری ہے ۔ یہ کام ہماری حکومت کو کرنا چاہئے ۔ غالب پرستوں کو کرنا چاہئے ان اداروں کو کرنا چاہئے جو غالب کے نام سے منسوب ہیں ۔ اس سے اردو زبان و ادب کی وسعت و عظمت کا سرمایہ بڑھے گا ۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ آنے والی نسلیں بیدل کی شاعرانہ عظمت سے فیض یاب ہونگی یہ بھی ممکن ہے کہ ان نسلوں میں سے کچھ ایسے شعرا بھی پیدا ہوجائیں جو اپنے عہد کے غالب ثابت ہوں ۔ اپنی

☆ ۴۰۲، بل دیو اپارٹمنٹ، رشید کمپاؤنڈ، کاؤسا، ممبرا، ضلع تھانہ، (مہاراشٹرا) ۴۰۰۶۱۲

آئندہ نسلوں کے لئے یہ کام نہایت ضروری ہے ۔ بیدل کی شاعری کی مکمل تلاش ہونا چاہیے سرسری حوالہ دینے سے کوئی خاص بات نہ تو اب تک بنی ہے۔ نہ ہی آئندہ بنے گی۔

حافظ شیرازی بھی اردو کے عظیم شعراء کا محبوب شاعر رہا ہے ۔ اس پر بھی کام ہونا لازمی ہے ۔ یونیورسٹی میں جہاں جہاں بھی فارسی کی تعلیم دی جاتی ہے ۔ ان کے لئے شرحِ دیوانِ حافظ کا تو کم از کم انتظام ہونا لازمی کردینا چاہیئے ۔ حافظ پر سرسری مضامین لکھنا اور کوئی آدھی ادھوری کتاب لکھ کر انگلی کٹاکر شہیدوں میں نام لکھوانا کافی نہیں ہے ۔ دراصل ان شعراء پر اسی طرح کام ہونا چاہیئے جس طرح غالب اور اقبال پر ہوتا رہا ہے ۔ بلکہ میں تو یہی کہوں گا غالب اور اقبال پر تو اتنا زیادہ لکھا جاچکا ہے کہ کوئی گوشہ باقی بچا ہی نہیں ہے مزید کچھ لکھنا وہی پرانی باتوں کو دوہرانا ہے ۔ لیکن ان فارسی شعراء پر جو بھی تحقیق اور تنقید لکھی جائے گی وہ سرمایہ اردو زبان و ادب کے لئے قطعی نیا ہوگا اور اس کی قدر و قیمت بھی سرسری نہ ہوکر بڑی اہم ہوگی۔ شرح اشعار حافظ لکھنے کا خیال میری اسی سوچ کا سبب ہے ۔

حافظ شیرازی کا جو بھی شعر مجھے پسند آیا ہے اس کی شرح میں اردو زبان و ادب کے لئے پیش کررہا ہوں ۔ مقصد یہی ہے کہ میرے ہم عصر اور اردو کی آئندہ نسلیں اس سے فیض یاب ہوں اور فارسی زبان و ادب کے اس گراں قدر سرمایہ سے ہم بیگانہ نہ رہیں ۔ دیوان حافظ کی پہلی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو ۔ اس کا مصرع اولیٰ عربی زبان میں ہے جبکہ مصرع ثانی زبان فارسی میں ۔

الا یا ایھا الساقی آدر کا سا و ناولہا
کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

حافظ کہتا ہے ابتداء میں عشق بہت اسان معلوم ہورہا تھا لیکن جلد ہی مشکلیں سر پر آن پڑیں اس لئے اے ساقی تو ہوشیار ہوجا اور جام شراب کو گردش میں لاکہ اس کی گردش ہی عشق کی مشکلوں کا واحد حل ہے ۔ حافظ سرمستی و سرور اور کیف و نشاط کا شاعر ہے ۔ اپنے دیوان کے پہلے مطلع ہی میں اس نے اس بات کا صاف طور پر اعلان کردیا ہے ۔ عشق اس کی زندگی کا مقصد ہے ۔ عشق کی دشواریوں میں جام شراب کے سرور سے وہ زندگی کا اصل مزا اٹھانا اور اس کے ایک ایک لمحہ کو جاوداں بنادینا چاہتا ہے ۔

اگر آں ترُک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

حافظ کا یہ شعر بڑا ہی مقبول اور مشہور ہے ۔ وہ کہتا ہے اگر شیراز کا محبوب اپنے ہاتھوں سے مرے دل کو تھام لے یعنی میری محبت کو قبول کر لے تو اس کے رخسار کے تل پر میں سمرقند اور بخارا جیسے خوبصورت شہروں کو قربان کردوں گا ۔ معشوق کا تل سیہ ہے اور سیاہی کو برا مانا جاتا ہے لیکن محبوب کی ذرا سی برائی کی قدر وقیمت بھی حافظ کی نظر میں کتنی اعلیٰ درجہ کی ہے۔ تو پھر اس کے حسن اور خوبیوں کا تو کہنا ہی کیا ہے ۔

اس شعر سے ایک تاریخی واقعہ بھی جڑا ہوا ۔ بادشاہ تیمور نے ایک بار شیراز پر حملہ کردیا ۔ اس حملہ میں شیراز کا حکمراں منصور جنگ کے دوران قتل کردیا گیا ۔ تیمور حافظ شیرازی کے شاعرانہ رتبہ سے واقف تھا ۔ وہ بڑے ہی التفات سے حافظ سے ملا اور کہنے لگا کہ میں نے اپنے وطن کے شہروں سمرقند و بخارا کو آباد کرنے میں نہ جانے کتنے ملکوں کو روند ڈالا ہے اور ایک آپ ہیں کہ ان شہروں کو شیراز کے محبوب کے ایک ہی تل پر لٹا دینا چاہتے ہیں ۔ حافظ بڑا ہی بذلہ سنج اور حاضر جواب تھا ۔ اس نے تیمور سے کہا کہ حضور انھیں فضول خرچیوں کے سبب ہی تو میں فاقہ مستی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں ۔

غزل گفتی و در سفتی بیا و خوش بخواں حافظ
کہ برنظمِ تو افشاند فلک عقد ثریا را

یعنی حافظ غزل اس طرح کہتا ہے کہ جیسے ایک لڑی میں در نایاب پروتا ہے ۔ موتیوں کا ہار بناتا ہے ۔ وہ خود سے کہتا ہے کہ اب اسے خوش بیانی کے ساتھ پڑھ ۔ کیونکہ جب تو غزل پڑھے گا تو آسمان ثریا کے ہار تجھ پر نچھاور کرنے لگے گا ۔ شعر میں الفاظ کا ترنم صاف محسوس کیا جاسکتا ہے ۔ اس ترنم کو اگر خوش بیانی کے ساتھ پیش کیا جائے تو واقعی ایک ایسی دلکش اور بیخود کردینے والی فضا قائم ہوجائے گی جس پر کوئی بھی وجد میں آکر اپنا سب کچھ لٹادینے پر مجبور ہوجائے گا ۔ حافظ کی غزل غنائیت سے بھرپور ہے ۔ اس میں سادگی بھی ہے اور پرُکاری بھی ۔ یہ سادگی بیدل کے کلام میں نہیں ملتی اس کے یہاں معنی آفرینی زیادہ ہے ۔ اسے ہم گنجینۂ معنی کا طلسم کہہ سکتے ہیں ۔ لیکن

حافظ کی غزل میں ایک سریلا پن ہے، ترنم ہے، موسیقی ہے اور یہ موسیقی سحر انگیز اور دل گداز ہے۔

دل می رود زدستم صاحب دلاں خدارا
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

اے دل والو! میرے ہاتھ سے دل نکلا چلا جاتا ہے، خدا خیر کرے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ دل کے ہاتھ سے جاتے ہی جو راز اس دل میں اب تک چھپا ہوا تھا۔ وہ سب پر آشکار ہوجائے گا۔ دنیا جان لے گی یعنی عشق ہوتے ہی بدنامی کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔

اس مطلع کا استعمال فلم ہدایت کار کریم آصف نے اپنی فلم "مغل اعظم" میں موقع کی مناسبت سے بہت ہی عمدہ کیا تھا۔ انار کلی اور سلیم میں محبت ہو جاتی ہے۔ انار کلی دیوان حافظ سے فال نکالتی ہے۔ اس کی چھوٹی بہن اس کے پاس موجود ہے۔ انار کلی شعر پڑھتی ہے اس کی بہن اس سے شعر کا مفہوم پوچھتی ہے اور انار کلی اسے مفہوم بتاتی ہے۔ وجاہت مرزا نے اس کا منظر نامہ خوب لکھا تھا اور دیوان حافظ سے فال نکالنے کی روایت کو بخوبی پیش کیا تھا۔

یوں دیکھا جائے تو حافظ دنیا کا وہ پہلا عظیم شاعر ہے جسے لسان الغیب سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کی شاعری میں خدائی جذبہ موجود ہے جو آئندہ واقعات کی خبر دیتا ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ یہ عظیم شاعر بھی اپنے عہد اور خاص طور سے اپنے عہد کے ہم عصروں کی ناقدر شناسی کا شکار رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتی ہیں لیکن یہ بات بھی صاف طور پر کہی جاسکتی ہے کہ جن ہم عصروں نے حافظ کی عظمت کا اعتراف نہیں کیا وہ تمام صفحہ ہستی سے ایسے مٹے کہ آج ان کا نام لیوا تک کوئی موجود نہیں ہے جبکہ حافظ کے شعر و سخن کا چرچا رہتی دنیا تک ہوتا ہی رہے گا۔ اگلا شعر ملاحظہ ہو:

اربابِ خرد ذوقِ مے عشق چہ دانند
از حالتِ مانیست خبر بے خبراں را

شاعر کہتا ہے کہ جو لوگ عقل مندی کا دعوی کرتے ہیں وہ کیا جانیں کہ عشق کی شراب میں کیا لطف ہے۔ یہ لوگ تو بے خبر ہیں۔ انھیں ہماری حالت کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ صاف ظاہر ہے کہ عشق کے لئے ہوش و خرد کی ضرورت نہیں ہوتی اس میں تو بے خطر کود پڑنا ہی اپنی منزل

کو پانا ہے ۔ عشق کی دنیا میں عقل کی کارگردی بے خبری سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے ۔ ڈاکٹر اقبال کا ایک شعر اس کی وضاحت کے لئے پیش کیا جاسکتا ہے ؂

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

حافظ کے یہاں عشق کی معراج سرمستی اور بیخودی ہے اسی لئے اس نے اربابِ خرد کو بے خبراں کہا ہے ؂

جز ایں قدر نتواں گفت در جمال تو عیب
کہ خال مہر و وفا نیست روئے زیبا را

حافظ کہتا ہے کہ اے میرے محبوب میں جب تیرے چہرے کو دیکھتا ہوں تو مجھے خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں ۔ علاوہ اس کے کوئی عیب نظر نہیں آتا کہ اس حسین چہرے میں ایک مہر و وفا کا تل بھی نہیں ہے ۔ حافظ نے یہ شعر بڑی خوبی سے کہا ہے اور اسے گنجینۂ معنی بنادیا ہے ۔ جتنا اس شعر کی تہ میں جائیے اتنا ہی لطف حاصل ہوتا ہے ۔ مہر و وفا کے ایک تل نے اس شعر کو بڑی وسعت بھی دی ہے ۔ یعنی تجھ میں بے پناہ خوبیاں ہیں لیکن ایک تل کے برابر بھی برائی نہیں ہے ۔ کیونکہ تل کالا ہوتا ہے ۔ اور سیہ رنگ برائی کی علامت ہے ۔ اس لئے اے مرے محبوب تجھ میں تو ایک تل کے برابر بھی برائی مجھے نظر نہیں آتی ۔

دوسرے معنی اس شعر کے یہ ہیں کہ اے میرے محبوب تو بڑی خوبیوں والا ہے ۔ کاش ان خوبیوں میں تل کے برابر بھی مہر و وفا تجھ میں ہوتی تو تیرا حسن دوبالا ہوجاتا لیکن افسوس کہ تجھ میں تو ایک تل کے برابر بھی مہر و وفا نہیں ہے ۔ تل کالا ہونے کے باوجود حسن کو بڑھاتا بھی ہے ۔ حافظ نے "خالِ مہر و وفا" کہہ کر اپنے کمال فن کا ثبوت دیا ہے ۔

اس شعر سے یہ مراد بھی لی جاسکتی ہے کہ اے مرے محبوب تجھ میں لاکھ خوبیاں سہی لیکن مہر و وفا تو تل بھر بھی نہیں ہے اس لئے تیری تمام خوبیاں بے معنی ہوکر رہ گئی ہیں ۔ ایک بات اور وہ یہ کہ خوبیوں کا اندازہ کسی خرابی کے بعد ہی لگایا جاسکتا ہے اگر کوئی خرابی سرے سے ہی ہے نہیں تو خوبیوں کا احساس کیسے ہو ؟ اس لئے مہر و وفا کا ایک تل ہونا ضروری تھا ۔

حافظ کے اس بے پناہ شعر کے لئے کہا جاسکتا ہے ؎

شعر میرا ہے برنگ گل صد برگ چمن
دیکھنے والے نے ہر لطف نظر سے دیکھا

جتنی بھی داد دی جائے کم ہے ؎

دنیا ست باغ کہنہ و انساں جو نو گلند
ہریک ز شاخ عمر کند باغباں ۔ جدا

حافظ کہتا ہے یہ دنیا کیا ہے ؟ ایک پرانا باغ ہے ۔ یہاں انسانوں کی شکل میں نئے نئے پھول کھلتے ہیں ۔ اس باغ کا ایک مالی ہے اور وہ خدا ہے ۔ جس طرح باغ کا مالی اپنے باغیچے سے نئے نئے پھولوں کو چن لیتا ہے اور شاخوں سے جدا کر دیتا ہے ۔ اسی طرح عمر کی شاخ سے انسانوں کو بھی خدا جدا کر دیتا ہے ۔ جس طرح مالی وقت سے پہلے ہی پھولوں کو توڑلیتا ہے اسی طرح خدا بھی عمر سے پہلے ہی کئی انسانوں کو موت دے دیتا ہے ۔ زندگی کا فلسفہ حافظ نے بہت ہی اچھی دلیل دے کر بیان کیا ہے۔ مجھے ایسا ہی ایک ہندی کا دوہا یاد آرہا ہے جو شاید کبیرداس کا ہے ۔ پیش کررہا ہوں ۔ ملاحظہ ہو ؎

مالی آوت دیکھ کے کلیَن کری پکار
پھولے پھولے چن لئے کال ہماری بار

یعنی باغ میں مالی کو آتا ہوا دیکھ کر کلیاں تمام یہ پکارنے لگیں کہ مالی نے آج کھلے ہوئے سارے پھولوں کو چن لیا ہے کل تک ہم بھی کھل جائیں گی اور تب ہمیں بھی اسی طرح مالی شاخوں سے توڑ لے گا ؎

کہ اے بلند نظر شاہباز سدرہ نشیں
نشیمن تو نہ ایں کنج محنت آبادست

شاعر کہتا ہے اے بلند نظر شاہباز تیرا مقام تو ساتویں آسمان کی بیری کے درخت پر ہے جہاں حضرت جبرئیل رہتے ہیں ۔ تیرا نشیمن اس کنج محنت آباد یعنی دنیا میں نہیں ہے ۔ یعنی جو بلند نظر ہوتا ہے وہ آفاق میں گم رہتا ہے ۔ ڈاکٹر اقبال نے اپنے اشعار میں اس خیال کو بخوبی بیان کیا ہے ؎

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

لیکن حافظ کا شعر اقبال کے شعر کے مقابلے میں زیادہ بلند ہے۔ اس نے بلند نظر شاہباز کو سدرہ نشین کہا ہے۔

یک قصہ بیش نیست غم عشق و ایں عجیب
از ہر کسیکہ می شنوم نا مکرر ست

برسوں پہلے جب میں دہلی میں تھا تو ایک کتاب "حافظ اور اقبال" میرے مطالعہ میں آئی جس کے مصنف تھے یوسف حسین خاں۔ اس شعر کی سرسری شرح اس میں موجود ہے۔ اس میں جو شعر درج ہے وہ غلط ہے اور میں نے وہ غلط شعر ہی یاد کرلیا تھا۔ اب جب کہ "دیوان حافظ" کا مطالعہ کیا اور اشعار کی شرح لکھنے بیٹھا تو صحیح شعر کا علم ہوا۔ "حافظ اور اقبال" ص ۶۰ پر یہ شعر یوں درج ہے:

یک قصہ بیش نیست غم عشق ویں عجب
کزہر زباں کہ میشنوم نامکرر است

ظاہر ہے کہ شعر نقل کرنے میں تین چار جگہ غلطیاں موجود ہیں۔ یہ حافظ کے شعر کے ساتھ کھلواڑ ہے ایسا ہونا نہیں چاہئے۔ شرح یہ لکھی گئی ہے کہ جس طرح روحانی تجلیات میں تکرار نہیں اسی طرح محبت کے تجربے میں تکرار نہیں ہوتی۔ محبت کی کہانی کو ہر ایک اپنے تجربے کی رو سے اپنے انداز میں بیان کرتا ہے۔ جب شعر ہی غلط نقل کیا جائے تو شرح بھی غلط ہی ہوگی۔ صحیح شرح ملاحظہ ہو۔

یہ تعجب کی بات ہے کہ غم عشق محض ایک کہانی سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ میں جس کسی سے بھی یہ کہانی سنتا ہوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس میں کوئی بات دہرائی نہیں گئی ہے یعنی کہانی تازہ بہ تازہ ہوتی چلی جاتی ہے اور ہر بار ایک نیا لطف اس میں پیدا ہوجاتا ہے۔ "نا مکرر ست" کہہ کر حافظ نے جو وسعت اس شعر کو دی ہے اس نے ایک نیا لطف پیدا کردیا ہے۔

زلفِ مشکینِ تو در گلشنِ فردوسِ عذار
چیست طاوس کہ درباغِ نعیم افتادہ است

اس شعر میں حافظ نے تشبیہ کے استعمال کا خوب ہنر دکھایا ہے ۔ وہ کہتا ہے اے میرے محبوب تیرے رخسار پر بکھرنے والی تیری زلف کا سماں بڑا ہی عجیب ہے ۔ مجھے یہ دیکھ کر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ رخسار کی جنت کے اس باغ میں بھولے سے کوئی مور آگیا ہے جو جنت النعیم کی سیر کرنے میں مگن ہے ۔ محبوب کے رخسار کو جنت کیوں کہا گیا ہے اس پر غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں آنکھوں کی جھیلیں بھی ہیں اور ہونٹوں کی کلیاں اور پھول بھی ہیں ۔ باغ میں یہی سب چیزیں ہوتی ہیں ۔ کئی بار حافظ بغیر کہے بھی شعر میں ان باتوں کی طرف اشارہ کردیتا ہے جن کی تہہ میں شعر کا حسن چھپا ہوتا ہے ۔ چونکہ باغ خوش نما ہوتا ہے اس لئے اسے محبوب کے رخسار سے تشبیہہ دی گئی ہے اور مور چونکہ سیہ ہوتا ہے اس لئے اسے زلف سے ۔ یہ حافظ کی سوجھ بوجھ کا ثبوت ہے ۔

دریں زمانہ رفیقے کی خالی از خلل ست
صراحیٔ مۓ ناب و سفینۂ غزل ست

حافظ شیرازی کا یہ شعر بہت مقبول ہے ۔ اس میں اس نے بڑی ہی پیاری سی بات کہی ہے ۔ یہ دنیا جہاں میں کوئی سچا دوست نہیں ملتا ہے ۔ یہاں اگر خرابی سے خالی کوئی دوست ہے تو بس خالص شراب کی صراحی اور غزل کی کتاب ہے ۔ یعنی مستی اور علم و ادب ہی انسان کے سچے دوست ہیں ۔ باقی تمام خرابیوں سے پُر ہیں ۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ رندی و سرمستی اور علم ایسے دوست ہیں جو انسان کو دنیا کی تمام خرابیوں سے بچالیتے ہیں ۔ جو سچے دوست نہیں ہوتے وہ خرابیاں ہی پیدا کرتے ہیں ۔

سیاہ نامہ ترا ز خود کسے نہ می بینم
چگونہ چوں قلمم دود دل بسر نرود

حافظ کہتا ہے کہ میں نے اپنے سے زیادہ سیاہ نامہ ۔ اعمال والا کسی کو نہیں دیکھا ۔ یہ سب میرے جلتے ہوئے دل سے اٹھتے ہوئے دھویں کی وجہ سے ہے ۔ حالت اب یہ ہوگئی ہے کہ جس طرح قلم کی روشنائی ختم نہیں ہوتی ہے اسی طرح میرے سیاہ کارنامے بھی ختم ہونے والے نہیں ہیں ۔ حافظ کے شعر کے مصرع اولیٰ کا خیال ہندوستان کے شاعر کبیرداس نے اپنے دوہے میں بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔

برا جو دیکھن میں چلا ۰ برا نہ ملیا کوئے
جو دل کھوجا آپنا ۰ مجھ سا برا نہ کوئے

کبیر داس کا یہ دوہا مقبول عام ہے ۔ حافظ کا اگلا شعر ملاحظہ ہو ۔

عدو باجانِ حافظ آں نہ کردے
کہ تیرِ چشمِ آں ابرو کماں کردے

حافظ کہتا ہے کہ میری جان کے ساتھ جو سلوک تو نے کیا ہے وہ تو کوئی دشمن بھی نہیں کرتا کیونکہ دشمن جان لے لیتا لیکن تیری کمان والی آنکھ کے تیر نے مجھے نیم بسمل بنا کر چھوڑ دیا ہے یہ جان دے دینے سے زیادہ تکلیف دہ ہے ۔ کیونکہ نیم بسمل تو مسلسل تڑپتا رہتا ہے اور درد سے نجات نہیں پاتا ہے ۔ مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب نے اس موضوع پر بڑا ہی اچھا شعر کہا ہے جس کی مقبولیت آفتاب و ماہتاب کی سی ہے ۔ شعر ملاحظہ ہو ۔

کوئی میرے دل سے پوچھے تر ترے نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

حافظ نے جہاں اپنی بات ادھوری چھوڑ کر موضوع کی طرف اشارہ کر دیا ہے وہیں غالب نے پوری بات کو واضح کر دیا ہے ۔ غالب نے خاص طور سے "تیرنیم کش" کہہ کر اس شعر کو زمین سے آسمان کی بلندی پر پہنچا دیا ہے ۔ یہ خوبی حافظ کے شعر میں اجاگر نہیں ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شعریت اور معنویت کے اعتبار سے غالب کا شعر زیادہ بہتر ہے ۔

کیوں نہ حافظ کے چند ایسے اشعار پیش کئے جائیں جن سے اس کے عہد کی تاریخ کا کوئی نہ کوئی واقعہ جڑا ہوا ہے ۔ اس سے جہاں شاعر کے حالات اور مزاج کا اندازہ ہوگا وہیں اس کے تخلیقی سفر کے رنگارنگ واقعات کا اس کی زندگی پر کیا اثر ہوا ہے اس بات کو بخوبی سمجھنے میں مدد بھی ملے گی ۔

دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد
بمے بفروش دلقِ ماکزیں بہتر نمی ارزد

بادشاہ دکن شاہ محمود نے حافظ شیرازی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی وہ شیراز سے

چل پڑے لیکن راستے میں سمندر کی طوفانی لہریں دیکھ کر واپس پلٹ گئے اور شیراز چلے گئے۔ ایک قصیدہ شاہ محمود کو لکھ کر بھیج دیا یہ مطلع اسی تاریخی قصیدے کا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر پوری دنیا مل رہی ہو اور اس کے بدلے میں تھوڑا سا غم برداشت کرنا ہو تو میں اس کے لئے بھی راضی نہیں ہوؤں گا۔ مجھے اپنی گدڑی شراب کے عوض بیچ کر اپنی دنیا میں مست رہنا ہے۔ زیادہ کی خواہش میں اپنی ذرا سی مستی کو میں قربان نہیں کرسکتا۔ اس غزل کا مقطع بھی خوب کیا ہے۔

چو حافظ در قناعت کوش و از دنیائے دوں بگذر

کہ یک جو منت دوناں بصد من زر نمی ارزد

صبر و شکر قلندروں کی فطرت میں ہوتا ہے۔ حافظ کی زندگی پر بھی اگر ہم ایک نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اعلیٰ درجہ کا قلندر تھا اور اپنی شاعری میں بھی جگہ جگہ اس نے اس کا ثبوت پیش کیا ہے اور صبر و شکر، قناعت کا پیغام دنیا کو دیا ہے۔ اس پورے قصیدے میں اس کی قناعت پسندی صاف طور پر ظاہر ہوئی ہے۔ یہ مقطع بھی اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

حافظ کہتا ہے: میری طرح قناعت سے زندگی گزارنے کی کوشش کر اور اس دنیا سے گزر جا۔ کیونکہ یہ دنیا کمینی ہے، یہاں لینے والے کمینوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک احسان بھی اگر کرتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے انھوں نے ایک من سونا دے کر مدد کی ہو۔ بڑا ہی سبق دینے والا شعر ہے۔ اس میں حافظ کی خودداری اور غیرت مندی کا بخوبی اظہار ہوا ہے۔ اس واقعہ کے بعد حافظ نے دوبارہ ہندوستان آنے کی پھر کبھی کوشش نہیں کی اور شیراز کے گوشہ، عافیت میں گنج قناعت کے سہارے اپنی تمام عمر شعر و سخن کی خدمت کرتے ہوئے گزار دی۔

حافظ کے دو بیٹے تھے بڑا بیٹا شاہ نعمان دکن سے دھلی جاتے وقت برہانپور مدھیہ پردیش میں انتقال کرگیا وہیں قلع اسیر میں اس کی تدفین عمل میں آئی۔ چھوٹے بیٹے کا انتقال شیراز ہی میں ہوا دونوں بیٹوں کی موت حافظ کی حیات ہی میں ہوگئی تھی۔

ساقی حدیثِ سرو گل و لالہ میرود

ویں بحث باثلاثہء غسالہ میرود

کہا جاتا ہے کہ سلطان غیاث الدین فرماں روائے بنگال بیمار ہوگیا۔ اس کی تیمارداری کے لئے

تین خادمائیں رکھی گئیں جن کے نام سرو، گل اور لالہ تھے ۔ اپنی خدمات کی وجہ سے ان کا مرتبہ بڑھ گیا۔ حرم کی دوسری عورتیں ان سے جلنے لگیں ۔ سازشیں ہونے لگیں اور شکوہ شکایت کا ماحول گرم ہوگیا ۔ غیاث الدین نے مصرع اولی موزوں کیا لیکن دوسرا مصرع نہ لگتا تھا ۔ یہ مصرع حافظ کے پاس بھیجا گیا جس پر حافظ نے دس اشعار کی ایک غزل کہہ کر سلطان غیاث الدین کو بھیج دی ۔

مطلع کا مفہوم یہ ہے کہ اے ساقی سرو، گل اور لالہ کی بات ہورہی ہے اور یہ بحث ان کے ساتھ ہورہی ہے جو تین غسل دینے والیاں ہیں ۔ اس شعر کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اے ساقی یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ سرو، گل اور لالہ کی باتیں آج میں ان سے کرنے پر مجبور ہوں جو ان کی خوبیوں کو بالکل ہی نہیں جانتی ہیں ۔ کیونکہ یہ تینوں عورتیں تو محض غسل دینے والیاں ہیں ۔ اے ساقی ایسی باتیں تو تیرے ساتھ کرنے ہی میں مزا آتا ہے ۔

دیگر ناقدوں کے بیان کے مطابق یہ ضروری نہیں ہے کہ غسل دینے والی عورتوں کے نام سرو، گل اور لالہ ہی ہوں ۔ یہ محض ایک شاعرانہ تصور کے کچھ اور نہیں ہے ۔ اور پھر سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ سرو، گل اور لالہ جب خادماؤں کے نام ہیں تو سرو، گل اور لالہ سے سرو، گل اور لالہ کی بحث چہ معنی دارد ؟ ظاہر ہوا کہ تین غسل دینے والیاں عام عورتیں تھیں ان کے نام سرو، گل اور لالہ بالکل نہیں تھے ۔

صوفی نہاد دام و سر حقّہ باز کرد
بنیاد مکر بافلک حقّہ باز کرد

حافظ شیرازی کی یہ غزل بھی ایک خاص تاریخی حیثیت رکھتی ہے ۔ یہ مشہور ہے کہ حافظ کے عہد میں عماد فقیہ تھے ان کی ایک بلی تھی جس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ عماد فقیہ کی کرامت سے ان کی بلی نماز پڑھتی تھی ۔ شاہ شجاع جو اس وقت بادشاہ تھا وہ فقیہ کا معتقد تھا ۔ حافظ نے مذکورہ غزل میں فقیہ کا مزاق اڑایا ہے ۔ جو شاہ شجاع کو ناگوار گزرا جس کی وجہ سے حافظ کو کئی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا ۔

شعر میں حافظ کہتا ہے کہ صوفی نے اپنا جال بچھایا اور اپنے ڈبے کو کھول کر اس میں سے عجیب و غریب چیزیں نکالیں ۔ یہ سب شعبدہ بازی ہے جس نے دنیا ہی کے ساتھ نہیں بلکہ فلک کے ساتھ بھی مکاری اور فریب کی بنیاد ڈالنے کا کام کیا ہے ۔ پوری غزل اسی انداز کی ہے جس میں

زاہد کی ریاکاری پر زبردست طنز کیا گیا ہے ۔ ایک اور ایسا ہی تاریخی واقعہ سے جڑا شعر ملاحظہ ہو۔

شاہ ترکاں سخن مدعیاں می شنود
شرم از مظلمۂ خونِ سیاوشش باد

کہا جاتا ہے کہ شاہ ایران کاوس کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا اس کا نام سیاوش رکھا گیا۔ کچھ نجومیوں نے اسے منحوس قرار دے دیا۔ بادشاہ نے اس بچہ کو قلعہ ہی سے نکال دیا۔ تب اس بچہ کو رستم نے پال لیا۔ جوان ہوجانے پر بادشاہ کاوس کو وہ پسند آگیا اس نے دوبارہ سیاوش کو بلالیا۔ اتفاق سے شاہ کاوس کی ایک بیوی اس کی جوانی پر فدا ہوگئی اس نے اسے پھسلانا چاہا لیکن سیاوش کی شرافت آڑے آگئی۔ شاہ کاوس کی بیوی انتقام کی آگ میں جل اٹھی اور اس نے سیاوش پر تہمت لگادی۔ بادشاہ کی نظر میں مجرم ٹھہرا۔ سزا کے طور پر وہ دہکتی آگ میں کود گیا اور صحیح سلامت باہر آگیا لیکن پھر وہ کاوس سے ناراض ہوگیا۔ افراسیاب جو شاہ کاوس کا دشمن تھا اس نے سیاوش کو اپنے یہاں بلالیا اور اپنی بیٹی سے اس کی شادی کردی لیکن وہاں بھی وہ سازش کا شکار ہوا اور افراسیاب کے ہاتھوں بے گناہ قتل ہوگیا۔

حافظ کہتا ہے کہ اے ترکوں کے بادشاہ تو دشمنوں کی بات سنتا ہے اور مظلوم سیاوش کا قتل کرادیتا ہے تجھے شرم آنا چاہئے کہ تونے ایک بے گناہ کو قتل کردیا ہے۔ حافظ نے اپنے عہد کی تاریخ کو بھی کہیں کہیں بڑی خوبی کے ساتھ اپنے اشعار مین پیش کیا ہے اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد سے پوری طرح باخبر تھا۔ اس کی بیداری کے ثبوت جابہ جا ملتے ہیں۔

شبانِ وادیِ ایمن گہے رسد بہ مراد
کہ چند سال بجاں خدمتِ شعیب کند

اس شعر میں بھی حافظ نے ایک تاریخی واقعہ کا بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وادی ایمن کا گڈریا یعنی موسی اس وقت اپنی مراد حاصل کرتا ہے جب چند سال دل سے شعیب کی خدمت کرتا ہے۔ یعنی انسان کو اس کی منزل مقصود فوراً نہیں مل جاتی ہے اس کے لئے اسے برسوں جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ حافظ نے مثال دی ہے کہ جس طرح حضرت موسی نے حضرت شعیب کی آٹھ سال تک بکریاں چرائیں اور تب ایک روز وادی ایمن میں انہیں روشنی نظر آئی جسے آگ سمجھ کر وہ اس میں

سے کچھ چنگاریاں لینے گئے اور وہاں خدا نے انہیں پیمبری عطا کردی۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جن کو خدا پیمبری عطا کی ان کو بھی زندگی کی سخت جدوجہد سے گزرنا پڑا ہے۔ پھر عام لوگوں کی تو بات ہی کیا ہے۔ منزل مقصود بغیر جدوجہد کے ملنا ممکن نہیں ہے۔اور آخر میں حافظ کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

صبحدم از عرش می آمد خروشِ باز گفت
قدسیاں گوئی کہ شعرِ حافظ از بر می کند

کچھ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس شعر میں حافظ کی انانیت اپنے عروج پر ہے۔ میں ان سے یہی کہنا چاہتا ہوں کہ شعر و سخن کی عظمت کے لئے جس قدر انکساری کی ضرورت ہوتی ہے اتنی ہی انانیت بھی ضروری ہے۔ میں اس موضوع پر اپنے ایک مضمون " انانیت اور شعریت " میں طویل بحث کرچکا ہوں۔ میں نے ان تمام شعرا کے حوالے دیئے ہیں جن کی انانیت ہی نے انہیں فن شعرگوئی کے عروج پر پہنچایا ہ۔ ولی دکنی، میر تقی میرؔ ،اسد اللہ خاں غالبؔ ، مومن خاں مومنؔ ، ڈاکٹر اقبالؔ ،یگانہؔ ، فراقؔ کسی کی بھی شخصیت اور فن پر نظر ڈالئے تو ہمیں اندازہ ہوتا اہے کہ انانیت ان تمام عظیم شعراء کے لئے زیورِ سخن رہی ہے۔ حافظ کے ہاں بھی انانیت زیورِ سخن ہی ہے۔

مذکورہ شعر میں حافظ کہتا ہے کہ صبح کے وقت مجھے یہ محسوس ہوا کہ عرش سے گفتگو کا ایک شور زمین تک آرہا ہے۔ وہ شور کچھ اور نہیں تھا دراصل عرش والے میرے اشعار کو یاد کررہے تھے۔ اس میں ایک خاص نکتہ یہ پوشیدہ ہے کہ حافظ اپنی شاعری کو اس معراج تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے کہ عرش والے بھی اس کے اشعار کو ازبر کریں۔ جس کسی سنجیدہ سفیر شعر و سخن کے یہاں ایسے دعوے ملتے ہیں اہل بزم کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنی شاعری میں اپنے دعوے کے عین مطابق عمل کرنے کی ضرور کوشش کررہا ہے اور اس کی اس کوشش کو سراہنا چاہیئے ایسا قطعی نہیں ہونا چاہیئے کہ انانیت کے الزام بلاوجہ اُس کے سر تھوپ کر اپنی ناسمجھی اور کم علمی کا ثبوت پیش کیا جائے۔

☆ ☆ ☆

چند اہم ضروری گذارشات
کیا آپ اپنی کتاب چھپوانا چاہتے ہیں
یا
فروخت کی ایجنسی دینا چاہتے ہیں۔

تو فوری طور پر ہم سے رجوع کریں .... کتاب کا معیاری ہونا شرط ہے........ کتاب چھپوانے یا فروخت کرنے میں ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کو کسی اُردو اکادمی یا دیگر ادارے سے جزوی مالی امداد ملی ہے تو اشاعت کے لئے ہم سے ملئے یا لکھئے معلومات اور شرائط کے لئے جوابی لفافے کے ساتھ ذیل کے پتے پر خط لکھئے۔

وہ حضرات توجہ دیں جو اپنی کتابیں فروخت کرانے کے خوہش مند ھیں۔

- کتابیں معقول کمیشن پر ہی لی جائیں گی۔
- کتابیں فروخت ہونے کے بعد ہی ادائیگی ممکن ہو سکے گی۔
- کتابوں کا نیالاٹ منگانے پر پچھلے لاٹ کی ادائیگی کر دی جائے گی۔
- کتابیں جلد فروخت ہونے پر ادائیگی جلد کی جاتی ہے۔ تاخیر سے فروخت ہونے والی کتابوں کی ادائیگی بھی تاخیر سے ہی کی جاتی ہے۔
- تمام لین دین تحریر میں کریں۔ اگر کتابیں فروخت کے لئے دی ہیں۔ تو اس کا بل دیں اور اس کی وصولیابی کی رسید ضرور لے لیں۔ اگر رسید آپ نے وصول نہیں کی صرف زبانی معاملہ رہا تو ادارہ ہر طرح سے بری الذمہ ہوگا۔ اور بوقت ادائیگی وصولیابی کی رسید دکھانا لازمی وضروری ہوگا

Kitabi Duniya
1955, Turkman Gate, Delhi. 6
Ph:- 3288452
E- mail : kitabiduniya@rediffmail.com

اردو ادب میں کمرشیل رجحان کے اثرات

سلیم شہزاد

ادبی متن یا ادبی تخلیقات کی معنی افشانی قاری کی معنی فہمی پر تاثر آفرین ہو کر اسے متن کی معنویت سے پیدا ہونے والی مسرتوں اور بصیرتوں سے ہمکنار کرتی اور جمالیاتی ابعاد کے انکشافات کا سبب بنتی ہے۔ صدیوں سے ادب کی تخلیق و ترسیل کا یہی مقصد قرار دیا جاتا رہا ہے جس پر ماورائی اور روحانی کیفیات کے حظ و انبساط جس پر ماورائی اور روحانی کیفیات کے حظ و انبساط کا رنگ گہرا نظر آتا ہے۔ شعر چیزے دیگر است کے اس تصور کو جب ارضی طبیعات و نفسیات سے ہم رشتہ کیا گیا تو درباروں میں رزم سرائی اور قصیدہ خوانی کے رنگارنگ اظہارات نے ادب کی تخلیق و ترسیل کرنے والوں کے لیے مادی اور جسمانی افادیتوں کے حصول کو بھی آسان تر بنا دیا۔ فنون کے تاریخی تناظر میں یہ ایک ایسا نمایاں مظہر ہے جس کی مثالیں مختلف خطہ ہائے زمین پر ڈراموں، تمثیلوں، طنز و مزاح کی محفلوں اور مشاعروں سے آج مابعد جدیدیت کے تکنیکی صارفی دور کی ماس میڈیا سوسائٹیوں تک پہنچتی ہیں۔

اردو ادب پر کمرشیل رجحان کے اثرات سوداؔ، انشاؔ، ذوقؔ اور غالبؔ وغیرہ کی درباری قصیدہ خوانی سے ظاہر ہونے لگے تھے لیکن تفوق اس رجحان پر بہر حال مسرت اور بصیرت کو حاصل تھا۔ طباعت اور اشاعت کے مشینی ذرائع متعارف ہونے کے ساتھ کتابی مواد کی پیداوار میں اضافہ ہوا اور ناشرین کتب کے طبقے کے ظہور سے ادب میں تاجرانہ رجحان کو تقویت ملنے لگی۔ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں تاجرانہ نقطۂ نظر رکھنے والے ناشرین کے توسط سے جو لسانی مواد شائع ہوا اس نے اردو زبان کے فروغ میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ منشی

---

223 منگلوار واڑہ۔ مالیگاؤں 423203 (مہاراشٹرا)

نولکشور کا اشاعتی ادارہ اس ضمن میں کلاسک مقام رکھتا ہے۔ اس کے متوازی سرسید کی علمی تحریک نے ناگزیر تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لیے علمی، ادبی، مذہبی اور صحافتی تحریروں کو ملک کے طول و عرض میں ایک افادی پہلو کے ساتھ پھیلایا۔ تعلیمی پس منظر میں اس سے پہلے فورٹ ولیم کالج اور اس کے بعد مختلف جامعات بالخصوص جامعہ عثمانیہ کے علمی اور لسانی اداروں نے مختلف علوم کے متون تیار کرنے والے ادباء و علماء کو کم و بیش مشاہروں پر اپنے یہاں متعین کیا اور اسے اُردو ادب میں کمرشیل رجحان کی تقویت اور ارتقاپذیری کے سوا دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد اور دوسری کے زمانے میں اشتراکی، جمہوری اور آمرانہ سیاسی افکار و تصورات کی ریل پیل ہوئی اور ان کی اشاعت کے لیے بہت سے سماجی اور سیاسی اداروں سے وابستہ متن ساز افراد ادبی اصلاحی اور انقلابی لسانی متون کی تشکیل و تدوین میں مصروف ہوئے۔ اس ذیل میں ترقی پسند ادب، اشتراکی صحافت، مختلف مذہبی تحریکات کے تبلیغی مواد کی تسوید ایسے لسانی مظاہر ہیں جن پر تاجرانہ تفکر کا غلبہ رہا ہے، خصوصاً اُردو فکشن میں منٹو، عصمت چغتائی، کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس وغیرہ نے اپنی کہانیاں ادبی رسائل سے لے کر اسٹیج اور فلم کے تاجروں تک کو فروخت کیں۔ انھیں کے ساتھ مجروحؔ اور ساحرؔ وغیرہ نے بھی اپنا شعری مال فلمی گیتوں کے نام سے فروخت کیا۔ ادب میں ایسی تاجرانہ رو کے باوجود انھیں فنکاروں نے غیر تاجرانہ نہ رہنے کی بھی کوشش کی لیکن کرشن چندر، ساحرؔ اور مجروحؔ اسی رو میں بہتے رہے نتیجے میں ان کا ادب نہ صرف اشتراکی خیالات کی محدودیت کا بلکہ کم علم عوام کی دل چسپی اور ان میں ایک وقتی انقلاب اور ہیجان بپا کرنے کی بے معنی کوشش کا بھی عملی نمونہ بن کر رہ گیا۔

اُسی رو کے پہلو بہ پہلو ایک کمرشیل رو بھی بہتی نظر آتی ہے اور وہ ابنِ صفی کے جاسوسی اور گلشن نندا کے رومانی فکشن کی اشاعت اور فروخت کی رو ہے۔ ان دو ناموں کے ساتھ متعدد ایسے دوسرے نام اور دیے جاسکتے ہیں جو تفریحی ادب کے لیبل سے اُردو عوام و خواص کو تیسرے درجے کا ادبی متن مہیا کرنے میں مصروف تھے۔ مسرت اور بصیرت کے حصول کے لیے اُردو ادب کے قارئین کا حلقہ ہر زمانے میں محدود رہا ہے لیکن اوپر مذکور فکشن لکھنے والوں کی تحریریں پڑھنے کے لیے بے شمار قارئین ہر وقت منتظر رہا کیے ہیں۔ یہ ایک حیران کن حقیقت ہے کہ ابنِ صفی کے ایک ناول کے لیے اس کے پڑھنے والوں نے قطاریں لگا کر اسے خریدا ہے !

صحافت کے میدان میں بعض رسائل نے فلمی دنیا کو اپنا موضوع بنا کر کمرشیل رجحان

کو خاصا مضبوط کیا ہے۔ مثلاً دہلی سے شائع ہونے والے رسالے ''شمع'' اور ''روبی'' جنھوں نے عوام کی دلچسپی اور مارکیٹ ویلیو کو ہمیشہ مد نظر رکھا۔ افسانے اور غزلیں وغیرہ شائع کر کے انھوں نے لکھنے والوں کے ایک وسیع طبقے کو بھی اپنا گرویدہ بنایا جس کے نتیجے میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، رام لعل، اختر الایمان، ساحر، مجروح، قتیل، ندا فاضلی اور بشیر بدر وغیرہ سے لے کر سریندر پرکاش، انتظار حسین، سلام بن رزاق، سلطان سبحانی اور قاضی مشتاق وغیرہ تک ادب میں کمرشیل رجحان کو پروان چڑھانے والوں میں شامل نظر آنے لگے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ''شمع'' اور ''بیسویں صدی'' میں اپنی تخلیق چھپوالینا فنکار کے لیے باعثِ فخر ہو گیا اور اللہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے۔

آج کل ڈائجسٹوں کی دوڑ کمرشیل رجحان کا ایک تیز رنگ ہے جس نے اُردو پڑھنے والے عوام کو مسحور کر رکھا ہے۔ ان رسائل میں شائع ہونے والی طول طویل سلسلہ وار داستانیں خاصے کی چیز ہوا کرتی ہیں جن کی آزادانہ اشاعت سے ناشرین اور مصنفین آج بھی لاکھوں میں کھیل رہے ہیں۔ نتیجہ اس کا بڑا بھیانک سامنے آیا ہے کہ اُردو ادب کو مسرت اور بصیرت کے حصول کے لیے پڑھنے والا طبقہ محدود ہوتے ہوئے غائب سا ہو گیا اور معیاری ادب کی اشاعت کرنے والے رسالوں کے دانشور مدیران شاکی ہیں کہ ان کے رسالوں کو قاری نہیں ملتا اور اس کا سبب وہ سستے تفریحی ڈائجسٹوں کی بھیڑ کو قرار دیتے ہیں۔ معیاری اور تفریحی ادب کی تفریق اور قاری کی کمیابی اور عصری داستانوں میں عوام کی دلچسپی کے مسائل اُردو کے نہایت اہم لسانی مظاہر ہیں۔ ان مسائل کا حل جدیدیت نے قاری سے لاتعلقی اور بے نیازی میں اور مابعد جدیدیت نے تخلیق اور قاری میں از سر نو رابطہ قائم کرنے میں بیان کیا ہے اور دونوں ہی تصورات پر گرما گرم مباحث کی موجودگی اُردو ثقافت کو ایک متنازعہ عمرانی مظہر ثابت کرتی ہے۔

ادبی لسانی متن و مواد پر صارفی سماج کے تصرف کا تذکرہ کیے بغیر کمرشیل رجحان کے عروج کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا اور اسے ڈائجسٹوں کی دوڑ کا مابعد جدید رویہ قرار دینا نامناسب نہیں کہ آج کسی حد تک ڈرامے کے اسٹیج پر اور بہت حد تک چھوٹے بڑے اسکرین پر ادبی مواد اپنا تصویری اظہار کر رہا اور ہر عمر اور ہر سماج کے افرادان تکنیکی اظہار کے ذرائع کی ساحری کا شکار نظر آ رہے ہیں۔ اظہار کے جدید ترین مشینی وسائل نے اُردو کی مشہور داستانوں 'الف لیلہ' اور 'حاتم طائی' وغیرہ کو جس طرح غیر فنی، غیر منطقی اور غیر انسانی طریقے سے پیش کیا ہے اس

سے مسلم اور غیر مسلم ان پڑھ عوام مثبت اور منفی دونوں لحاظ سے جذباتی برانگیختگی میں مبتلا ہوئے ہیں۔ ان سیریلوں کی غلط زبان، مہمل روایات کی پیشکش اور ان کا میلوڈرامائی انداز سب کچھ صرف لغویت کی تبلیغ کہا جاسکتا ہے۔ 'الف لیلہ' اور دیگر داستانوں سے واقف اُردوداں طبقہ ٹی وی پر ان کلاسکس کے اظہار سے خاصا بدظن ہوا ہے اور یقیناً اُردو کی نئی نسل جو المناک حد تک محدود ہے، اُردو ادب کے ایسے ورثے کو مضحک اور بے وقعت سمجھنے لگی ہے۔

ماس میڈیا جس طرح کلاسک ادبی متون کو مشینی اور الیکٹرانک ذرائع کے توسط سے توڑ مروڑ کر ناظرین کے سامنے پیش کر رہا ہے اس سے ادب العالیہ کا تصور خطرے میں نظر آنے لگا ہے۔ کیوں کہ شہ پاروں کو صارفی سماج، ضروریات زندگی کے بیش قیمت اسباب کے بے معنی اشتہارات کی نشر و اشاعت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ 'الف لیلہ' اور 'مہابھارت' جیسی عظیم بیانیہ تخلیقات کو ماس میڈیا جہاں سیاسی اخلاقی اور مذہبی تصورات کی ترویج کے لیے استعمال کرتا ہے وہیں اس کے پیش نظر یہ تاجرانہ ذہنیت بھی خاصی فعال رہتی ہے کہ صارفین نئی مصنوعات وغیرہ کی خریداری کی طرف زیادہ متوجہ ہوں۔ اس رویے سے ادبی متن کی سمعی بصری پیشکش غیر اہم ہو کر رہ جاتی اور ذہنوں پر جو کچھ مسلط رہ جاتا ہے وہ ہوتا ہے اشتہاری 'تک بندی اور پُرشور موسیقی کا بے ہنگم آسیب'۔

پرنٹ میڈیا سے ادب آٹومیشن اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے دائرۂ کار میں آچکا ہے۔ ایک سی ڈی روم آج ہزاروں صفحات کی کتاب کا بوجھ ڈھونے سے فرد کو بچا رہی ہے اور غزل گائکی اور کتھا کتھن کے لیے انٹرنیٹ کا اعصابی نظام روشنی کی رفتار سے ادب کو روئے زمین کے ہر خطے پر ترسیل کرنے کا اہل ہے۔ اس صورت حال میں ناگزیر ہے کہ اُردو ادب اپنی محدود ارضیت اور مرکزجوئی کو ترک کر کے مابعد ساختیات کے زیر اثر لامحدود معنویت اور اظہاری تکثیریت کو اور مرکزگریزی کے عمل سے کائنات کے ماورائی محیط کو چھونے کے لیے کوشاں ہو اور اپنی ثقافتی جزوں کو اپنی ساخت سے پرے پھیلا کر ایک بار پھر چیزے دیگر ہونے کا مقام حاصل کرلے۔ لیکن واضح رہنا چاہیے کہ لفظ بہ حیثیت وسیلۂ اظہار اور الیکٹرانک تصویری عددی ضابطہ، بہ حیثیت وسیلۂ اظہار دونوں مظاہر کی تکنیکی پیش کش کے مسائل موضوع کی وحدت کے باوجود ایک دوسرے سے متغائر ہیں۔ دونوں کی وسعتوں اور محدودیتوں میں فرق ہے اور ایک سیکا حل دوسرے پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔ ☆☆☆

سراج الدین علی خاں آرزو
احوال و آثار

ڈاکٹر نیاز* سلطان پوری

بزم آرائے گفتگو سراج الدین خاں آرزو ابن شیخ حسام الدین المتخلص بہ حسامی حسام کبر آباد کے رہنے والے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت شیخ کمال الدین، ہمشیر زادہ قطب الواصلین غوث الاسلام والمسلمین حضرت شیخ نصیر الدین اودھی المعروف بہ چراغ دہلی علیہ الرحمہ اور والدہ کی طرف سے حضرت شیخ حمید الدین عرف شیخ محمد غوث گوالیاری قدس اللہ تعالیٰ تک پہونچتا ہے۔ حضرت گوالیاری کا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ فرید الدین عطار تک پہنچتا ہے۔ لہذا ان کے فرزندوں کو عطاری کہتے ہیں۔

جد است مرا حضرت عطار ازیں راہ
اشعار خود اکنون بہ نشاپور فرستم[1]

خان آرزو ۱۰۹۹ھ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گوالیار ہی میں رہ کر حاصل کی۔ ایدل کے شاگرد میر عبدالصمد سخن اور میر غلام علی احسن سے مشورۂ سخن بھی کیا مطالعہ کا بے حد شوق تھا اور چوبیس ۲۴ برس کی عمر ہی میں انھوں نے تمام عقلی و نقلی علوم متداولہ میں کمال حاصل کر لیا۔ فرخ سیر کے عہد میں شاہی منصب داری پر مامور ہوئے ۱۱۳۲ھ میں دہلی آئے یہاں شیخ حزیں سے ۱۱۴۷ھ میں ملاقات ہوئی جو ان دنوں وارد ہوئے تھے۔ باہم موافقت نہ ہوئی اور آرزو نے

[1] تذکرۂ گل عجائب مؤلفہ اسد اللہ خاں تمنا اورنگ آبادی۔ ناشر اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۵ء۔ ص ۱۰

* بھٹی جرولی۔ پوسٹ آفس کناواں، ضلع سلطان پور، یو۔ پی 228001

صنف سخن''۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مختار احسن انصاری اپنی تمناؤں کی معراج پر پہنچ چکے ہیں مگر میں بڑے اعتماد سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ ان کی غزلوں میں کہیں کہیں پر روایت ذاتی تجربات میں ڈھل کر بہت ہی خوبصورت اور دل نشین بن گئی ہیں۔ ماضی کے مقدس آتش خانوں کی آنچ جب تجربات اور مشاہدات کی دھوپ سے ملتی ہے تو حسن و عشق کی ہم آہنگی میں زندگی کے جو صحت مند عناصر مضمر ہوتے ہیں وہ اس قوس و قزح کے مانند ہوتے ہیں جو دھوپ کی بارش میں طلوع ہوتی ہے۔ ذرا ان اشعار کو دیکھئے کیا یہ محض روایت کے احترام میں کہے گئے ہیں یا تجربات کی وادیوں میں سینے کے بل چل کر ان کی تخلیق کی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:۔

اک ناگ محو رقص تھا صندل کی شاخ پر　　شہنائیاں وہاں تھیں یہاں رات آخری

آؤ گلے مل لو اب ہم سے دل کی مبارکباد تو لو　　ہاں تم جیتے مان گئے ہم، آج ہماری مات ہوئی

جھکا کے گردن و بازو بہت آہستہ چلتا ہے　　وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب گھر سے نکلتا ہے

ذات اور ماورائے ذات دونوں پر ان کی نگاہیں ہیں اور وہ عہد حاضر کے کھردرے اور سنجیدہ مسائل کو غزل کے نازک فنی آبگینے میں اس طرح ڈھالتے ہیں کہ جگ بیتی آپ بیتی اور ایک دور کی حقیقت ہر دور کی حقیقت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ عہدِ حاضر کی معتبر دستاویز سیاست دانوں کے اقوال کے بجائے شعراء کے اشعار سے مرتب ہو تو زیادہ صحیح اور حقیقت پر مبنی ہوگی، مختار احسن انصاری نے اپنے کلام [illegible] واقعات کی طرف اشارہ کئے ہیں جن سے ہمارا [illegible] خنجر لئے ہوئے

ہم پیالہ قاتل و منصف نظر آتے ہیں اب　　میں اپنے جرم کا اقرار کرنے والا تھا

الزام کس کو دیتا وہاں اپنے قتل کا　　وہ جا رہے ہیں قوم کے رہبر لئے ہوئے

گواہ اپنے بیانوں سے پھر گئے ورنہ

وہ اک جنازہ جس پہ ہے اردو لکھا ہوا

مختار احسن انصاری سرخیٔ لہو کو رنگ حنا اور نالۂ سحر گاہی کو نغمۂ شب میں تبدیل کرنے کا ہنر اچھی طرح جانتے ہیں۔ ماحول جب ''جنت آثار'' ہو تو غزل کہنا آسان ہے مگر

شیخ کے دیوان پر اکثر اعتراضات لکھ کر "تنبیہ الغافلین" کے نام سے شائع کئے جس سے نزاع صاف ہویدا ہے۔ (امام بخش صہبائی نے اس کا جواب قولِ فیصل کے نام سے لکھا) [1]

منوہر سہائے انور نے بجا طور پر لکھا ہے کہ یوں تو ہندوستان میں عہد اکبری سے عہد عالمگیر تک مسلم الثبوت ایرانی شعراء کے کلام پر اعتراضات ہوتے رہے۔ وہ بھی بیشتر اسی زمین کے فرزندوں کے قلم سے...... (لیکن) یہ بھی نہیں دیکھا گیا کہ کس ہندوستانی صاحبِ قلم نے کس جلیل القدر ایرانی شاعر کے کلام کو مورد اعتراض بنانا چاہا ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اچھا یا بڑا کام روزِ ازل سے عہدِ محمد شاہی کے لئے مقدر تھا۔ جس میں سراج المحققین خان آرزو نے افضل المتاخرین شیخ حزیں کے دیوان سے چن چن کر قابلِ اعتراض اشعار نکالے اور ان کا سقم دکھانے کے لئے ایک مستقل کتاب "تنبیہ الغافلین" کے نام سے لکھی۔ [2]

منوہر سہائے انور نے اس مناقشے کی ابتداء ۱۱۵۴ھ کے بعد اور ۱۱۵۶ھ سے قبل بتائی ہے۔ اور اس کی تین وجوہ قرار دی ہیں۔ (۱) حزیں اور آرزو کی پہلی ملاقات کے وقت حزیں کی سرد مہری (۲) ہندوستان اور ہندوستانیوں کے خلاف حزیں کی ہجویات (۳) حزیں کی انتہائی نازک مزاجی اور تکبر۔

ممکن ہے کہ یہ وجوہ حزیں اور آرزو کے مناقشے کا فوری سبب ہوں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ معارضہ ہندوستان کے فارسی دانوں میں احساسِ کمتری کی شکست اور خودداری اور انفرادیت کے اظہار کا ذریعہ تھا۔ پہلی بار ہندوستان کے کسی دانشور نے اس قدر ہمت کے ساتھ بغاوت کا علم بلند کیا اور اہلِ ایران کی خود انھیں کے میدان میں انھیں کی زبان وادب کے بارے میں للکارا۔ یہ کشمکش ہندوستان کی ایران زدگی کے تابوت میں آخری کیل تھی اور اس نئی تہذیب کی غماز تھی جو نیا ذریعۂ اظہار تلاش کر رہی تھی۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ وہی خان آرزو ہیں جن کے بارے میں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ انھیں "زبان اُردو پر وہی دعویٰ پہونچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفۂ منطق پر ہے۔" اور "جب تک منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہلِ اُردو خان آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے۔" یہی وہ خان آرزو ہیں جن کے بارے میں (بعض غیر مصدقہ روایات کے مطابق) یہ مشہور ہے کہ انھوں نے سودا اور میر جیسے صاحب کمالوں کو فارسی سے ریختہ گوئی کی طرف مائل کیا اور جن کے شاگردوں میں

---

[1] دلی کا دبستان شاعری مصنفہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی۔ مطبوعہ اُتر پردیش اُردو اکاڈمی لکھنو۔ ۱۹۸۰ء۔ ص ۱۱۵

[2] دہلی میں اُردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر ڈاکٹر محمد حسن۔ ناشر اُردو اکاڈمی دہلی۔ سن اشاعت ۱۹۸۹ء ص ۱۰۶

آبرو، مضمون وغیرہ شمار کیے جاتے ہیں۔ "جن کے دامن تربیت سے ایسے شائستہ فرزند پرورش پاکر اٹھے جو زبان اُردو کے اصلاح دینے والے کہلائے اور جس شاعری کی بنیاد جگت اور ذو معنی لفظوں پر تھی اسے کھینچ کر فارسی کی طرز اور ادائے مطالب پر لے آئے۔ یعنی مرزا جان جاناں مظہر، مرزا رفیع، میر تقی میر، خواجہ میر درد وغیرہ[1]

دہلی کا وہ زمانہ بڑا پُر آشوب تھا چنانچہ نادری حملے کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے بعد جب دلّی کی ویرانی سے گھبرا گئے تو سالار جنگ کی تحریک پر اواخر محرم ۱۱۶۸ھ میں بنارس ہوتے ہوئے فیض آباد پہونچے۔ سالار جنگ کی کوششوں سے شجاع الدولہ نے تین سو ۳۰۰ روپے ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ ۲۳ ربیع الآخر ۱۱۶۹ھ کو وفات پائی۔ لاش فیض آباد میں دفن کی گئی لیکن بعد میں ان کی وصیت کے مطابق سالار جنگ نے لاش دفن ہونے کے لئے دہلی بھجوادی اور ہیں اپنے مکان پر جو بیرونی وکیل پورہ انندرام مخلص کے مکان کے قریب ہوا یا تھا دفن کر دیئے گئے۔

آرزو جامع کمالات تھے۔ اُردو کے اکثر شعراء ان سے فیضیاب ہوئے چنانچہ میر تقی میر اور میر حسن نے اپنے تذکروں میں ان کے شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔ میر تقی میر ان کے عزیز تھے اور انھیں کے دامن عاطفت میں پلے بڑھے تھے۔ اگرچہ بعد میں ان بن ہوگئی۔ اس کے باوجود میر جب بھی ان کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے قلم سے محبت اور خلوص ٹپک پڑتا ہے۔ میر صاحب رقمطراز ہیں :

"استاد پیر مرشد بندہ است .... ہمہ استادان مضبوط من ریختہ
شاگردان آں بزرگوارند[2]

خان آرزو اصلاً فارسی گو تھے لیکن کبھی کبھی اُردو شعر بطور تفنن طبع کہتے تھے اس لئے ان میں وہ خوبی نہیں جو ان کے فارسی کلام میں ہے۔ حسب ذیل تصانیف ان کی یادگار ہیں :

(۱) کلیات اشعار وغیرہ' (۲) فرہنگ سراج اللغتہ ' (۳) چراغ ہدایت' (۴) نوادر الالفاظ' (۵) شرح گلستاں' (۶) شرح سکندر نامہ' (۷) شرح قصائید عرفی' (۸) نسخہ داد سخن' (۹) نسخہ سراج منیر' (۱۰) نسخہ سراج وہاج' (۱۱) رسالہ موہبت عظمیٰ' (۱۲) مفتاح تلخیص' (۱۳) رسالہ عطیہ کبریٰ' (۱۴) رسالہ تنبیہ الغافلین' (۱۵) تذکرۂ شعراء[3]

---

[1] دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر ڈاکٹر محمد حسن۔ ناشر اُردو اکاڈمی دہلی۔ سن اشاعت ۱۹۸۹ء ص ۱۰۶
[2] بہ حوالہ لکھنو کا دبستان شاعری از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔ اُردو پبلشرز (۸) تلک مارگ لکھنو۔ ۱۹۷۳ء ص ۸۰
[3] مجمع النفائس تصحیح وترتیب از عابد رضا بیدار۔ ص ۲

ڈاکٹر منوہر سہائے انور نے حسبِ ذیل تصنیفات کا اضافہ کیا ہے

(۱) مثمر علم اللغتہ' (۲) معیار الافکار' (۳) فرائد الفواید (قواعد زبان)' (۴) خطبات مع دیباچہ' (۵) گلزار خیال (رسالہ)' (۶) آبروئے سخن' (۷) صفت حوض و فوارہ و تاک' (۸) نشرح گل کشتی (مقالہ : مجلہ معاصر جلد ۴۔ ۱۹۵۳ء و مجلۂ اندوایرانیکا' دیسامبر ۱۹۶۰ء [1]

مجمع النفایس خان آرزو کا فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے جس کا نسخہ خطی خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے اسی نسخے کی بنیاد پر مدیر کتاب خانہ خدا بخش پٹنہ عابد رضا بیدار نے اس تذکرے کو شائع کیا۔

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ باوجود یہ کہ عزتِ خاندان اور نفس کمالات کی حیثیت سے خانِ موصوف کو اُمرا و غربا سب معزز و محترم سمجھتے تھے اور علم و فضل کے اعتبار سے قاضی القضات کا عہدہ دربارِ شاہی سے حاصل کیا۔ مگر مزاج کی شگفتگی اور طبیعت کی ظرافت نے دماغ میں خود پسندی اور تمکنت کی بُو نہیں آنے دی تھی۔ [2]

خان آرزو اُردو کے شاعر نہ تھے برائے تفننِ طبع کبھی کبھار اُردو میں متفرق اشعار کہے تھے۔ البتہ تذکروں میں جو متفرق اشعار ہیں۔ اُن کو یکجا کر کے نذرِ قارئین کیا جاتا ہے [3]

آتا ہے صبح اُٹھ کر تیری برابری کو — کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشیدِ خاوری کو
دل مارنے کا نسخہ پہنچا ہے عاشقوں تک — کیا کوئی جانتا ہے اس کیمیا گری کو
اس تند خُو' خم سے ملنے لگا ہوں جب سے — ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو
اپنی فسوں گری سے اب ہم تو ہار بیٹھے — بادِ صبا یہ کہنا اس دلبربا پری کو
اب خواب میں ہم اُس کی صورت کو ہیں ترستے — اے آرزو ہوا کیا بختوں کی یاوری کو

کھول کر بند قبا کو ملک دل غارت کیا — کیا حصارِ قلب دلبر نے کھلے بندوں لیا
سات پروانے کی اُلفت ستی روتے روتے — شمع نے جان دیا صبح کے ہوتے ہوتے
داغ چھوٹا نہیں یہ کس کا لہو ہے قاتل — ہاتھ بھی دکھ گئے دامن ترا دھوتے دھوتے
کس پری رُو سے ہوئی رات مری چشم دوچار — کہ میں دیوانہ اُٹھا خواب سے روتے روتے

---

[1] مجمع النفایس تصحیح و ترتیب از عابد رضا بیدار۔ ص ۱۰

[2] آب حیات از محمد حسین آزاد۔ ناشر اتر پردیش اُردو اکاڈمی لکھنو۔ ص ۱۱۶ و ۱۱۷

[3] نکات الشعراء مطبوعہ ۱۹۸۴ء ناشر اتر پردیش اُردو اکاڈمی لکھنو میں آتا ہے ہر سحر اور جبہ تری برابری کو مندرج ہے

غیر لوٹے ہے صنم مفت ترے خط کی بہار
ہم یوں ہی اشک کے دانے رہے بوتے ہوتے

عجب دل ہے کس پہ تو ہر وقت روتا ہے
نہ کر غم اے دوانے عشق میں ایسا بھی ہوتا ہے

دریا عرق میں ڈوبا تجھ صاف تن کے آگے
موتی نے کان پکڑے ترے سخن کے آگے

تجھ زلف میں لٹک نہ رہے دل تو کیا کرے
بے کار ہے اٹک نہ رہے دل تو کیا کرے

پھر کر نظر نہ آیا ہم کو سجن ہمارا
گویا کہ تھا چھلاوا وہ من ہرن ہمارا

تیرے دہن کے آگے دم مارنا غلط ہے
غنچے نے گانٹھ باندھا آخر سخن ہمارا

جان کچھ تجھ پہ اعتماد نہیں
زندگانی کا کیا بھروسا ہے

اس زلف سیاہ فام کی کیا دھوم پڑی ہے
آئینہ کے گلشن میں گھٹا جھوم پڑی ہے

فلک نے رنج تیر آہ سے میرے زہس کھینچا
لبوں تک دل سے شب نالے کو میں نے نیم رس کھینچا

مرے شوخ خراباتی کی کیفیت نہ کچھ پوچھو
بہار حسن کو دی آب اس نے جب چرس کھینچا

کہاں یوں صاحب مہمل نے سن کر سوز مجنوں کا
تکلف کیا جو نالہ باثر مثل جرس کھینچا

میخانہ بیچ جا کر شیشے تمام توڑے
زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے[ل]

دریائے اشک اپنا جب سر بہ اوج مارے
طوفان نوح بیٹھا گوشہ میں موج مارے

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہووے گا
مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

☆ ☆ ☆

ل۔ نکات الشعراء متذکرہ بالا میں "زاھد میں آج اپنے دل کے پھپھولے توڑے" درج ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیت صحافی

ریاض احمد

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے ۔ وہ بیک وقت عالم، مفکر ، شاعر اور سیاست داں تھے ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مولانا آزاد کے دل و دماغ میں صحافت رچی بسی تھی ۔ نوعمری سے ہی ہر موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور علمی و ادبی رسالے شائع کرنے لگے ۔ مولانا آزاد نے ۱۸۹۹ء میں کلکتہ سے " نیرنگ عالم " شائع کیا۔ اس ماہنامہ میں شاعروں کا طرحی کلام چھپتا تھا۔ اس کے بعد " المصباح " کے ایڈیٹر ہوئے ۔ جو کچھ ہی دنوں بعد بند ہوگیا۔ اس اخبار میں نثری حصہ پر زیادہ توجہ دی گئی ۔ مولانا آزاد کا مضمون " عید " بہت مشہور ہوا ۔ ۱۹۰۲ء میں کلکتہ سے " احسن الاخبار " نکالا ۔ ۱۹۰۳ء میں " لسان الصدق " شائع کیا جو ۱۹۰۴ء میں بند ہوگیا ۔ اس سہ روزہ اخبار میں مسلمانوں کے معاشرے و رسومات کی اصلاح پر توجہ دی گئی ۔ لسان الصدق " میں آزادی کا جذبہ زیادہ تھا ۔ انہی وجوہات کے سبب اہل نظر کی توجہ اس اخبار کی طرف مرکوز ہوگئی ۔ مولانا آزاد نے " الندوہ " میں مولانا شبلی نعمانی کے ساتھ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۶ء تک کام کیا ۔ انہوں نے امرتسر سے " الوکیل " بھی شائع کیا۔ اس میں مولانا آزاد کو اپنے خیالات پیش کرنے کی پوری آزادی ملی ۔ وہ ۱۹۰۸ء تک " الوکیل " سے منسلک رہے ۔ ان اخباروں کے تذکرے کا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ مولانا آزاد اوائل عمری سے ہی اخبار و رسائل سے وابستہ رہے ۔ نہ صرف وابستہ رہے بلکہ ادارت کی خدمات بھی انجام دیں ۔

اس وقت ہمارے ملک کے اخبار و رسائل کے حالات اچھے نہیں تھے ۔ بالخصوص

☆ ریسرچ اسکالر ، شعبہ اردو ، دہلی یونیورسٹی

اردو اخبار و رسائل دوسری زبانوں کے مقابلے میں پیچھے تھے ۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہم میں روشن خیالی اور ترقی پسندانہ نظریہ کی کمی تھی ۔ وہ ادب جو سماج کو آگے لے جانے میں مدد فراہم کرتا ہے " ترقی پسند نظریہ " کہلاتا ہے ۔ بد قسمتی سے اردو اخبار و رسائل زیادہ تر اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو اس سماجی نظام سے مطمئن تھے ، یا وہ جو اس سماجی نظام سے خوش تو نہیں تھے لیکن مستقبل کی طرف دیکھنے کے بجائے ماضی کی طرف دیکھتے تھے ۔ ایک طبقہ موقعہ پرستوں کا تھا جو اخبار کسی نظریہ کو سامنے رکھ کر نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے لئے نکالتے تھے ۔ ان کی کوئی پالیسی نہیں تھی ۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو ان تمام باتوں کا شدت سے احساس تھا ، وہ ایک عرصہ سے ان پر غور کر رہے تھے اور لائحہ عمل بھی تیار کر رہے تھے ۔ اسی کے پیش نظر مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے ہفتہ وار " الہلال " نکالنے کا فیصلہ کیا ۔ " الہلال " مولانا آزاد کی زندگی میں اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ مولانا آزاد نے ابتدائی شمارے میں ہی اپنے مقاصد و نظریات کی وضاحت کردی تھی ، کہتے ہیں:

" ہمارے عقیدے میں جو اخبار اپنی قیمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی اور رقم لینا جائز رکھتا ہے وہ اخبار نہیں بلکہ اس فن کے لئے سرتاسر عار ہے ۔ ہم اخبار نویس کی سطح کو بہت بلندی پر دیکھتے ہیں اور معروف و نہی عن المنکر کا فرضِ الہیٰ ادا کرنے والی جماعت سمجھتے ہیں ۔ پس اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہئے اور چاندی و سونے کا تو سایہ بھی اس کے لئے سمِ قاتل ہے ۔ جو اخبار نویس رئیسوں کی فیاضیوں اور امیروں کے عطیوں کو قومی عطیوں ، قومی امانت اور اسی طرح فرضی ناموں سے قبول کرلیتے ہیں وہ بہ نسبت اس کے کہ اپنے ضمیر اور نورِ ایمان کو بیچیں ، بہتر ہے کہ دریوزہ گری کی جھولی گلے میں ڈال کر قلندروں کی کشتی کی جگہ قلم دان لے کر رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پر گشت لگائیں اور گلی کوچہ " قلم ایڈیٹر کا " کی صدا لگا کر خود اپنے تئیں فروخت کرتے رہیں ۔ "(۱)

اقتباس پیش کرنے کا مقصد مولانا آزاد کے " الہلال " شائع کرنے کے مقاصد و نظریے کی وضاحت کرنا ہے۔ مولانا آزاد نے " الہلال " شائع کرکے ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کو بیدار کیا۔ یہ اخبار کلکتہ سے اس وقت شائع ہوا جب مسلمان یہ فیصلہ نہیں کرپارہے تھے ۔ کہ انھیں کون سا قدم اٹھانا چاہیے ۔ جس سے قوم و معاشرے کی فلاح ہو ۔ اس وقت مسلمانوں کے سیاسی و سماجی حالات بہتر نہیں تھے ، اس جمود و تعطل کے دور میں مولانا آزاد نے " الہلال " کے ذریعہ مسلمانوں میں مذہبی وسیاسی انقلاب برپا کردیا۔ انھوں نے فرسودہ خیالات سے انحراف کیا اور ایک نئی سوچ عطا کی ۔ مولانا آزاد نے قرآن کریم کو بنیاد بنا کر اپنے خیالات و نظریات کی تبلیغ و اشاعت کی ساتھ ہی علما کے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ قائم کیا اور مذہب کو سیاست سے جوڑ دیا۔ سجاد انصاری کہتے ہیں:

> " مولانا آزاد قرآن لے کر اٹھے ، مسلمان مبہوت ہوگئے کہ تیرہ سو برس کے صحیفے میں حال ہی کے نئے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے نکات و حقائق پوشیدہ ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام کی شخصیت ان بلند نظر شخصیتوں میں سے ہے جن کی عظمتوں کا محاصرہ نہیں کیا جاسکتا ۔ دور جدید میں مذہب کو اگر کسی نے سیاست سے صحیح طور پر ملا دیا ہے تو وہ تنہا ابوالکلام ہیں ۔ "(۲)

موجودہ دور میں یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ آیا مذہب کو سیاست سے الگ ہونا چاہیے یا نہیں ؟ یہ ایک بحث طلب موضوع ہے ۔ دانشور کسی بھی ایک نقطہ پر پہنچنے سے قاصر ہیں ۔ اس معاملہ میں ایک رائے بننا ممکن نظر نہیں آتا ۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ مذہب کے صحت مندانہ تصورات کے ساتھ ہی سیاست میں داخل ہونا چاہیے ۔ جذباتیت سے اپنے آپکو الگ کرنا پڑے گا ۔ پھر بھی یہ اس مسئلہ کا حل نہیں کیوں کہ مذہب کے صحت مندانہ تصور اور مذہب کے جذباتی پہلو میں کس طرح حد فاصل قائم کیا جائے ۔ یہ بھی ایک سوالیہ نشان ہے ۔ یا پھر ہمیں مولانا آزاد کے نظریے پر عمل کرنا چاہیے ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا آزاد نے " الہلال " کے ذریعہ مسلمانوں کو جو دعوت دی اس کا مقصد مذہبی و سماجی زندگی کو بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں آزادی کا جوش بھی بیدار

کرنا تھا۔ "الہلال" بظاہر مسلمانوں سے مخاطب تھا لیکن سچائی یہ ہے کہ وہ صرف مسلمانوں سے ہی نہیں بلکہ اپنی قوم اور ہم وطنوں سے مخاطب تھا، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد ہو کر جنگ آزادی میں حصہ لینے کی تلقین بھی کر رہا تھا۔

"الہلال" میں مذہبی و سیاسی مضامین کے ساتھ ساتھ سماجی، ثقافتی اور سائنسی موضوعات پر بھی مضامین شائع ہوتے تھے۔ مولانا آزاد کو معلوم تھا کہ صحافت مشکل کام ہے۔ اخباروں سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ حقیقت سے عوام کو باخبر کرتے رہیں، جن میں مصلحت اندیشی کا شائبہ تک نہ ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ صحافی کا نظریہ ترقی پسند ہو اور وہ سائنٹفک انداز سے دیکھنے کا عادی ہو۔ مولانا آزاد کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ہم ادب میں، فلسفہ میں، آرٹ میں حتیٰ کہ زندگی کے کسی بھی شعبہ جات میں سائنس کی مدد کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ ہماری زندگی سے سائنس کا گہرا رشتہ ہے، اسلئے ہمارے اخباروں میں سیاست اور بین اقوامی سیاست کے ساتھ ساتھ سائنس کا حصہ بھی ناگزیر ہو گیا ہے۔

مولانا آزاد نے سائنٹفک اصول اپنا کر ایک نمونہ پیش کیا۔ "الہلال" نئے خیالات کا نقیب بن کر سامنے آیا۔ مولانا آزاد سوشلزم کو اسلام کا منافی نہیں مانتے تھے۔ جس طرح اشتراکیت سرمایہ داری کے خلاف ہے۔ اسلام بھی یہ اجازت نہیں دیتا کہ چند لوگوں کے پاس دولت جمع ہو جائے، اگر ایسا ہوگا تو غریبوں اور مزدوروں کا استحصال ہوگا۔ اسلام ذخیرہ اندوزی کے سخت خلاف ہے۔ مولانا آزاد نے جمہوریت کو اولیت دی، ان کے نزدیک بغیر جمہوریت کے اشتراکیت بے معنی ہے۔ تاہم مولانا آزاد کے سوچنے کا انداز ترقی پسندانہ ہے۔ اس ضمن میں جواد زیدی کہتے ہیں:

> "صحیح معنوں میں "الہلال" پہلا اخبار تھا جس نے اسلامی سیاست میں ایک ترقی پسندانہ اور آفاقی نظریہ اپنایا اور اس کی ترویج میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔" (۳)

مولانا آزاد کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ انھوں نے نثر میں ثقیل اور مشکل الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ یہ بات درست ہے "الہلال" کے ابتدائی شمارے میں عربی اور فارسی الفاظ کا

استعمال زیادہ ہے ۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مولانا آزاد کی مادری زبان عربی تھی۔ اسلئے عربی الفاظ کا استعمال لاشعوری طور پر ہوا ہے ۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انھیں اردو اور فارسی پر یکساں عبور تھا ۔ دراصل مولانا آزاد شروع میں تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے ۔ اس لئے انھوں نے خواص کی زبان کا انتخاب کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دنوں میں ایک خاص طبقہ ہی " الہلال " کا قاری بنا ۔ ان کا مقصد بھی یہی تھا پہلے وہ تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنے ساتھ کرنا چاہتے تھے ۔ جب انھیں اپنے مقصد میں کامیابی مل گئی تو مولانا آزاد نے سہل اور سادہ زبان اختیار کی ۔ کیونکہ وہ عوام کو بھی ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے ۔ اس کا خاطر خواہ اثر یہ ہوا کہ " الہلال " کو خواص و عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی ۔ " الہلال " نے مسلمانوں کو متحد کیا اور مجاہدین آزادی کی حوصلہ افزائی کی ۔ انہیں بتایا کہ جنگ آزادی میں حصہ لینا مذہبی فریضہ انجام دینے کے مترادف ہے ۔ چونکہ " الہلال " کی تحریروں میں شعلہ بیانی زیادہ تھی اسلئے حکومت اس اخبار سے خوفزدہ رہنے لگی ۔ تاہم حکومت نے اسے بند کرنے کا پروانہ جاری کردیا اور اس طرح حکومت کے دباؤ میں آکر "الہلال " کو بند کرنا پڑا ۔ مولانا آزاد نے ۱۹۱۵ء " البلاغ " نکالا ۔ یہ " الہلال " کی توسیعی صورت تھی ۔ " البلاغ " جلد ہی بند ہوگیا ۔

مولانا آزاد " البلاغ " کے شمارے میں کہتے ہیں:

" بلاشبہ میں نے پریس کھولا اور یقینا میں نے ایک رسالہ جاری کیا لیکن یہ صرف اسلئے کہ اظہار خیال اور تبلیغ مقصد کا اس سے بہتر اور زود عمل طریق کوئی اور نہ تھا اور میرے پاس اتنی دولت نہ تھی کہ مفت میں چھاپ کر تقسیم کیا کرتا ۔ پس میرے تمام کاموں کی بنیاد تبلیغ ہے نہ کہ تجارت ۔ میری اخبار نویسی کو تم اخبار نویسی نہ قرار دو کیوں کہ میں نے اسے ضمنا اختیار کیا ہے اور وہ میرا اول کام نہیں ہے ۔ میں نے اگر اسے اختیار کیا تو ہندوستان کی اخبار نویسی اور مطبوعہ اشاعت کے لئے اور یہ اس کے لئے بہتر ہوا ۔ اس کے لئے ترقی کی ایک بالکل نئی راہ نکلی ہے ۔ "(۳)

مندرجہ بالا اقتباس سے مولانا آزاد کے "الہلال" و "البلاغ" شائع کرنے کے مقاصد کو سمجھا جاسکتا ہے اور ساتھ ہی اس سے مولانا کے نظریے کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔

مولانا آزاد کی نثر کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مربوط ہوتی ہے۔ ایک خصوصیت یہ بھی ہے وہ مشکل الفاظ اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ گراں نہیں گزرتے۔ مولانا آزاد نے منفرد نثری اسلوب کا آغاز کیا اور نثر کے اسالیب کو نظم کی سرحدوں تک پہنچا دیا۔

نیاز فتحپوری کا تاثر ملاحظہ ہو:

"آپ کا لب و لہجہ آپ کا انداز بیان واللہ مجھ سے تو وداع جان چاہتا ہے اگر آپ کی زبان میں مجھے کوئی گالیاں دے تو میں اس کو ہر وقت چھیڑا کروں کہ " کچھ تو لگے گی دیر سوال و جواب میں "(۵)

الغرض مولانا آزاد نے اردو صحافت میں جو کردار ادا کیا وہ ناقابل فراموش ہے۔ اردو صحافت میں "الہلال" و "البلاغ" کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اور جب بھی اردو اخباروں کا ذکر آئے گا ان میں "الہلال" کا نام سرفہرست ہوگا۔

سرسید اور شبلی کے بعد مولانا آزاد تیسری ادبی شخصیت ہیں جو صحافت سے براہ راست متعلق ہیں۔ "تہذیب الاخلاق" اور "الندوہ" اوّل الذکر دو محترم بزرگوں کے طفیل معروف ہے جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شہرت کا بہت کچھ دارومدار "الہلال" پر منحصر ہے، جس نے مولانا آزاد کو متعارف ہی نہیں کیا بلکہ مقتدر بنایا۔ دوسرے اکابرین ادب کے برخلاف وہ صحافت کے راستے ادب و سیاست میں آئے۔ لہذا مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت کو ایک دوسرے زاویے سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

حواشی:

۱۔ "الہلال" ۲۰ جولائی ۱۹۲۱ء بحوالہ مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت اور کارنامے ۴۳۸ مرتبہ خلیق انجم

۲۔ محشر خیال۔ ص ۱۱۲ ۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت اور کارنامے۔ ص ۴۱۲ مرتبہ خلیق انجم

۴۔ البلاغ (۲۱۔۱۴) ۲۸ جنوری ۱۹۱۶ء بحوالہ مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت اور کارنامے ۴۴۸ مرتبہ خلیق انجم ۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ عبداللہ بٹ ۱۲۰

جہان آباد

سید ناصر نذیر فراق دہلوی

جواب کاہے کو تھا لاجواب تھی دہلی
مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دہلی

ایک روز امیر تیمور صاحبِ قرآن اپنے مرکب پر سوار دارالسلطنت بخارا کی گلی کوچوں میں چکر لگا رہا تھا۔ جمعدار رکاب تھامے ساتھ تھا اور امیر پوچھتا جاتا تھا کہ اس گلی کا کیا نام ہے، اس کوچہ کو کیا کہتے ہیں، یہ کون سا محلّہ ہے۔ یہ گلی سراجول کی کہلاتی ہے۔ یہ کوچہ روشن آباد ہے، جو چلتے چلتے ایک تنگ کوچہ میں پہنچا اور اس نے یہ دیکھا کہ بانسوں کے پھاٹک کے آگے چند نوجوان ایک دری کے فرش کو چاروں طرف سے پکڑ جھاڑ رہے ہیں اور دھول اُڑ رہی ہے۔ امیر نے پوچھا "جمعدار یہ کیا جگہ ہے؟" جمعدار نے کہا "حضور یہ کوچہ حضرت سیدّ خواجہ بہاؤالدین نقشبند کا ہے۔ یہ بانسوں کے پھاٹک والی آپ کی خانقاہ ہے۔ اس میں آپ تشریف فرما ہیں۔ امیر خانقاہ کی شطرنجی کو جھاڑ رہے ہیں۔" امیر کو دیکھ کر نوجوانوں نے شطرنجی جھاڑنے سے اپنا ہاتھ روک لئے تھے اور امیر ان لوگوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔

امیر: (نوجوانوں سے) تم ہمارا لحاظ نہ کرو۔ شطرنجی بدستور جھاڑے جاؤ۔

آپ جانتے ہیں مرید اور طالب علم الھڑ ہوتے ہیں۔ نوجوانوں نے دری کو اس زور سے پٹخارا کہ دھول کے مارے امیر کا ساز و یراق اور امیر کا چہرہ، تاج، گھوڑا وغیرہ سب اٹ گئے امیر نے اڑتی ہوئی دھول کو دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ پر مل کر کہا۔ "غبار المدینۃ الشفاء" اور گھوڑے کو مہمیز کیا اور یہ جا وہ جا۔

مریدوں نے خانقاہ میں آکر امیر کا سارا حال حضرت کی خدمت میں عرض کیا۔ حضرت خواجہ سید بہاؤالدین نقشبند نے کہا۔ لڑکو! کہتے ہو کہ امیر تیمور ہماری درگاہ کی خاک منہ

پر مل گیا۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ امیر اپنی عاقبت سنوار گیا۔ الٰہی اس ترک بچہ نے جس طرح تیرے رسولؐ کی زیارت کا ادب کیا ہے اسی طرح اس کے بدلے میں اس کا نام مشرق سے مغرب تک شمال سے جنوب تک روشن کردے۔ اس کی اولاد در اولاد کو پشتوں تک سلطنت بخش دے۔ چنانچہ امیر تیمور سے میراں شاہ سلطان ابو سعید میرزا۔ سلطان محمد میرزا۔ عمر شیخ میرزا۔ بابر۔ ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہاں گیارھویں سلطنت تھی۔

شاہ جہاں کو تعمیر کا دلی شوق تھا۔ نئی دلّی بسانے کی تدبیر شروع کی۔ لال قلعہ اور اس کی اندرونی عمارتوں اور جامع مسجد اور نئے شہر کے نقشے ہوائے گئے۔ شہنشاہ نقشوں میں بذات خاص اصلاح دیتے تھے۔ میر عمارت نے ہر مکان ہر محل کی لاگت کا تخمینہ تیار کیا اور ملکوں ملکوں سے سنگِ مرمر، سنگِ سرخ، سنگِ سیاہ، سنگ باسی اور ہزار ہزار قسم کا مصالحہ اور سامان آنے لگا۔ میر عمارت نے سپنیا اینٹ کا پیمانہ ایک ٹھیکیدار کو دے کر کہا۔ ''ایسی اینٹ تیار کرو۔'' مگر اینٹ کچی نہ رہے، لاکھوری ہو۔ بادشاہی کام ہے، دھیان سے کرنا۔ ٹھیکیدار نے کہا۔ پیشگی نقد دلوایئے۔ میر عمارت نے لاکھ روپے کی چٹھی لکھ دی۔ خزانے سے فوراً روپیہ پٹ گیا اور ٹھیکیدار کام میں مشغول ہو گیا۔ اینٹوں کا پزادہ چڑھ گیا۔ کچھ مدت بعد میر عمارت کے پاس ٹھیکیدار بسورتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ ''میں تو برباد ہو گیا۔ پزادوں کی آنچ تیز ہو گئی۔ اینٹوں کا کھنگر بن کر رہ گیا۔ بادشاہ اس بندہ کا زن بچہ کولھوں میں پلوادے گا۔ اس لئے میں بھاگتا ہوں۔ دیکھئے یہ کھنگر ہے۔''

میرعمارت: ''گھبرانے کی کیا بات ہے؟''

اور قلم اٹھا کر اس نے ایک عرضی لکھ کر بادشاہ کے حضور میں بھیجی کہ لال قلعہ اور جو شاہی عمارتیں دریا کے کنارے بنائی جائیں گی ان کی بنیادوں میں بجائے سنگ خارہ کے کھنگر بھرا جائے گا۔ کیونکہ کھنگر پانی کو خوب جذب کرتا ہے اور بنیاد مضبوط رہتی ہے اور بنیاد کی مضبوطی کے ساتھ اوپر کی عمارت کا مضبوط ہونا شرط ہے۔ کھنگر کا نمونہ ملاحظہ کے لئے بھیجتا ہوں۔ لاگت اس پر دوگنی آتی ہے، منظوری دی جائے۔

جواب آیا کہ کھنگر کا ہونا مناسب ہے۔ دوگنی لاگت منظور بدولت ہے۔

میر عمارت نے ٹھیکیدار سے کہا۔ ''ایک لاکھ پہلے کھنگر کے نقصان کا لو اور اب لاکھ کے بدلے دو لاکھ لیتے رہو اور نرا کھنگر پکاتے رہو۔''

میر عمارت کی یہ عنایت اور بادشاہ کی پرورش دیکھ کر ٹھیکیدار خوش ہو گیا اور دل

سے کام کرنے لگا۔ جب قلعہ کی نیو رکھنے لگے تو بڑے بڑے لوہے کے کڑھاؤ اور تانبہ کی ناندوں میں چربی کھولائی جاتی تھی اور پھلکیوں کی طرح اس میں کوری اینٹیں ڈالی جاتی تھیں اور اینٹیں جب خوب چربی پی لیتی تھیں تو نکال کر ٹھنڈی کی جاتی تھیں اور گچ کے ساتھ بنیاد میں رکھی جاتی تھیں۔ گچ میں سفیدی نارنول کے پتھر کی، ماش کا آٹا مردار سنگ، گوند، السی کا تیل، سن مقرض ڈال کر بیل گری کا پانی چھان کر دیا جاتا تھا۔ یہ ادنیٰ قسم کا مصالحہ تھا اور بڑھیا مصالحوں کی تفصیل کے لئے دفتر درکار ہیں۔ لال قلعہ اور اس کے اندرونی مکان، قصر و دیوان بن رہے تھے۔ تخت طاؤسی کے لئے جواہر تراشے جاتے تھے۔ جنگل میں منگل تھا۔ ہزاروں مزدور معمار کاریگر خیموں میں، چھولداریوں میں، جھونپڑیوں میں پڑے تھے۔ دور دور کے پہاڑوں سے چھکڑوں میں پتھر لدے چلے آتے تھے۔ ایک چھکڑے میں سو سو پچاس پچاس بیل جوتے جاتے تھے۔ سنگتراشوں کی چھینیوں اور ہاتھیوں کی دھڑا دھڑ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر سو قدم کے فاصلے پر ایک خیمہ خزانہ کا برپا تھا۔ ایک ہندو خزانچی اور تین محرر۔ دس سپاہی روپیہ کی حفاظت کے لئے حاضر رہتے تھے۔ روپیہ، اٹھنیاں، چونیاں، دونیاں، پیسے اور کوزیاں رکھی رہتی تھیں۔ کام امانی میں زیادہ اور ٹھیکہ میں کم ہوتا تھا۔ شام کے چار بجے روزانہ چٹھہ بٹ جاتا تھا۔ غریبوں کا پیسہ واجب الاداء مل جاتا تھا۔ لال قلعہ کے لاہوری دروازہ سے شہر کے فرضی لاہوری دروازہ تک اردو بازار ٹینوں اور جھونپڑیوں کی دوکانوں میں لگادیا گیا تھا جس میں جو، گیہوں، جوار، باجرہ کے آٹے سے لے کر قسم قسم کی جنس، کپڑا، ترکاری، کابل و کشمیر کے میوے تک ملتے تھے۔ آگرہ سے حکم پر حکم چلا آتا تھا کہ اردو بازار میں ہر شے کی دوکانیں اضافہ ہوتی رہیں تاکہ غیر ملکوں کے کاریگر جو اپنا دیس چھوڑ کر پردیسی بنے ہیں، تکلیف نہ پائیں اور اپنے وطن کی اشیاء اور غذا انہیں میسر ہو۔ شہر کا نقشہ بنا کر اس کے حصہ حصہ کر دئے گئے اور شاہجہاں نے اس حصوں کو اپنی اولاد پر بانٹ دیا تھا اور فرمادیا تھا کہ لاگت سب خزانہ سے ملے گی۔ اپنے اپنے حصہ میں عمدہ عمدہ مکانات اور محل بنوالو تاکہ شہر اچھی اچھی عمارتوں سے آراستہ ہو کر آبادی کی صورت پکڑے۔ چنانچہ دکن کا حصہ اورنگ زیب کے اہتمام سے زیبائش پانے لگا۔ کشمیری دروازہ کے قلعہ کو داراشکوہ نے فلک شکوہ قصر وایوان سے سنوارا۔ چاندنی چوک کے ٹکڑے کو جہاں آرا بیگم کے غلام نے جو ناتواں تخلص کرتا تھا، باغ اور گلشن اور حماموں سے رشک فردوس بنایا۔ نئوں کا کوچہ اسی ناتواں کی یادگار ہے۔ جامع مسجد کی تعمیر نواب سعد اللہ خان وزیر کو سپرد تھی اور اس کی نیویں بھری گئی تھیں۔ وہ انجینئر جس کی سپردگی میں جامع مسجد کا نقشہ تھا۔ یکایک مع نقشہ کے

غائب ہو گیا اور مسجد کی تعمیر کا کام اینڈ ہو کر رہ گیا۔ اس امر کی خبر پا کر شہنشاہ ناخوش ہوئے، حکم صادر ہوا کہ جو شخص اس کافر منش مسلمان کو جس نے خانۂ خدا کی تیاری میں روڑا اٹکایا ہے پکڑ کر لائے گا تو اسے اس قدر انعام دیا جائے گا۔ مگر وہ خدا کا بندہ ایسا الوپ ہوا کہ تین برس تک کسی نے اس کی جھلک بھی نہ پائی۔ تین سال بعد وہ یکایک دربارِ شاہی میں حاضر ہو گیا۔ حضور والا نے فرمایا۔ ''کم بخت یہ حرکت کیا تھی؟'' اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ''جامع مسجد کی عمارت بہت بھاری ہو گی۔ نئی بنیاد پر ایسی اونچی عمارت کا لیجانا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ برسات کا پانی نیو میں مرتا اور اس کے در و دیوار نیچے کھسکتے اور ڈاٹیں، کمانیں، محرابیں جھک جاتیں۔ سرکار کے لاکھوں روپے پر پانی پھر جاتا اور میری آبرو کے ساتھ ساتھ جان بھی جاتی۔ نیک نیتی اور مصلحت سے فدوی روپوش ہو گیا تھا۔ تین برساتیں کھا کر نیو لو ہالاٹ ہو گئی ہے۔ اب جو کچھ عمارت کھڑی ہو گی صدیوں تک کھڑی رہے گی۔ حضور کو اختیار ہے کہ فدوی کی جاں بخشی ہو یا سزا دی جائے۔''

بادشاہ نے انجنیئر کے عذر کو غور سے سن کر اس کی خطا معاف فرمائی اور خلعت سے سرفراز کیا اور جامع مسجد نواب سعد اللہ خاں کے اہتمام سے تیار ہونے لگی۔ بہر حال مسجد اور لال قلعہ اور شہر بن گیا۔ حضور والا نے دیوان خاص میں تختِ طاؤس پر جلوہ افروز ہو کر جشنِ ماہتابی منایا اور ایک فرمان جاری فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ فخر البلاد جہان آباد عرف شاہجہاں آباد میں جو رعایا آباد کی گئی ہے اس میں خوش حال کم اور اہلِ حاجت زیادہ ہیں۔ پھر ان میں کاروباری ہیں، مزدور ہیں، بیمار ہیں، عورتیں ہیں، پردہ نشین جو برقعہ اوڑھ کر بھی باہر نہیں نکلتی ہیں اور بغیر سودے سلف کے کام نہیں چلتا ہے۔ اس واسطے میں حکم دیتا ہوں کہ ترکاری فروش، گوشت فروش، میوہ فروش، پارچہ فروش، کسیرہ، گندی، تانبے کے برتن فروش، موچی، مٹی کے مٹکے، ٹھلیاں، صراحیاں بیچنے والے، اوپلہ ایندھن بیچنے والے، سادہ کار، چاندی سونے کے زیور بیچنے والے، حلوائی، بساطی اپنے اپنے سامان خوانچوں میں لگا کر، گٹھڑیوں میں کندھے پر رکھ کر، بہنگیوں میں کہاروں کے کندھے پر لاد کر گلی گلی، کوچہ کوچہ، محلّہ محلّہ پھریں اور اپنی اپنی جنس کا نام لے آواز لگائیں۔ بزاز کہے۔ ''نینو، لٹھا، ڈوریہ، ململ۔'' مچھلی والا ''مچھلی دریاؤ کی، لو مچھی۔'' ''کھٹ بنے، بڑھئی'' لوہار اپنے اپنے پیشے کا نام لے کر پکاریں۔ یہاں تک کے موری دھونے والے پکار کر کہیں ''موری دھلوا لیجئے۔'' تاکہ گھر بیٹھے اہلِ حاجت کی ضرورت رفع ہو جائے۔ چونکہ اس حکم تازہ کی تعمیل مشکل سے پیشہ ور کریں گے اس لئے کوتوالی کے برق انداز لوگوں کے ساتھ رہیں اور شہر میں گشت کروائیں تاکہ گاہک اور سودا بیچنے والے اس طور

کے لین دین کے عادی ہو جائیں اور بیچنے والوں کو نفع ہو اور مول لینے والوں کو بازار جانا نہ پڑے اور ہر قسم کی چیزیں اپنے دروازہ پر لے لیں۔ جیسی نیت ویسی برکت۔ شاجہان بادشاہ کی یہ تدبیر ایسی راس آئی کہ آج اس اُجڑے دیار میں لینے والی بیٹی کا سارا جہیز اپنے گھر کے دروازہ پر کواڑ کی آڑ میں کھڑی ہو کر مول لے لیتی ہے۔ شاہجہان بادشاہ کے بعد سلطنت درجہ بہ درجہ منتقل ہوتی ہوئی محمد شاہ رنگیلے تک پہنچی اور لال قلعہ کا دیوان خاص عیش و نشاط کے سامانوں سے فردوس بریں بن گیا۔ معتمد الملک سید ہاشم علوی خاں حکیم رنگینیٔ ذوق کے مددگار تھے۔ ان کے حکم سے شتر خانہ بادشاہی میں گرمی جاڑا بر سات دو سو اونٹ بدمست رکھے جاتے تھے اور ان کے کانوں کے پیچھے کی مستی دوا کے کام میں آتی تھی۔ میر شکار جنگلی کبوتروں کے بیس انڈے تازہ بہ تازہ اور بارہ انڈے چڑیا کے پیش کرتا تھا۔ کیونکہ دونوں چیزیں مقوی ہیں۔ شراب پانی کی طرح لنڈھائی جاتی تھی۔ ایک رات محمد شاہ نشہ کے سرور میں اس درگاہ کے اندر مع جوتیوں کے گھس گئے جس میں حضور رسالت پناہ اور بزرگوں کے تبرکات امیر تیمور کے عہد سے جمع کئے گئے تھے۔ یہ درگاہ لال قلعہ میں ہی تھی۔ اس بے ادبی اور گستاخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ نادر شاہ آیا اور لال قلعہ کو اور شاہ جہاں آباد کو اجاڑ کر چل دیا اور بہ قول مومنؔ ۔

حُسنِ روز افزوں پہ غرہ کس لئے اے ماہ رو
یونہی گھٹتا جائے گا جتنا کہ بڑھتا جائے گا

مغلیہ سلطنت گھٹتے گھٹتے اور سکڑتے سکڑتے لال قلعہ کی چار دیواری میں ٹھٹھر کر رہ گئی۔ دانایانِ فرنگ کی تدبیر و شمشیر سے کوئی راجہ، کوئی حاکم، کوئی رئیس، کوئی نواب عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ شاہ عالم بادشاہ نے فرنگیوں کو بیٹا بنا لیا تھا۔ ان کی دی ہوئی پنشن کو اللہ آمین کر کے قبول کر لیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ ایک شاہ عالم بادشاہ کے دل میں فرنگیوں نے گھر نہیں کر لیا تھا۔ بلکہ ہندوستانی عموماً انہیں اچھا جاننے لگے تھے اور ان کی سپاہ اور شاہراہ اور تنخواہ کی چہ چہ کی زبان پر تعریف تھی۔ یعنی فرنگیوں کی فوج جرار ہوتی ہے۔ دس ہزار پر ایک ہزار بھاری ہوتی ہے۔ شاہراہ یعنی کلکتہ سے جہاں ان کی حکومت پہنچی ہے پکی سڑک کے ساتھ ساتھ ریل اور ڈاک بھی دوڑی چلی جاتی ہے اور تین تین دن میں خط پتر ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک پہنچا دیتی ہے۔ تنخواہ کی تعریف یہ ہے کہ جسے نوکر رکھتے ہیں اس کا درمایہ یا طلب یا وظیفہ بے قیل و قال بے چون وچرا پہلی کی پہلی کو دیتے ہیں۔ راجہ مہاراجہ نوابوں اور بادشاہوں کی سرکار سے نوکر کی تنخواہ تین تین برس نہیں ملتی تھی اور نوکر کا گھرانہ فاقہ کر کے برباد ہو جاتا تھا۔

(۲)

ابو نصر معین الدین اکبر ثانی جب بیٹے کی منت پوری کرنے اور پھول والوں کو سیر منانے مہر دلی حاضر ہوئے تھے تو عجب سماں تھا۔ برکھا رت، ساون کا مہینہ، بادشاہی خیمے مخملی باناتی اطلسی سبز سرخ زرد ریشمی کلابتونی سوتی طناؤں سے جکڑے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے سنہری کلس اور شمسے سورج میں چمک رہے تھے اوپر نیلا آسمان نیچے زمین پر سبزہ کا فرش اور خیموں کا سلسلہ اور جا بجا پانی میں ان کا عکس طلسمات کا عالم پیدا کر رہا تھا۔ بادشاہی خیمہ سے لے کر حضرت قطب صاحب بندہ نواز کی درگاہ شریف تک جہاں مستورات جا سکتی ہیں۔ دورویہ قنات کھڑی تھی کیونکہ ملکۂ دوراں میرزا جہانگیر کو لے کر منت ادا کرنے کے لئے درگاہ میں حاضر ہوں گی۔ تیاری تو صبح سے ہو رہی تھی مگر دن کے تین بجے ظل سبحانی نے کہا پنکھا چڑھانے کا وقت آ گیا۔ بس ملکۂ دوراں نے پچاس خوان اندرسے اندر کی گولیوں اور پھینیوں کے آراستہ کئے ایک چاندی کی کشتی میں سونے کا پنکھا جس میں پنہ، پکھراج، نیلم، یاقوت اور سچے موتی جڑے تھے جس کی بالشت بھر نیچی جھالر کو بیگم نے جوہی کی کلیوں سے خود گوندھا تھا۔ مرزا جہانگیر کو دولھا بنا کر سہرا پھولوں کا، بدھی، طرہ عطر میں بسا کر اس کے سر پر بندھوا کر وہ کشتی صاحب عالم کے سر پر بسم اللہ کہہ کر بیگم نے رکھی اور بادشاہ زادہ کی بلائیں لے کر کہا۔ ''اماں میرا منہ نہ تھا کہ تو فرنگیوں کے چنگل سے نکل کر شاہجہان آباد آئے اور میں تجھے دیکھوں یہ سب حضرت کا صدقہ ہے۔ جان من منت کی کشتی سنبھال کر اور سر ادب نیاز سے جھکا کر درگاہ کو چلو۔ آؤ۔ غلاف شریف کی سینی بادشاہ نے اپنے سر پر اور صندل دان عطر دان بیگم نے اپنے سر پر اور مٹھائی کا خوان بادشاہزادوں نے اپنے سروں پر رکھ کر سب نے مل جل کر آستانۂ پاک کی راہ لی۔ بیگمیں بادشاہزادیاں تلواں جوڑے پہنے تھیں۔ گوکھرو کے جال کے سلمہ ستارہ کلابتون کے تمامی، زری بوٹی، زربفت، کمخواب زری گاچھ اطلس دلدائی، بابر نیٹ بنارس گجرات سورت احمد آباد شریف لاہور کے شاہی کارخانوں، ریشمی اور زرین کپڑوں کے لباس پہن کر آراستہ ہو رہی تھیں۔ لاکھوں روپیہ کا جڑاؤ گہنا ہاتھ گلے میں تھا۔ پور پور نارنول کی مہندی رچی ہوئی تھی، ڈھیلے پائنچوں کو دو لونڈیاں اٹھائے چلتی تھیں تو دو باندیاں پیچھے دوپٹہ کو سنبھالے چلتی تھیں۔ آگے آگے روشن چوکی اور نفیری بجانے والیاں سب عورتیں تھیں۔ بیگموں کے جھانجھن چوڑیوں اور پازیب کی جھنکار سے زندہ اور مردوں کے دل کانپتے تھے۔ قنات در قنات یہ سب درگاہ شریف میں پہنچے۔ باجے گاجے سب آستانے کے باہر ہی تھما دئے گئے۔ ملکۂ جہاں اور سب

عورتیں فرخ سیر والی جالیوں تک پہنچ کر رک گئیں۔ اگرچہ ساری درگاہ کا زنانہ ہو رہا تھا مگر عورتوں کے لئے ہمیشہ سے یہی حدِ ادب ہے۔ بادشاہ اور مرزا صاحب اور سب مرد مزار شریف پر گئے اور پہلے غلاف پھر صندل چڑھایا اور اوپر سے عطر لگایا۔ پنج آیت پڑھی گئی۔ شیرینی تقسیم ہوئی۔ نقد نذرانہ جھری میں بھر دیا گیا۔ بادشاہزادوں کو قدم بوس کرایا اور سب حاجتی دعا کر کے قنات کے اندر پلٹ کر سراپردہ شاہی میں داخل ہوئے۔ رات کے کھانے کے بعد محلسرا میں ناچ گانا ہونے لگا۔ صحن میں کھم گڑے تھے۔ نو عمر بادشاہزادیاں جھولے میں بیٹھیں اور گائنیں انہیں جھلانے اور یہ غزل گانے لگیں:

میری دل کی کنجی میری جان جھولا

میری آرزو میرا ارمان جھولا

پھول والوں کی سیر سے فارغ ہوکر بادشاہ شاہجہان آباد تشریف لائے اور جشن کا حکم دیا اور فرمایا کہ جشن سے پندرہ دن پہلے تورہ بندی کی جائے یہ رسم دلّی سے نٹ گئی اور تانتی نے تورہ کا نام بھی کم سنا ہے اس لئے فقیر (فراقؔ) تورہ کے معنی عرض کرتا ہے۔ تورہ ترکی زبان میں قانون یا آئین کو کہتے ہیں۔ اس واسطے دہلی میں محاورہ ہے "شرع تورہ" یعنی شریعت اور قانون دونوں ایک بات۔ مگر عورتیں اپنی بول چال میں طنز کے طور پر تورہ غرور اور غصے کے معنے میں استعمال کرتی ہیں مثلاً "اللہ رے عورت ترا تورہ" "وا یہ اپنا تورہ کسی اور کو دکھانا۔ تورہ بیٹی۔

دوسرے ترکی زبان میں تورہ کے معنی کھانے کے خوان کے ہیں اور توران میں اس کھانے کے خوانوں کو کہتے ہیں جو شادی بیاہ سے کچھ دن پہلے بطور حصہ بخرہ کے بھائی بندوں عزیزوں دوستوں کے گھر بھجوائے جاتے ہیں۔ مغل بادشاہ ہندوستان میں فرمانروا ہوئے تو ان کے ساتھ تورہ چنگیزی بھی آیا۔ بیاہ شادی سے دو ہفتہ پہلے تورہ بن گئے نام بنام، تاکہ عین تاریخ پر تقریب میں بلڑ نہ ہو اور عزیزوں کو شکایت کا موقع نہ ملے کہ ہم بھوکے رہے یا دستر خوان پر نہ بٹھایا یا ہم دستر خوان پر بیٹھے تو تھے مگر فلاں کھانا فلاں شے ہمارے آگے نہ تھی، ہماری توہین کی گئی۔ اس لئے تورہ کے کھانوں کی فہرست رکھ کر کنبہ خاندان میں بھیج دی جاتی تھی۔ اس کے مطابق لینے والے تورہ لے لیں۔ ایک گھر کے دس تورہ ہیں تو دسوں تورہ ایک دن میں لے سکتے ہیں اور دل چاہے تو دس دن میں لے لیں۔ پھر تورہ کی قیمت بھی تشخیص کر دی جاتی تھی۔ چاہے لینے والے نقد لے لیں۔ ایک منشی مع دوات قلم کے اور پانچ خادموں کے توروں کے ساتھ ہو لیتا۔ ایک تھیلی روپیہ کی بھی اس کے ہمراہ ہوتی تھی، اس کے ذمہ پچاس تورہ ایک دن

میں تقسیم کے لئے ہوتے۔ رسید لے لیتا تھا اور تورہ دے دیتا تھا۔ جو نقد لینا چاہتا تھا اسے نقد دیتا تھا۔ ہر تورہ ایک کہاری کی بہنگی میں ہوتا تھا۔ تورہ جو ادنیٰ قسم کا ہوتا اس کی قیمت پانچ روپیہ ہوتی تھی۔ تورہ کا کھانا مٹی کے برتنوں میں عموماً ہوتا تھا۔ تورہ کے کھانوں کی تفصیل یہ تھی۔
ایک لکڑی کے خوان میں سب سے نیچے :

(۱) باقر خانیاں ڈھائی سیر پختہ کی دو عدد (۲) قورمہ کے دو پیالے، ہر پیالہ میں کم سے کم آدھ سیر قورمہ (۳) کباب شامی پانچ عدد (۴) بریانی دو طباق (۵) تنجن دو طباق (۶) فیرنی دو پیالہ۔ ہر پیالہ میں آدھ سیر (۷) مربہ آم وغیرہ کا ایک پیالی میں (۸) اچار کسی قسم کا ایک پیالی (۹) دہی آدھ سیر ایک پیالہ میں (۱۰) گاؤزبان دو عدد (۱۱) گاؤدیدہ دو عدد (۱۲) نان تنور یعنی آلی روٹی دو سیر کے چار عدد۔ یہ سب کھانے مانڈوں سے ڈھکے ہوتے تھے۔ مانڈہ اس باریک اور روغنی چپاتی کا نام ہے جو شب برات کو پکتی ہے۔

ایک مثل بھی مانڈوں کے متعلق مشہور ہے۔ مُردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں' انہیں اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔

یہ معمولی تورہ ہے ورنہ بادشاہوں کے تورہ ہزار نعمتوں کے، سونے چاندی اور چینی کے برتنوں میں بھی ہوتے تھے۔ اس رسم کو بادشاہوں سے دلّی والوں نے بھی سیکھ لیا تھا اور شہر میں بھی تورہ بندی ہوتی تھی۔ مگر غدر ۱۸۵۷ء کے کچھ دن بعد سے موقوف ہے۔ اب تو پارٹی کی گرماگرمی ہے۔

☆ ☆ ☆

صدارت کا پھندہ، ناچیز بندہ

پرویز یداللہ مہدی

جب سے تعلیم عام ہوئی ہے ہر پڑھا لکھا شخص چاہے گریجویٹ ہو یا انڈر گریجویٹ، اپنے دل میں ہزاروں خواہشوں کے ساتھ ایک خواہش یہ بھی رکھتا ہے کہ زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں اسے کم از کم ایک بار کسی کل ہند، کل شہر، کل محلہ، یا کل مکان قسم کے مشاعرے میں یا جلسے کی صدارت کا شرف حاصل ہو۔ اب رہے انگوٹھا چھاپ افراد تو ان میں سے بیشتر اصحاب ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں کے مصداق کرسیٔ صدارت عظمیٰ سے کم کی خواہش نہیں کرتے۔ جہاں تک کسی مشاعرے یا ادبی جلسے کی صدارت کا تعلق ہے کسی کو اگر ایک بار اس کا چسکہ لگ جائے تو پھر اس سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا، وہ ہر جگہ دوسروں سے اونچی جگہ بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں اکثر منہ کے بل گرتا ہے جسکے باعث وقت سے پہلے اسکے دہن مبارک میں اصلی دانتوں کی جگہ نقلی بتیسی لگ جاتی ہے۔ ایسے غنچہ دہن اصحاب کے دل و دماغ پر ہر گھڑی چونکہ مسند صدارت، سوار رہتی ہے اس لیے جب بھی یہ کسی مسند صدارت پر بیٹھے ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مسند صدارت پر نہیں بلکہ مسند صدارت ان پر بیٹھی ہوئی ہے۔ جلسہ و مشاعرہ گاہوں میں مسند صدارت عموماً عام نشستوں سے کسی قدر اونچی ہوتی ہے اور یہ اہتمام اس لیے کیا جاتا ہے کہ مسند صدارت پر نمائشی چیز کی طرح دھرے ہوئے جناب صدر تمام حاضرین کو بآسانی نظر آسکیں اور یوں شرکائے جلسہ و مشاعرہ کو جناب صدر کی حالت کو

☆ بتوسط شگوفہ: ۳۱۔ بیچلرس کوارٹرس، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۱

دیکھ کر عبرت حاصل کرنے میں سہولت رہے ۔ اس اعتبار سے مسند صدارت کو "مسند عبرت" بھی کہا جاسکتا ہے ۔ مسند صدارت جب تک خالی رہتی ہے بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے اور جی یہی چاہتا ہے کہ یہ اسی طرح خالی ہی رہے لیکن جیسے ہی جناب صدر اس پر تشریف رکھتے ہیں اچھی خاصی کرسی صدارت ، بیت الخلائی کرسی میں تبدیل ہوجاتی ہے اور اس پر متمکن جناب صدر اس مصرع کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دیتے ہیں "

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ۔۔۔۔!

صدارت چاہے کسی مشاعرے یا جلسے کی ہو ،کسی انجمن یا ادارے کی ہو یا ملک کی ہو اس پر قبضہ جمانے کے لیے امیدوار کو پاپڑ تو خیر بیلنے ہی پڑتے ہیں ۔ اس کے علاوہ اور بھی چیزیں درکار ہوتی ہیں مثلاً ملی صدارت کے لیے اہلیت قابلیت صلاحیت سے زیادہ قسمت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ انجمن یا ادارے کی صدارت کو ہتھیانے کے لیے رتبے اور دولت کی حاجت ہوتی ہے البتہ مشاعرے یا جلسے کی صدارت چونکہ وقتی اور عارضی ہوتی ہے لہذا اس کے خواہش مندوں کے لیے جلسہ ہذا کے شامیانے ، کرسیوں اور پھولوں کا خرچہ اٹھالینا ہی کافی ہے اور یہ صرفہ خرچہ بھی شاطر کارکنان پروگرام چندے ، عطیہ اور ڈونیشن کی صورت میں پیشگی وصول کرلیتے ہیں اور جو اصحاب ، رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی کے مصداق اپنی جیب سے دھیلہ خرچ کیے بنا صدارت کے خواب دیکھتے ہیں ان کا کیا حشر ہوتا ہے اس کی صرف ایک مثال پیش ہے ۔کسی زمانے میں ہمارے محلے میں ایک بزرگوار ایسے ہوا کرتے تھے جنھیں صدارت کا عارضہ بری طرح لاحق تھا یوں سمجھئے تیسرا اسٹیج تھا ۔ موصوف خاندانی لٹھ ، پیدائشی ناخواندہ اور پشتینی کنجوس بھی تھے چنانچہ ایک مرتبہ محلے کے چند شریر نوجوانوں نے مفت میں صدارت کرنے کا بھوت ان کے سر سے اتارنے کا منصوبہ بنایا موصوف کی صدارت میں جلسہ کا انعقاد کیا اور پہلے ہی ان پر یہ بات واضح کردی کی وہ منتظمین جلسہ کی ہر بات ہر حکم مانیں گے لہذا گلپوشی کے وقت ان سے کہا گیا ۔ جناب صدر ،مسند صدارت پر چپ چاپ لیٹ جائیے ۔۔۔۔!"

اس عجیب و غریب حکم پر جناب صدر نے گھبرا کے پوچھا ۔ لیٹ جاؤں !وہ کیوں !کیا صدر کو لٹا کر گلپوشی کرنے کا کوئی نیا طریقہ رائج ہوا ہے ۔؟"

جی ہاں ۔۔۔۔۔ سب نے ہم آواز ہوکر جواب دیا ۔

کب سے !" جناب صدر نے گڑبڑا کر پوچھا۔

جواب ملا .... "آج ہی سے ..... ایک تو آپ نے اپنی انٹی ڈھیلی نہیں کی دوسرے آپ کی شخصیت اتنی مشہور و معروف بھی نہیں ہے کہ کوئی آپ کے لیے پھولوں کے ہار لے آتا۔ آپ کے "فری فنڈ" (Free Fund) میں صدارت کرنے کے شوق کو دیکھتے ہوئے یہ دیکھیے بچے آپ کے لیے کیا لے آئے ہیں۔" ایک عدد کارکن جلسہ نے اتنا کہہ کر اپنے ہاتھوں میں تھمی چنگیری کا اوپری حصہ کھولا اس میں سے پھولوں کی لڑیاں برآمد ہوئیں جنہیں دیکھ کر جناب صدر گھگھیا کر بولے۔ "یہ تو پھولوں کی چادر معلوم ہوتی ہے۔!"

جواب ملا ... جی ہاں آپ نے ٹھیک پہچانا، پھولوں کی یہ چادر بچے، لنگوٹی والے بابا کے مزار سے کچھ دیر کے لیے اڑا لائے ہیں چلئے وقت کم ہے فوراً مسند صدارت پر لمبے لمبے لیٹ جائیے۔

جناب صدر نے گڑبڑا کر کہا ...... "یہ کیسی گلپوشی ہے۔!"

جواب ملا ..... یہ گلپوشی نہیں گلپاشی ہے ..... حالات کی ستم ظریفی سے گھبرا کر جناب صدر نے وہاں سے نکل بھاگنے کی بہتیری کوششیں کیں لیکن ان کی ہر کوشش ناکام بنادی گئی اور انھیں زبردستی مسند صدارت پر لٹا دیا گیا اور ان کی مٹھی میں اگربتی کا ایک بنڈل تھما کر ادھر کسی نے دیا سلائی دکھلائی ادھر دیگر منتظمین نے جناب صدر کے زندہ وجود پر پھولوں کی چادر چڑھادی، کنوینر نے فوراً بہ آواز بلند بانک لگائی ..... ال فاتحہ ...."

کہاوت مشہور ہے کہ پیاسے کو کنویں تک جانا پڑتا ہے، کنواں پیاسے تک نہیں آتا، لیکن صدارت کے معاملے میں کبھی کبھی یہ مثل الٹ جاتی ہے یعنی جس طرح بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹتا ہے اسی طرح کبھی کبھی صدارتی بلی عام آدمی کے گلے پڑجاتی ہیں۔ ہماری بات پر آپ کو یقین نہیں آرہا ہے نا۔ کوئی بات نہیں جو واقعہ ہم آپ کی خدمت میں اس وقت پیش کرنے جارہے ہیں اس کے بعد آپ بھی ہماری طرح اس بات پر ایمان لے آئیں گے کہ اللہ مہربان تو گدھا پہلوان۔ واقعہ کیا ہے آپ بیتی ہے، عرصہ پہلے کی بات ہے حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے پرانے شہر کے پرانے محلے کی ایک پرانی حویلی کے باب الداخلہ پر کپڑے کا ایک بیانر (Banner) جھول رہا تھا جس پر جلی حرفوں میں لکھا تھا .... یاد احمق زیر اہتمام بزم

احمقاں ---- ایک تو ہمیں وقت گزارنا تھا دوسرے سگریٹ کی طلب شدت سے محسوس ہو رہی تھی. سگریٹ تو ہماری جیب میں موجود تھی بس دیا سلائی کی کمی تھی اس لیے یہ سوچ کر مذکورہ حویلی میں داخل ہوگئے کہ دیا سلائی بھی مل جائی گی اور دو تین گھنٹے بھی آسانی سے بیت جائیں گے۔ سامنے ہی ایک وسیع وکشادہ ہال کھچاکھچ بھرا ہوا تھا، البتہ مجمع کسی بات پر بپھرا ہوا نظر آرہا تھا، ہم جیسے ہی روشنی میں پہنچے ایک صاحب جو غالباً کنوینر پروگرام تھے اور مائیک سنبھالے ہوئے لوگوں پر غرا رہے تھے ہمیں دیکھتے ہی خوشی سے چلا کر بولے ۔ " حضرات غصہ تھوک دیجئے ۔ صدر صاحب تشریف لا چکے ہیں ۔ " اتنا کہہ کر موصوف نے راست ہماری طرف اشارہ کیا مجمع نے خوشی کے برملا اظہار کے طور پر تالیاں اور سیٹیاں اور ہم نے جواباً بغلیں بجائیں ۔ اس سے پہلے کہ بغلیں بجاتے ہوئے ہم وہاں سے رفو چکر ہوتے بھاری بھرکم نوجوانوں کے ایک دستے نے ہم پر اچانک یلغار کردی اور ہمیں بہ زورِ دست و بازو یوں شہ نشیں پر پہنچا دیا جیسے کسی قاتل کی مشکیں باندھ کر عدالت کے کٹہرے میں پہنچا دیا جاتا ہے ۔ ہم لاکھ چلاتے رہے کہ بھائیو ہم وہ نہیں ہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں بلکہ ہم وہ بھی نہیں ہیں جو نظر آرہے ہیں سچ پوچھیے تو ہم، ہرچند کہیں کہ ہیں پر نہیں ہیں ------ لیکن افسوس ہماری ایک نہ سنی گئی الٹا کنوینر یادِ احمق نے ہمیں ایسا دھکا دیا کہ ہم کسی فٹبال کی طرح مسند صدارت پر جا گرے ۔

جب ہماری حالت اور حالات دونوں کسی قدر معمول پر آئے تو دیکھا کہ ہماری بغل والی نشست پر ایک صاحب اور رکھے ہوئے ہیں جو ایسے منہ بنا رہے تھے جیسے انھیں زبردستی جمال گوٹا، کھلایا گیا ہو اور " پوز " بھی ایسی بنائے ہوئے تھے جیسے کہہ رہے ہوں "

لوٹا تو میرے ہاتھ میں دینا کہ چلا میں

اس کے علاوہ ان کے چہرے پر ہوائیاں بھی بے طرح اڑ رہی تھیں بلکہ یہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اگلے کسی بھی پل بلا نوٹس وہ اڑ سکتے ہیں ہم نے سرگوشیانہ لہجے میں ان سے پوچھا۔ " جناب کی تعریف ؟ "

سرگوشیانہ لہجے میں جواب ملا ---- " مہمان خصوصی ----! "

ہم نے ہڑبڑا کر کہا --- " اچھا اچھا ----- مگر آپ اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہیں ؟

چڑ کر بولے ..... گھبرانے ہی کی تو بات ہے ،زبردستی مہمان خصوصی جو بنایا گیا ہوں۔"

ہم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔گویا آپ بھی میری طرح خود آئے نہیں۔بہ زورِ دست و باو زبردستی لائے گئے ہیں۔

پھر تو ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ چھید جس میں کوئی ڈیڑھ دو ہزار ہیں اس بات پر بقول شاعر"

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

اس سے پہلے کے ہماری کھسر پھسر والی آہ و زاریاں اور آگے بڑھتیں۔کنوینز یاد احمق نے ہمیں ٹھُنگ دکھاتے ہوئے مائیک سنبھال لیا ہمارے لیے اب سوائے چپ سادھنے کے کوئی اور چارہ نہ تھا ہمارے چپ ہوتے ہی کنوینز جلسہ نے تیوریاں چڑھا کر اس انداز سے جلسہ کے باضابطہ آغاز کی اجازت چاہی جیسے دھول دھپا بلکہ فساد بپا کرنے کی اجازت چاہ رہے ہوں۔کنوینز کی چڑھی ہوئی آستینوں اور مونچھوں نے پہلے ہی ہم پر لرزہ طاری کردیا تھا۔اب چڑھی ہوئی تیوریاں دیکھ کر ہماری جگہ کوئی طرم خاں بھی ہوتا تو اس کے سامنے بھی سوائے سر ہلا کر اجازت دینے کے کوئی اور راستہ نہیں ہوتا لہذا ہم نے فوراً سر ہلا کر اپنی گردن ڈال دی کہ بھیا! چاہے حلال کر یا جھٹکے سے اڑا دے تیری مرضی .....

یاد احمق میں احمق کی یاد تازہ کرنے کے لیے سب سے پہلے جو مقرر تشریف لائے وہ تقریر کے دوران میں احمق کی یادوں و باتوں سے زیادہ مائیک کو یوں گھورتے رہے جیسے اسے یعنی مائیک کو کچا چبا جائیں گے۔ان کے بعد جو مقرر تشریف لائے وہ مائیک کے بجائے مہمان خصوصی کو یوں گھورتے رہے جیسے اس غریب کو کچا چبا جانا چاہتے ہوں۔اور ان کے بعد جتنے بھی مقررین باری باری آئے وہ سب غالباً ہمیں کچا چبا جانا چاہتے تھے بلکہ کچھ تو چبا بھی گئے یعنی کم از کم ہمارے کان کھا کر ہی رخصت ہوئے مقررین کے اس آدم خورانہ۔انداز نے مہمان خصوصی کے اعصاب پر برا اثر ڈالا۔ان کی حالت خاصی پتلی پڑگئی آنکھیں پیلی اور رنگ پیلا پڑگیا۔ہم نے انھیں دلاسہ دینے کی غرض سے آہستگی سے کہا۔" بھائی صاحب حوصلہ رکھیے۔کہتے ہیں جس شخص کو دنیا ہیں میں اپنے کیے کی سزا مل جاتی ہے وہ سیدھے جنت میں جاتا ہے ....!"

جواب میں وہ بھی اسی آہستگی سے بولے ..... "جنت میں جانے کی بات تو بہت بعد کی

ہے بھائی جان فی الوقت اگر میں آٹا لے کر گھر نہیں پہنچا تو گھر والی کھڑے کھڑے مجھے جہنم میں پہنچا دے گی ..... "

ہم نے حیرت سے ..... "آٹا ..... یہ آٹا بیچ میں کہاں سے آگیا ..... ؟"

بولے "بیچ میں نہیں آیا جناب! اس آٹے ہی نے تو مجھے اس مہمان خصوصی والے جنجال میں پھنسایا ہے .....!" اتنا کہہ کر موصوف نے مختصراً اپنی بپتا سنائی کہ اصل میں وہ آٹا پسوانے کی غرض سے نکلے تھے گھر سے۔ بد قسمتی سے محلے کی چکی چونکہ بند تھی اس لیے وہ چکی کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے یہاں اس بستی تک آگئے لیکن اس بستی کی چکی پر چونکہ بھیڑ بہت تھی اور ان کا نمبر لگنے میں کافی دیر تھی اس لیے وہ گیہوں کا ڈبہ چکی پر چھوڑ کر وقت گزاری کے لیے یہاں ہنگامہ دیکھ کر چلے آئے اور اب پچھتا رہے تھے کہ نہ وہ یہاں آتے نہ زبردستی مہمان خصوصی بنائے جاتے۔

مہمان خصوصی کی دردناک روداد سن کر ہم نے سوچا کیا یادگار جلسہ ہے ایک شخص آٹا پسوانے گھر سے نکلتا ہے اور مہمان خصوصی بنادیا جاتا ہے اور دوسرا غافل دیائی سلائی کی تلاش میں نکلتا ہے اور اسے بدلے میں صدارت مل جاتی ہے۔ حالانکہ ہم کسی طرح صدارت کے اہل تھے نہ قابل۔ نہ ہم عالم نہ مفکر۔ نہ شاعر نہ ادیب۔ نہ لیڈر نہ پلیڈر اور پھر ہماری شخصیت بھی اتنی متاثر کن نہیں۔ نہ قد آوروں میں ہمارا شمار ہوتا ہے نہ زرداروں میں۔ آخر کس بنا پر ہمیں صدر بنایا گیا؟ کیا ہم صورت ہی سے یتیم نظر آتے ہیں! جب ہم نے اس بات کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمیں صدر بنانے میں تین چیزوں کا دخل ہوسکتا ہے تقدیر کا! داڑھی کا! شیروانی کا!

اور ان تین چیزوں میں بھی غور و خوص کرنے پر سب سے زیادہ ہاتھ شیروانی کا معلوم ہوا۔ گویا کھودا پہاڑ نکلی شیروانی وہ بھی خاندانی۔ دادا جان مرحوم سے والد صاحب مرحوم کو ورثے میں ملی تھی اور والد مرحوم سے اس زندہ مرحوم یعنی ہمیں ملی تھی۔ یہ اور بات کہ کیڑوں کی تین نسلوں نے بھی اس سے بھرپور استفادہ کیا تھا اور ان کے استفادے کے نشانات چھوٹے چھوٹے چھیدوں کی صورت اس کے گریبان سے دامن تک جا بجا موجود تھے۔ بہرحال شیروانی چاہیے نئی ہو یا پرانی۔ شادی۔ عیدین اور مشاعروں کے موقع پر خوب کام آتی ہے یہاں تک کہ آدمی کو

صدارت تک دلوادیتی ہے ۔ چنانچہ جب جلسہ ۔ یادِ احمق کے آخر میں ہمیں حق صدارت ادا کرنے کے لیے کہا گیا تو ہماری خاندانی شیراوانی کے اندر پریشانی شروع ہوگئی۔ ہمیں اگر تقریر کرنا آتی تو اب تک لیڈر نہ بن گئے ہوتے ۔ لیکن صدارت کی حماقت چونکہ سرزد ہو چکی تھی لہذا اب منہ سے کچھ پھوٹنا ضروری تھا لہذا آئیں بائیں شائیں شروع ہوگئے ۔

"معزز حاضرین میں بزم احمقاں کے منتظمین و اراکین کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھ احمق کو یاد احمق کی حماقت میرا مطلب ہے صدارت کے قابل سمجھا لیکن میں خود کو اس پائے کا احمق نہیں سمجھتا کہ احمق مرحوم کی شاعری اور شخصیت پر روشنی ڈال سکوں ۔ وہ یقینا بہت بڑے احمق تھے ۔ احمقوں کے مغل اعظم یعنی کے احمق اعظم تھے ۔ بہرحال میں تمام مقررین ، منتظمین ، حاضرین ، ڈیرے شامیانے و شہ نشین کو سجانے سنوارنے والے تمام اداروں کے اراکین کو مبارکباد کا مستحق سمجھتا ہوں جنھوں نے اپنی احمق نوازی کا ثبوت دے کر بزم احمقاں کے اس احمقانہ اجلاس کو کامیاب بنایا ۔ بزم احمقاں زندہ باد ...... سارے احمق پائندہ باد ......!!"

صاحبو! بس وہ دن اور آج کا دن ہے ہم جلسوں اور مشاعروں سے اسی طرح بدکتے ہیں جس طرح کوا غلیل سے اور گھوڑا چابک سے بدکتا ہے .....!!

● ☆ ●

"اردو کا ابتدائی زمانہ ۔۔۔" ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس

شمس الرحمن فاروقی کی شخصیت، علمی و ادبی اکتسابات اور مشرقی و مغربی شعریات پر ان کی گرفتِ نظر سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ اس وقت ان کی کتاب "اردو کا ابتدائی زمانہ۔ ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو" راقم الحروف کے پیش نظر ہے جو "آج کا ادب" کراچی کے توسط سے منظرِ عام پر آئی ہے۔ اطلاع ہے کہ اس کا انگریزی ایڈیشن دہلی سے شائع ہوگا۔ اس کتاب میں فاروقی نے اُس دور کی اردو زبان اور اس کے ادب کا لسانی، تاریخی اور تحقیقی مطالعہ کیا ہے جبکہ اردو زبان عہدِ تشکیل سے نمو پاتے ہوئے تصنیف و تخلیق کی وسعتوں سے ہم کنار ہورہی تھی۔ اردو زبان کے تاریخی، تہذیبی اور ادبی تناظر میں ان کا یہ مطالعہ نہایت فکر انگیز، معلومات افزا اور چونکانے والے نتائج کا حامل ہے۔

زیر تبصرہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں "تاریخ، عقیدہ اور سیاست" کے عنوان سے ہندی / اردو کی اصطلاحات کے چلن میں آنے کے اسباب اور عہد کی صراحت۔ ان کے بارے میں تراشے گئے افسانوں کی اصلیت اور تاریخی صورت حال کا تجزیہ کیا گیا ہے فاروقی کا خیال ہے کہ قدیم عہد میں اردو نام کی کوئی زبان نہیں تھی۔ جو لوگ "قدیم اردو" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں وہ لسانیاتی اور تاریخی اعتبار سے "نادرست" اصطلاح برتتے ہیں۔ اس کے علاوہ قدیم اردو کی اصطلاح کا استعمال آج خطرے سے خالی نہیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ "قدیم اردو" کی اصطلاح غالبا سب سے پہلے حکیم شمس اللہ قادری نے استعمال کی تھی۔ دکنی ادب پر ان کی کتاب اردوئے قدیم: ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۶۱ء میں "قدیم اردو:

کے نام سے مولوی عبدالحق کے تحقیقی مقالات کا مجموعہ شائع ہوا جس کا موضوع دکنی اور گجری ادب تھا۔ ۱۹۶۵ء میں پروفیسر مسعود حسین خان کی ادارت میں شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ "قدیم اردو" کے نام سے تحقیقی مجلّہ جاری ہوا۔ ان میں سے شائد کسی نے بھی فاروقی کے نقطہ نظر سے اس اصطلاح کے استعمال سے لاحق خطرہ محسوس نہیں کیا۔ تاریخ کے مختلف ادوار اور مختلف علاقوں میں اردو زبان کو مختلف نام دیئے گئے جیسے ہندوی۔ ہندی۔ دہلوی۔ گجری۔ دکنی اور ریختہ وغیرہ۔ اردو کو اردو کب سے کہا جانے لگا اور سب سے پہلے کس نے یہ نام استعمال کیا اس کے بارے میں پروفیسر محمود شیرانی، پروفیسر مسعود حسین خان اور ڈاکٹر محمد باقر نے کافی داد تحقیق دی ہے۔ زبان کے نام کے طور پر لفظ اردو کا استعمال اٹھارویں صدی کے ربع آخر کے پہلے نہیں ملتا۔ انیسویں صدی کے اواخر تک ہماری زبان کے لئے ہندی اور اردو دونوں ناموں کا چلن رہا حد یہ کہ بیسویں صدی کے اوائل میں بھی بعض اہل قلم نے "ہندی" کہہ کر اردو مراد لی ہے۔ قدیم مصنفوں نے اپنی زبان کو ہندی ضرور کہا ہے لیکن اس سے ان کی مراد جدید ہندی نہیں بلکہ وہی زبان ہے جس کا نام بعد میں اردو ہوا۔ سامراجی مصلحتوں کے زیر اثر انگریزوں نے اردو کو ہندوستانی کا نام دیا اور ہندوستانی اور ہندی کو دو الگ زبانیں ٹھہرا کر ہندی کو ہندوؤں اور ہندوستانی کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا۔ فاروقی نے گلکرسٹ۔ فیلن۔ پلیٹس کی تحریروں اور ہابسن جالبسن اور آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے اقتباسات کے ذریعہ انگریزوں کی افتراقی پالیسی کے ثبوت پیش کیے ہیں۔ اردو کے ایک معنی لشکرگاہ، لشکربازار بھی تھے اس کا استحصال کرتے ہوئے انگریزوں نے اردو کی پیدائش کو مسلمان فوجوں کی لشکرگاہوں اور لشکربازاروں سے نتھی کیا۔ انگریزوں کے زیراثر میرامن نے "باغ و بہار" میں اردو کی پیدائش کا یہی تصور پیش کیا۔ اس کے بالمقابل فاروقی نے احد علی خاں یکتا کی "دستور فصاحت" کے حوالے سے جو انگریزوں کے اثر سے پرے لکھنو میں لکھی گئی تھی یہ ثابت کیا ہے کہ اردو زبان کے آغاز و ارتقاء میں مسلمان حملہ آوروں اور فاتحوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اردو اپنی ابتدائی شکل یعنی کھڑی بولی کے روپ میں شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد سے قبل ارتقاء پذیر تھی البتہ مسلمانوں نے اس بولی کو زبان کا رتبہ دینے میں Catalyst کا کام کیا۔

دوسرے باب میں فاروقی نے "تاریخ کی تعمیر نو، تہذیب کی تشکیل نو" پر قلم اٹھایا ہے۔

جدید ہندی کے علمبرداروں نے آزادی سے پہلے ہی یہ دعوی کرنا شروع کیا تھا کہ برج بھاشا ، اودھی اور دیگر جدید ہندوستانی بولیوں کی تاریخ ہندی تاریخ کا حصہ ہے ۔ آزادی کے بعد انہی لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ اردو ، ہندی کی ایک شیلی (اسلوب) ہے ۔ ایک طرف انگریزوں کے زیر اثر ہندوؤں کا ایک طبقہ اردو سے گریزاں تھا تو دوسری طرف مسلمانوں نے انگریزوں کے نفسیاتی دباؤ اور ہندی اردو کے مناقشے کی تلخی کے سبب ہندوؤں کو اردو کی فہرستِ استناد (Canon) سے خارج کردیا ۔ فاروقی نے "آب حیات" اور "مقدمہ شعر و شاعری" سے مسلمانوں کے اس ناعاقبت اندیشانہ رویے کے دلائل پیش کیے ہیں ۔ اردو اور ہندی کی اس کش مکش میں فاروقی تنگ نظر اور روشن خیال ہر طرح کی شخصیتوں کے افکار کا جائزہ لیا ہے مثلاً اس وقت ایک طرف بھارتیندو ہریشچندر تھے جنھوں نے اردو کی موت کا اعلان کیا اور نہایت جارحانہ اور رکیک انداز میں طنز کے تیر چلائے تو دوسری طرف ڈاکٹر تاراچند جیسے وسیع النظر اسکالر تھے جنھوں نے صاف لکھا کہ گزشتہ صدیوں میں کیا ہندو کیا مسلمان شائستہ سوسائٹی کی زبان اور سارے ملک کی لنگوافرانکا ہندی یعنی فارسی آمیز ہندوستانی تھی نہ کہ جدید سنسکرت آمیز ہندی ۔ انگریزوں نے اپنی نفاق انگیز حکمت عملی کے ذریعہ شمالی ہند کے ہندوؤں میں یہ خیال پیدا کیا کہ ان کے تشخص کے لیے ایک الگ زبان کی ضرورت ہے ۔ انگریزوں کی ایماء پر فورٹ ولیم کالج میں ایک نئی طرح کی اردو جس میں اردو فارسی کی جگہ سنسکرت الفاظ رکھ دیے گئے تھے وجود میں آئی جو جدید ہندی تھی ۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی اور ڈاکٹر تاراچند اس بات پر متفق ہیں کہ سنسکرت آمیز ہندی کو فارسی آمیز اردو کے نمونے پر ڈھالا گیا ۔ اس طرح یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ اردو پہلے تھی جدید ہندی بعد میں آئی ۔ جدید ہندی دراصل اردو کی ایک شیلی (طرز) ہے ۔ اردو کے ماہرین لسانیات کو پورے یقین و اذعان اور اعتماد کے ساتھ یہ دعوی کرنا چاہئیے ۔ فاروقی نے اردو کے بالمقابل ہندی کو قائم کرنے کی کوششوں کا تاریخی سیاق میں معروضی نقطہ نظر سے تفصیلی مطالعہ کیا ہے جس سے اس قضیے کے نئے ابعاد سامنے آتے ہیں جو چونکانے والے بھی ہیں اور اہم بھی ۔

پیش نظر کتاب کے تیسرے باب میں فاروقی نے "اردو ادب کے آغاز" درمیانی وقفوں ۔ اس کے بارے میں قیاسات کو موضوعِ فکر بنایا ہے ۔ عوفی کے تذکرے "لباب الالباب" اور امیر خسرو کے دیوان "غرۃ الکمال" کے دیباچے سے مسعود سعد سلمان (۱۰۴۶ تا ۱۱۲۱) کے ہندوی

دیوان کی شہادت ملتی ہے ۔ مسعود سعد کے دو سو سال بعد امیر خسرو ۱۲۵۳ تا ۱۳۲۵) نے بھی ہندوی کلام کے چند جزو چھوڑے ۔ ہندوی سے مراد کوئی اور زبان نہیں بلکہ ہندوستانی / اردو ہی ہے ۔ خسرو کے بعد گجرات میں شیخ بہاء الدین باجن اور شاہ علی محمد جیوگام دھنی اور دکن میں فخرالدین نظامی کی تخلیقات سے ہندوی / اردو کی ادبی روایت استوار ہوتی ہے ۔ اس ضمن میں فاروقی نے دوران بحث بعض اہم سوالات اٹھائے ہیں مثلاً مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو کے درمیان دو سو برس کا فصل ہے ۔ کیا وجہ ہوئی کہ اس طویل مدت میں ہندوی میں کوئی ادب نہیں لکھا گیا ؟ اسی طرح خسرو کے بعد کی صدی بھی تخلیقی ادب سے عاری کیوں گزری ؟ ان سوالات کا جواب اس باب میں نہیں دیا گیا ہے ۔ البتہ اس سوال کے جواب میں کہ مسعود سعد اور امیر خسرو کا ہندوی کلام محفوظ کیوں نہ رہا فاروقی لکھتے ہیں کہ اس زمانے تک ہندوی کو ادبی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی اور ادبی حلقوں میں وہ کچھ خاص توقیر یا دلچسپی کی حامل نہیں تھی ۔ راقم الحروف کا خیال ہے اسی جواب میں پہلے دو سوالوں کا جواب بھی مضمر ہے ۔

باب چہارم میں فاروقی صاحب نے ہندوی / اردو کے بعض قدیم شعراء کی تحریروں کے حوالے سے اردو میں نظری تنقید اور شعریات کے آغاز پر تحقیقی نظر ڈالی ہے ۔ امیر خسرو نے اپنی کلیات نظم کے دیباچے میں شعریات سے متعلق بعض اہم اصول بیان کیے ہیں ۔ ان کے اساسی نظریات اور مضمرات کی وضاحت کرتے ہوئے فاروقی نے یہ اہم نتیجہ اخذ کیا ہے کہ " اردو میں نظری تنقید اور شعریات کے قدیم اشاروں کا سلسلہ عرب یا عجم نہیں بلکہ ہندوستان ہی کے ایک عظیم شاعر امیر خسرو سے قائم ہوتا ہے ۔ خسرو ایک بڑے نظریہ ساز تخلیق کار تھے ۔ ان کے خیالات نے اردو شاعری اور شعریات پر نہایت دیرپا اور دور رس اثرات مرتب کیے ۔ امیر خسرو کے اثر کو یوں بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ انھوں نے شعریات میں " روانی " کی اصطلاح استعمال کی جس کی تکرار دکنی شعرا شیخ احمد گجراتی ۔ وجہی ۔ نصرتی ۔ ولی اور بعد میں شمالی ہند کے شعرا کے ہاں بھی ملتی ہے ۔ امیر خسرو کے بعد فاروقی کے نزدیک اردو کے دوسرے بڑے نظریہ ساز شیخ خوب محمد چشتی تھے ۔ انھوں نے اپنی مثنوی " خوب ترنگ " میں شاعری کے بارے میں بصیرت افروز خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ ان کی ایک اور تصنیف " چھند چھنداں " کا موضوع عروضی اصول و مسائل ہیں ۔ خوب محمد چشتی کا اثر شیخ احمد گجراتی کے توسط سے دکن کے شعرا تک پہنچا ۔ فاروقی

نے نہایت مدلل طور پر امیر خسرو اور شیخ محمد چشتی کو ادبی نظریہ ساز کی حیثیت سے متعارف کروایا ہے۔

اس کتاب کا پانچواں باب " وقفے اور پھر حقیقی آغاز شمال میں " ہے ۔ خیال پڑتا ہے کہ یہ مقالہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مجلے " فکر و تحقیق " کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا ۔ اس باب میں فاروقی نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ امیر خسرو کے بعد اردو ادب میں تخلیق کے نقطہ نظر سے سکوت کیوں طاری رہا ۔ اس کے تاریخی عوامل کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس دور میں شمالی ہند میں فارسی کو لنگوا فرانکا کی حیثیت حاصل تھی شمالی ہند کے صوفیا نے ہندوی / اردو کو اپنا ذریعہ اظہار بنانے میں تاخیر کی جبکہ گجرات اور دکن کی صورت حال مختلف تھی ۔ وہاں صوفیا نے اردو کو رشد و ہدایت کا وسیلہ بنایا ۔ اس باب میں فاروقی نے نہایت باریک بینی سے اہل دہلی کے اس ادبی سامراجیت اور پرتعصب و پر رعونت رویے کو بھی Trace out کیا ہے جس کے سبب دلی والوں نے اردو کو اس کے اصل روپ (ہندوی / ہندی / گجری / دکنی) میں درخور اعتنا نہیں سمجھا اور اس میں ادب تخلیق کیا بھی تو اسے ریختہ کا نام دیا ۔ سلسلہ بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے سوداؔ اور میرؔ کے ہاں زبان کے بعض دکنی استعمالات اور حاتم سوداؔ اور میرؔ کے بعض استعمالات کی دکنی شعراء کے ہاں موجودگی سے فاروقی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ " سخت " دکنی عنصر سے قطع نظر سترھویں صدی کی اردو ہر جگہ کم و بیش یکساں تھی ۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ بات سترھویں صدی تو کجا اٹھارویں صدی کی زبان کے تعلق سے بھی نہیں کہی جا سکتی ۔ چنانچہ جب ہم میر حسن دہلوی کی " سحرالبیان " کے بالمقابل اٹھارویں صدی کے دکنی شعراء کی نگارشات مثلاً شاہ تراب کی مثنوی " مہ جبین و ملا " بحری کی " من لگن " وجدی کی " پنچھی باچھا " وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو " سخت " دکنی عناصر کے علاوہ بھی صرفی اور نحوی سطح پر زبان و بیان کے بین اختلافات نظر آتے ہیں ۔

پیش نظر کتاب کا چھٹا باب نسبتاً مختصر ہے ۔ اس میں فاروقی نے ولی نام کا ایک شخص کے زیر عنوان اردو غزل کے مجتہد ولی کی شخصیت اور کارناموں کا جائزہ لیا ہے ۔ ولی کی وطنیت کے بارے میں انھوں نے کوئی حتمی رائے ظاہر نہیں کی ہے لیکن فحوائے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ولی کا اورنگ آبادی ہونا مرجح ہے ۔ ولی کے سال وفات کے تعلق سے وہ قطعہ تاریخ میں مذکور سنہ ۱۱۱۹ھ سے اتفاق کرتے ہیں ۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ فاروقی دہلی میں شاہ سعداللہ

گلشن سے ولی کی ملاقات اور ولی کو شاہ گلشن کی مشہور نصیحت کے انکاری ہیں ۔ ان کا موقف ہے کہ ولی اور شاہ گلشن ملاقاتِ دہلی سے قبل بھی ایک دوسرے سے بخوبی واقف اور صاحب ملاقات تھے ۔ ان کا خیال ہے کہ شاہ گلشن کے مشورہ کی روایت میر اور قائم نے ولی کی اہمیت کو گھٹانے کے لیے وضع کی ہے ۔ کیوں کہ یہ امر ان کے لیے خوش آگیں نہیں تھا کہ ایک دکنی اہل دہلی کو اردو میں شعر گوئی کے آداب سکھائے ۔ ولی کے ہم وطن تذکرہ نگار شفیق نے اپنے تذکرہ میں اس ملاقات کا ذکر نہیں کیا ہے اور ابوالحسن امراللہ الہ آبادی نے بھی " تذکرہ مسرت افزا " میں اس روایت کی صحت میں تردد کا اظہار کیا ہے ۔ اس ضمن میں ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ ولی نے اپنی غزلیات میں متعدد اشخاص کا ذکر کیا ہے لیکن بہ طور سرچشمہ فیض یا استاذ سخن شاہ گلشن کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے ۔ ان کے ہاں فارسی کے بڑے بڑے شعراء کے علاوہ دکنی شعراء جیسے حسن شوقی ، فراقی اور آزاد کا ذکر ملتا ہے ۔ اس سے فاروقی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اہل شمال سے صرف نظر کر کے ولی نے علامتی طور پر دہلوی شعراء کو مسترد کیا ہے ۔ اس مقالے میں فاروقی نے حسن شوقی کی تعریف میں حسب ذیل شعر کو اشرف بیابانی سے منسوب کیا ہے ۔

سارے لوگاں کہتے ہیں اشرف کا شعر سن کر
کیا پھر جیا ہے شوقی یاراں مگر دکن میں

راقم الحروف کے خیال میں یہ شعر اشرف بیابانی کا نہیں بلکہ غالبا اشرف گجراتی کا ہے ۔ اشرف بیابانی کا زمانہ حسن شوقی سے قدرے پہلے ہے ۔

باب ہفتم پیش نظر کتاب کا آخری اور سب سے طویل باب ہے ۔ اس میں فاروقی صاحب نے " نئے زمانے ، نئی ادبی تہذیب " کے عنوان سے اٹھارویں صدی کے لسانی رجحانات ، ادبی تصورات ، تہذیبی تغیرات اور تاریخی عوامل کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے ۔ اٹھارویں صدی میں فارسی کو شمالی ہند میں طبقہ ، اشرافیہ کی زبان کا درجہ حاصل تھا ۔ اس صدی میں بیشتر ہندو ادیبوں نے بھی فارسی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ۔ شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی طرح ہندوؤں نے بھی بہ طیب خاطر ہندوی / اردو کو قبول نہیں کیا ۔ اہل شمال کے لیے اردو اور اس کا ادب دوسرے درجے کی چیز تھے ۔ دہلی والے " غزل " سے مراد صرف فارسی غزل لیتے اردو شاعری کو وہ " ریختہ " کہتے جس کا درجہ غزل سے کم تر تھا ۔ اس پس منظر میں دہلی کی ادبی تہذیب

میں استادی اور شاگردی کے ادارے کی ایجاد ہوئی جس کی وجہ سے ایک نیا ادبی معاشرہ تشکیل پاتا گیا۔ کچھ ہی عرصے میں استادی و شاگردی کا یہ سلسلہ سارے میں ملک میں پھیل گیا۔ اٹھارویں صدی کے نصف دوم کے آغاز تک اردو / ریختہ / ہندوی ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں شائستہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تمدنی زبان بن چکی تھی۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں اردو کے ادبی سماج میں ایک انتہا پسند رجحان یہ پیدا ہوا کہ صحت زبان کے سخت معیار قائم کیے گئے اور اصلاح زبان کے عنوان سے اردو میں عربی اور فارسی عنصر کو شریک غالب بنایا جانے لگا جس کے نتیجے میں سیکڑوں دیسی الفاظ اور روزمرے ٹکسال باہر ہوگئے۔ عرب و عجم کی طرف رجعت قہقری کے علمبرداروں میں شاہ حاتم اور مرزا جان جاناں مظہر اہم ہیں۔ ان جکڑبندیوں کی وجہ سے زبان کا بڑا نقصان ہوا۔ لسانی سطح پر ان سلبی رجحانات کے ساتھ ساتھ شعریات کے میدان میں نئے تصورات کا ایک ایجابی سلسلہ بھی جاری رہا جس کی بدولت آج اردو کی ادبی تہذیب بیش بہا ورثے کی امین ہے۔ فاروقی نے قواعد شعر کے جن نئے تصورات کی نشاندہی اور ان پر تفصیلی گفتگو کی ہے ان میں مضمون اور معنی کے درمیان امتیاز۔ خیال بندی۔ ایہام کیفیت اور شورش شامل ہیں۔ ان مباحث میں ان کے ایک ماقبل لکھے گئے مقالے "ایہام رعایت اور مناسبت" (مشمولہ سوغات بنگلور، کتاب ۱۱۔ بابت ستمبر ۱۹۹۶ء) کے بعض حصوں کی تکرار نظر آتی ہے۔

اردو کی متعدد لسانی و ادبی تاریخیں لکھی گئی ہیں لیکن اردو کی ادبی تہذیب یا اردو کی تہذیبی تاریخ پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ بہت عرصہ پہلے ۱۹۵۸ء میں پروفیسر عبدالقادر سروری نے اردو کی ادبی تاریخ لکھ کر اس موضوع کے ایک پہلو کا حق ادا کیا تھا لیکن ادبی تہذیب کی جہت تشنہ، تحقیق اور کسی مرد کار آزما کی منتظر تھی۔ شمس الرحمن فاروقی نے اس تشنگی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ فی الواقع ان کی یہ کتاب کوئی مربوط و مکمل تاریخ نہیں ہے بلکہ اس موضوع پر چند مقالات کا مجموعہ ہے جو ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک دوسرے سے ہم رشتہ و ہم پیوند کردیے گئے ہیں۔ لیکن یہ اپنی نوعیت کا اہم کام ہے۔ اس کتاب سے اہل اردو کو اپنی مرعوبیت ختم کرنے اور اپنے اندر لسانی اور تہذیبی سطح پر نیا یقین۔ نیا اذعان۔ نیا اعتماد اور نیا حوصلہ پیدا کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اردو تنقید میں شمس الرحمن فاروقی ایک مسلمہ مقام رکھتے ہیں لیکن پیش نظر کتاب کے ذریعہ انھوں نے تحقیق میں بھی اپنے مقام کا تعین کیا ہے۔ اس کتاب کے مباحث ٹھوس اور

مدلل ہیں ۔ مسائل کی جرح و تعدیل میں انھوں نے تحقیقی معروضیت اور محققانہ حزم و احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے ۔ ان کے بعض ماخذ اچھوتے اور غیر متوقع ہیں اور بیشتر اردو والوں کے لیے نئے ہیں ۔ انھوں نے اپنی قوت استنباط اور تنقیدی بصیرت کے ذریعہ روایتی مواد سے بھی نئے اور چونکانے والے نتائج اخذ کیے ہیں ۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک اچھے محقق کے لیے تنقیدی شعور کس قدر ضروری ہے !!۔

☆☆☆

تبصرہ

نام کتاب: اندوختہ (شعری مجموعہ)　مصنف: راشد آزر

☆مبصر: ڈاکٹر سعید عارفی

راشد آزر اردو کے ایک ممتاز اور معروف شاعر ہیں ۔ اب تک ان کے سات شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں ۔ "اندوختہ" ان کا تازہ ترین مجموعہ کلام ہے ۔ جس میں ان کا ۱۹۸۵ء سے لے کر ۱۹۹۶ء تک کا کلام شامل ہے ۔ راشد آزر نے "اندوختہ" کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے ۔ فرد حساب ۔ لمحہ ۔ نقد ۔ یقین و گمان اور درد رائگاں کے عنوانات کے تحت ۔ "اندوختہ" میں زیادہ تر نظمیں اور غزلیں ہیں ۔ "اندوختہ" کو راشد آزر کے دس سالہ تخلیقی سفر کی روداد کہا جاسکتا ہے ۔ اس تخلیقی سفر میں راشد آزر کو کن کن دشوار مراحل سے گزرنا پڑا اور کتنی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا اس کا اندازہ صرف "اندوختہ" کے مطالعے ہی سے ہوسکتا ہے ۔

جب ہم اردو کے عصری شعری ادب پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ مکمل تخلیقی دیانت داری اور فکری ذمہ داری کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی ضرورتوں ، تقاضوں اور سماجی و معاشرتی زندگی کے موجودہ خد و خال کو نظر میں رکھتے ہوئے جو تخلیق کار تخلیقی عمل کی پیچیدگیوں سے گزر کر شعری ادب کی تخلیق کر رہے ہیں ساتھ ہی ساتھ زندگی ، سماج اور ادب کے رشتے کو مستحکم بنائے ہوئے ہیں ۔ ان میں ایک نہایت ہی معتبر نام راشد آزر کا ہے ۔ عصری حالات اور معاشرتی زندگی کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ادب کی تخلیق کوئی آسان کام نہیں ہے مگر راشد آزر نے اسے کمال فن کاری کے ساتھ انجام دیا ہے ۔ اپنی باطنی اور خارجی دنیا سے مسلسل جنگ کرنے ، زندگی کی تلخ حقیقتوں سے دوچار ہونے اور متحارب قوتوں کو بے نقاب کرنے کی جدو جہد کے بعد جو شعری سرمایہ ہمارے ہاتھ آتا ہے وہ راشد آزر کی شاعری ہے ۔ راشد آزر نے اس کائنات کو کبھی تماشائی بن کر نہیں دیکھا بلکہ وہ اس کے صارف بھی ہیں ۔ یہ کائنات اور انسانی زندگی آج مسلسل جن سانحات ، حادثات اور المناکیوں سے گزر رہی ہے وہ اس کے عینی شاہد بھی ہیں ۔ زندگی کی تیز رفتاری ، تغیر پذیری ، تفاوت ، بے التفاتی اور افکار و خیالات کی مسلسل تبدیلیوں نے آج حیات

☆ عید گاہ روڈ II ۔ سالار گنج ۔ بہرائچ ۲۷۱۸۰۱

انسانی کو جس طرح اپنا محکوم اور مجبور بنالیا ہے ۔اس سے راشد آزر کے اندر کا تخلیق کار پریشان اور رنجیدہ ہے ۔ ان کی فکر مندی اس وقت اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ وقت اور حالات کی مسلسل تبدیلیوں نے زندگی اور کائنات کے چہرے کو مسخ کرکے رکھ دیا ہے ۔ حیات انسانی کی لامحدودیت کا راگ الاپنے کے باوجود اسے ہر طرح محدود بنانے کی سازشیں رچی جارہی ہیں ۔ دکھوں اور غموں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے ۔زندگی کی بے قدری عام ہوتی جارہی ہے اور ا ہم ایک ایسی کائنات میں سانس لے رہے ہیں جہاں نیند اور خواب دونوں ہی سے ہم خوف زدہ ہیں ۔ آج نیند ہمیں راحت و سکون نہیں عطا کرتی ۔ خوابوں کی خوش نمائیاں ختم ہوکر رہ گئی ہیں ۔ ہر طرف بھیانک، اور دل کو دہلا دینے والی خبروں کی بھیڑ ہے ۔ سب کچھ مسمار ہورہا ہے ۔فنا ہورہا ہے ۔

" اندوختہ " کے مطالعے کے بعد ہم راشد آزر نام کے ایک ایسے شاعر سے متعارف ہوتے ہیں جسے کچھ پانے کی خوشی سے زیادہ کچھ کھونے کا غم ہے ۔ وہ زندگی میں گہرائی تک ڈوب کر جینے کے آرزو مند ہیں ۔زندگی کی عظمت اور اس کا تقدس انھیں عزیز ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی سانحہ اور حادثہ ان کے عقائد کو متزلزل نہیں کرپاتا ۔ جو کچھ ہورہا ہے اس کا اظہار تو وہ کرتے ہیں مگر مایوسی اور ناامیدی انھیں چھوکر بھی گزرنے نہیں پاتی بلکہ ان کی شاعری امید کے چراغوں سے روشن اور حوصلہ مندی کے جذبوں سے معمور ہے ۔ زمانے اور حالات کی سخت سے سخت آندھیاں بھی ان چراغوں کو بجھانے سے قاصر ہیں ۔ زندگی اور انسانیت سے وابستگی کا یہ عمل راشد آزر کی شاعری کا بنیادی مرکز اور محور ہے ۔

" اندوختہ " کو پڑھتے ہوئے ہمیں قدم قدم پر اس بات کا بھی احساس اور اندازہ ہوتا ہے کہ راشد آزر ایک ایسے شاعر ہیں جو اپنے عہد کی زندگی، حقیقتوں اور تلخیوں سے اپنے کو کبھی بے تعلق نہیں ہونے دیتے اور نہ ان سے پہلوتہی کا رویہ اختیار کرتے ہیں بلکہ ان سب سے ہر لمحہ اپنا رشتہ استوار رکھتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ عہد کی انسانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں ۔ بے یقینی ۔ بے سمتی ۔ خوف ۔ڈر اور بے چینیوں کو جس ہوش مندی ۔ دیانت داری اور تخلیقی ذمہ داریوں کے ساتھ " اندوختہ " کی شاعری میں بیان کیا گیا ہے اس سے راشد آزر کی شاعرانہ دانشمندی کا اظہار ہوتا ہے ۔ راشد آزر " اندوختہ " کی شاعری میں کہیں بھی اپنے عہد ۔ حالات ۔ سماج اور

عصری زندگی کے سلسلے میں کسی قسم کی غلط فہمیوں کا شکار نہیں ہوئے ہیں۔ آج جو کچھ اس کائنات میں خارجی سطح پر شکست و ریخت کی صورت میں رونما ہورہا ہے ویسا ہی کچھ راشد آزر کی داخلی کائنات میں بھی ہورہا ہے مگر نئی بشارتوں کے ساتھ۔

یوں تو تخلیقی عمل ایک ہمہ گیر، مسلسل اور جسموں کو چور چور کردینے والا عمل ہے اور "اندوختہ" کے حوالے سے راشد آزر کی جو شاعری ہمارے سامنے آتی ہے جہاں وہ ان کے تخلیقی اور فکری میلان، رجحان اور شعور کی غماز ہے وہیں وہ ان کے خارجی اور داخلی سفر مسلسل کا اعلامیہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راشد آزر کی شاعری جس قدر ان کے درون میں سفر کرتی ہے اسی قدر خارج سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ اس طرح "اندوختہ" میں شامل راشد آزر کی تخلیقات درون سے خارج کے سفر کی تخلیقی سرگزشت ہے اور ان میں وہی تخلیقی ہمہ گیری ہے جس کی توقع ہمیں راشد آزر جیسے شاعر سے ہونی چاہیئے۔ راشد آزر اپنی شاعری کے وسیلے سے اپنے وجود کے نہاں خانوں سے نکل کر ایک کھلی اور صاف و شفاف کائنات میں سانس لینے کے آرزومند ہیں مگر ایک تشویش کے ساتھ، جو وقت اور حالات کی نیرنگیوں کی عطاکردہ ہے۔ چونکہ وہ اس کائنات کو ہر لمحہ جاگتی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اسی لیے ان کی شاعری فراریت اور مایوسی کا شکار ہونے کے بجائے عصری حقائق اور سچائیوں کا اظہاریہ بن گئی ہے اور ہمارے موجودہ ادبی منظر نامے پر زندگی، انسانیت اور آدمیت کی ایک سچی اور کھری شناخت بناتی ہے۔ کوئی بھی جینوئن تخلیق کار اپنی تخلیقات سے جس طرح کام لے سکتا ہے راشد آزر نے بھی وہی کیا ہے۔ اس لئے اگر میں یہاں راشد آزر کی شاعری کے حوالے سے یہ کہوں کہ آج بھی شاعری اپنا کام کررہی ہے اور حیات انسانی کی تعمیر ہی میں نہیں بلکہ تعبیر و تفہیم سے وابستہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔

آج ہم خارجی طور پر جن مسائل سے دوچار ہیں، انتشار، زراج، لاقانونیت، ناسپاسی، ناقدری، بے سمتی، بے تعلقی، بربریت، جبر اور استحصال کی فضا سے گزر رہے ہیں، درد و کرب کا ایک لامتناہی سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آرہا ہے اس سے ہمارا باطن صرف متاثر ہی نہیں بلکہ مفلوج ہورہا ہے۔ ان مراحل سے گزرتے ہوئے ہمارے عہد کی ساری حقیقتیں اب ہمارے ذاتی تجربے میں شامل ہوکر آج ہمارے عہد کے تخلیقی عمل کا حصہ بن گئی ہیں اور راشد آزر نے بھی "اندوختہ" کی شاعری کا خمیر انھیں تجربات و مشاہدات سے تیار کیا ہے۔ جب کسی بھی عہد

کے اجتماعی تجربات انفرادی تجربے کے روپ میں شاعری میں شامل ہوجاتے ہیں تو وہ شاعری وسیع تر امکانات کی حامل بن جاتی ہے ۔اس کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ ہوجاتا ہے کچھ اسی طرح کی بات ہمیں " اندوختہ " کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے ۔ جہاں " اندوختہ " کا مطالعہ ہمارے لیے راشد آزر کے شاعرانہ کمالات اور فن کارانہ بصیرتوں تک رسائی کا ذریعہ ہے وہیں ہم پر اس بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ کسی بھی عہد کے حالات اور تجربات جب تخلیقی عمل میں شریک ہوجاتے ہیں تو تخلیق کی نہج اور سمت کیا ہوتی ہے ۔ " اندوختہ " کی شاعری اس کی ایک زندہ مثال ہے ۔

میرے خیال سے راشد آزر کی شاعری ایک بامقصد اور بامعنی تلاش و جستجو سے عبارت ہے ۔اس کا کینوس بے حد وسیع ہے اور وہ اپنے اندر قاری کے ساتھ دور تک سفر کرنے کی حرارت اور قوت رکھتی ہے ۔ اس میں جو ہم کلامی جیسی کیفیت ہے اس کی وجہ سے ہماری رسائی عصری مسائل تک براہ راست ہوتی ہے اور ان مسائل کی جان لیوا سنگینیوں کا احساس اور اندازہ بھی ہوتا ہے ۔ اس طرح راشد آزر کی شاعری ہماری عصری سوچ کا حصہ بن جاتی ہے ۔ " اندوختہ " صرف ایک اچھے شاعر کی اچھی شاعری کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ سچی اور کھری شاعری کا نمونہ بھی ہے ۔اس کا مطالعہ ادب کے ہر قاری کو کرنا چاہیئے ۔

یوں تو " اندوختہ " میں شامل نظموں میں زیادہ تر نظمیں ایسی ہیں جو حوالے کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں مگر میں یہاں طوالت کے خوف سے صرف غزلوں کے اشعار پر اکتفا کرنا چاہتا ہوں ۔

کون کہتا ہے خموشی سے گزر جائیں گے
لمحے تاریخ کے صفحوں پر بکھر جائیں گے

دن کے سمجھوتوں نے جو زخم دیئے ہیں آزر
بھول جائیں گے جو ہم رات کو گھر جائیں گے

میں راکھ سا دبائے ہوئے تھا شرار شوق
وہ اک ہوا تھی ،شعلہ سا بھڑکا گئی مجھے

میں نے کب چاہا کہ قید در و دیوار ملے
میں تو آوارہ ہوں ، بے گھر مجھے رہنے دیتے

آزر حویلیوں کے ستوں رہ گئے فقط
آسیبِ وقت توڑ کے محراب لے گیا

وہ تو میری سانس کی بے ربطیوں کی گونج تھی — منہ اندھیرے جس کو آواز جرس سمجھا تھا میں
زیادہ و نفع پہ کیا۔ اس پہ تم نظر رکھو — حساب وقت کی دیوار پر رقم کیا ہے
وہ یہ سمجھتے ہیں دوری کا دکھ ہی سب کچھ ہے — ہم ان سے کیسے کہیں قربتوں کا غم کیا ہے

دشت ماضی میں یہ فراد کے نشاں ڈھونڈتے ہیں
ہائے کس چیز کو یہ لوگ کہاں ڈھونڈتے ہیں

ہر سانس میں ہے الفت نیرنگی دنیا — دل شکوہ۔ بے رحمی حالات کرے ہے

میں اپنے ہاتھوں میں دستک چھپائے پھرتا ہوں
وہ کھلنے والا دریچہ مگر نہیں ملتا

وہ ہاتھ بڑھ کے گریبان جبر تک پہنچے — وہ ہاتھ۔ جن میں کبھی کاسہ ۔ گدائی رہا
جن ہاتھوں سے بٹتی خیراتیں دیکھی تھیں — ان آنکھوں سے اُن ہاتھوں میں کاسے دیکھے
یہ زمانے کی تیز رفتاری — زندگی آج اس کی مد میں ہے

● ☆ ●

"شعاعوں کی صلیب"

ایک منفرد و ممتاز شعری مجموعہ

ڈاکٹر اختر بستوی

اردو زبان نے ایسے بہت سے اہل قلم پیدا کیے ہیں جو اعلیٰ درجے کے نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ سخن گو بھی رہے ہیں اور جنھوں نے کافی بڑی تعداد میں غزلیں اور نظمیں بھی کہی ہیں۔ لیکن ان میں کسی نے بھی شاعر کی حیثیت سے ایسی تخلیقات پیش نہیں کیں جو اردو کے شعری ادب کی تاریخ پر لافانی نقوش مرتب کر سکی ہوں اور جن کی بدولت انھیں شاعری کے میدان میں بھی ویسا ہی بلند مقام و مرتبہ مل سکا ہو جیسا کہ تنقید کی دنیا میں حاصل ہوا۔ اس معاملے میں کسی کو بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا چاہے وہ شبلی نعمانی ہوں یا آل احمد سرور، مسعود حسن خاں ہوں یا کلیم الدین احمد۔ یوں تو ہر بڑے شاعر میں تنقیدی صلاحتیں بھی موجود ہوتی ہیں اور ان کا مظاہرہ بھی کبھی کبھی تحریر کے ذریعہ بھی ہوتا ہے لیکن یہاں میری مراد ان اہل قلم سے ہے جو بنیادی طور پر ناقد کی حیثیت سے ادب کی دنیا میں داخل ہوئے۔ اس لیے میں نے اس ضمن میں حالی کو بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیا ہے۔ کیوں کہ وہ "مقدمہ شعری و شاعری" جیسے معرکتہ الارا تنقیدی کارنامے کے باوجود بنیادی طور پر نقاد نہیں بلکہ شاعر تھے۔ اور "مقدمہ شعرو شاعری" کی تصنیف کی اصل غرض و غایت ان کے نزدیک صرف یہ تھی کہ وہ اپنے کلام کی نوعیت و افادیت اپنے دور کے

☆ شعبہ اردو، گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور (یو۔پی)

قارئین پر واضح کرنا چاہتے تھے جن کے لیے وہ بالکل ہی نئی قسم کی چیز تھی۔

اسی لئے جب پروفیسر کرامت علی کرامت کا مجموعہ، کلام "شعاعوں کی صلیب" میرے ہاتھ میں آیا تو میں نے یہ سوچ کر بڑی ہی بے دلی کے ساتھ اس کی ورق گردانی شروع کی کہ کرامت صاحب بھی چونکہ ایک بلند پایہ نقاد ہیں اس لئے ان کی شاعری بھی دیگر نقاد شعراء کی طرح بس "یوں ہی سی" ہوگی۔ لیکن جب "سرگزشت سفر"، "غالب اور نئی نسل"، "شعاعوں کی صلیب" اور "تناسخ" جیسی عدیم المثال نظمیں نظر سے گزریں۔ تو مجھے چونکنا پڑا اور پھر پوری کتاب کے گہرے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کرامت صاحب نے اردو ادب کی ایک دیرینہ روایت توڑ دی ہے اور "شعاعوں کی صلیب" اردو کا وہ پہلا مجموعہ، کلام ہے جو ایک مشہور و معروف نقاد کی جانب سے عظیم و لازوال شاعری کے نمونے لے کر آیا اور اسی حیثیت سے ایک منفرد ممتاز شعری مجموعہ ہے۔

کرامت علی کرامت ہر لحاظ سے ایک جدید شاعر ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے ان کے کلام میں ان افکار کی جلوہ فرمائی نظر آتی ہے جو جدید شعراء کا اصل فکری اثاثہ ہیں۔ اس سلسلے میں زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں ہے۔ محض دو ایک نمونے ہی پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:

وقت ساکت تو نہ تھا شمس و قمر سے پہلے
زندگی رقص میں تھی رقص شرر سے پہلے

(شعور وقت)

دیار تحت الشعور میں کچھ اماں ملے میرے دل کو شاید
وگرنہ اس کو سلگ سلگ کر جلا نہ دے شعلہ آگہی کا

(موجودہ زندگی کے کھوکھلے پن کا احساس)

موضوعات کے علاوہ ہئیت کے اعتبار سے بھی کرامت صاحب ایک جدید شاعر ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید شاعروں کا جھکاؤ پابند شاعری کے مقابلے میں آزاد نظموں کی طرف زیادہ ہے اور "شعاعوں کی صلیب" میں چونکہ آزاد نظموں کے ساتھ ساتھ پابند نظمیں بھی موجود ہیں، اسلئے یہ گمان گزر سکتا ہے کہ شاید کرامت علی کرامت شاعری کے کلاسیکی اسکول سے تعلق رکھتے ہوں،

لیکن یہ احتمال قطعی غلط ہے ۔ "شعاعوں کی صلیب" میں پابند نظموں کی موجودگی کا سبب یہ ہے کہ کرامت صاحب پابند شاعری کو جدیدیت کے منافی نہیں سمجھتے ۔ وہ اپنے مضمون "جدید شاعری کا بحران" میں بہت ہی واضح الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:

"جدید شاعری کسی طرح کے TABOO حتیٰ کہ آزادی جیسے TABOO پر بھی ایمان نہیں رکھتی ۔" (اضافی تنقید ۔ صفحہ ۱۱۶)

دوئم یہ کہ "شعاعوں کی صلیب" میں پابند نظموں کے مقابلے میں آزاد نظموں کی تعداد زیادہ ہے اور وہ تمام نظمیں جنھیں ہم شاہکار شعری تخلیقات قرار دے سکتے ہیں آزاد ہیں (مثلاً "غالبؔ اور نئی نسل"، "تناسخ"، "شعاعوں کی صلیب" اور "سرگذشت سفر" وغیرہ)۔

موضوع اور ہئیت کے ساتھ ساتھ جدید شاعری کی بعض مخصوص تزئینی صفات (Ornamentative Qualities) کی موجودگی بھی کرامت صاحب کے کلام پر جدید شاعری کی مہر ثبت کرتی ہے ۔ مثال کے طور پر نئے ذہنی پیکروں (Images) کا استعمال تمام جدید شعراء کی طرح کرامت صاحب کی شاعری میں بھی ہوتا ہے ۔ نمونے کے لئے چند اشعار درج ذیل ہیں:

تہذیب کا کھنڈر ہے نگاہوں کے سامنے
بیٹھا ہے پھن اٹھائے ہوئے خامشی کا سانپ

شبنمی دھند میں جنون انگیز ان کی آواز ہی کا شعلہ ہے

میں نے لیکن اس کنویں سے اک مہ نخشب ابھارا
اور رشکِ صد یدبیضا بنایا تھا اسے

میں جب اس امر پر غور کرتا ہوں تو مجھے سخت حیرت ہوتی ہے کہ جدید شعراء نے اردو شاعری کے تمام اگلے پچھلے سرمائے کو پوری طرح نظر انداز کردینے کا وطیرہ کیونکر اختیار کر رکھا ہے؟ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی دور میں بھی شاعری کا ڈھانچہ اس طرح کھڑا کیا جاسکتا ہے کہ دیرینہ شعری ورثے سے اینٹ اور گارا سرے سے لیا ہی نہ جائے ؟ کیا یہ ایک ایسی شدت پسندی نہیں ہے جس کی بدولت شاعر رابنسن کروسو (Robinson Cruso) بن کر رہ جائے گا اور شاعری کی حیثیت

ایک غیر آباد جزیرے کی سی ہو کر رہ جائے گی؟

کرامت علی کرامت کو جدید شعراء کی اس تباہ کن غلطی کا پوری طرح احساس ہے ۔ اسی لئے ان کا مجموعہ کلام " شعاعوں کی صلیب " ہر لحاظ سے جدید شاعری کا ایک نمائندہ مجموعہ ہونے کے باوجود ماضی کی مستحسن اور صحت مند شعری روایات کے جلوہ ہائے رنگین بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور یہ صفت بھی اسے ایک منفرد و ممتاز مجموعہ کلام کا مرتبہ عطا کرتی ہے ۔

" شعاعوں کی صلیب " میں ایک وصف تو ایسا ہے جو اردو کے کسی شعری مجموعے میں نہیں ملتا اور وہ یہ ہے کہ اس کی بہت سی نظموں میں " سائنسی شعور کو شاعرانہ خلوص مندی کے ساتھ پیش کرنے " کے تجربے کئے گئے ہیں ۔ اس قسم کے تجربات کی سب سے اچھی مثالیں " سرگذشت سفر " میں ملتی ہیں ۔ اس نظم میں مندرجہ ذیل سائنسی نظریات و معلومات و حقائق کے ادراک کی بنیادوں پر شعری تجربے کئے گئے ہیں ۔

(۱) کائناتی شعاع (Comic Ray) کا ادراک

(۲) مادّہ اور قوت کے ایک دوسرے میں بدل سکنے اور مادّہ کے مٹ کر قوت کی شکل میں رونما ہونے کی سائنسی صداقت کا ادراک

(۳) آئن سٹائن کے نظریہ اضافیات کے ان اصولوں کا ادراک کہ حرکت میں آنے پر وقت کا تناؤ گھٹ جاتا ہے یعنی گھڑی کی سوئیاں سست رفتار ہو جاتی ہیں ۔ فاصلے کم ہو جاتے ہیں اور رفتار اگر روشنی کی رفتار کے برابر ہو جائے تو مادہ لامحدود ہو جاتا ہے ۔

(۴) اس نظریے کا ادراک کہ کائنات میں کلوروفل (Chlorophyll) کے وجود کے بغیر شعور (Consiousness) کا تصور ممکن نہیں تھا ۔

" سرگذشت سفر " کے علاوہ " تناظر " اور " بے وزنی کا احساس " میں بھی ہمیں مختلف سائنسی نظریوں اور صداقتوں کے ادراک پر مبنی شاعرانہ تجربات ملتے ہیں ۔ ان تجربوں کے بارے میں کرامت صاحب " شعاعوں کی صلیب " کی دیباچے (میرے اوراق زندگی اور میری شاعری) میں فرماتے ہیں :

" یہ تجربے میرے اپنے ہیں اور کم از کم میری نظر سے انگریزی ، بنگلی ، اڑیا اور اردو

میں اب تک کہیں نہیں گذرے "

بلاشبہ ان تجربات میں ندرت اور انوکھا پن ہے اور ان کی روشنی میں بھی "شعاعوں کی صلیب" کو ایک منفرد و ممتاز شعری مجموعہ قرار دینا لازمی ہو جاتا ہے ۔

یہاں یہ بحث اٹھ سکتی ہے کہ کیا ذہنی پیکروں کا استعمال جدید شاعری کی محض تزئینی صفت (OrnamentativeQuality) ہے ؟ لیکن ہر بحث طلب مسئلے میں کسی ناقد یا فن کار کی اپنی کوئی ایک رائے تو ہوتی ہی ہے ،اور میری رائے اس سلسلے میں یہی ہے ۔

بہرکیف اگر بات صرف اسی حد تک ہوتی کہ کرامت صاحب ایک جدید شاعر ہیں اور ان کا مجموعہ ،کلام "شعاعوں کی صلیب" جدید شاعری کا ایک مجموعہ ہے تو کسی طرح بھی انفرادیت یا امتیاز کی چیز نہ ہوتی ۔ "شعاعوں کی صلیب" کو جو بات اس میدان میں ایک منفرد و ممتاز شعری مجموعہ بناتی ہے وہ یہ کہ اب تک جدید شعراء کے جتنے بھی مجموعے اردو میں شائع ہوئے ہیں ان میں یہ پہلا مجموعہ ہے جس میں نہ تو جدیدیت کی اندھی تقلید نظر آتی ہے اور نہ اس شدت پسندی کا پتہ چلتا ہے جو عام طور پر جدید شاعروں کی لازمی خصوصیت ہو کر رہ گئی ہے ۔آج کل ہمارے جدید شعراء نے اپنے کلام میں چند خاص موضوعات کا بار بار اعادہ کرنے کی روش اپنا رکھی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ ان موضوعات کا نہ تو وہ خود مکمل طور پر شعور رکھتے ہیں اور نہ ان میں سے کسی موضوع کے ایسے گوشوں پر ان کی نظر جاتی ہے جنھیں ابھارنے اور اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کرامت صاحب اس قسم کے جدید شاعر نہیں ہیں ۔ وہ جدید شاعری کے مخصوص موضوعات کو اپنے کلام میں جگہ ضرور دیتے ہیں لیکن بے سوچے سمجھے زبردستی اور گھسے پٹے انداز میں ان پر نظمیں نہیں کہتے اور نہ ان موضوعات کے بارے میں ان کا رجحان و رویہ (Attitude and Approach) مروجہ طرز کا ہوتا ہے ۔ انھوں نے موضوعات کے متعلق جدید شاعروں کے اس عیب کو اپنی نظم "غالب اور نئی نسل" میں غالب کی زبانی طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے اور غالب ہی کی زبان سے ان کی سرزنش کروائی ہے میں یہاں اس نظم سے صرف دو مثالیں پیش کرتا ہوں ۔ جدید شعراء کے ایک محبوب موضوع "ویرانی" کے متعلق فرماتے ہیں :

"میری ویرانی تھی تہذیبِ شکستہ کا کھنڈر
جس پر قائم ہو چکا تھا اک نئی تہذیب کا قصرِ حسیں
اور ویرانی تمہاری ایسی بنجر سرزمین ہے
جس میں نخلِ آرزو نشو و نما کے واسطے ترسے گا یوں ہی مدتوں"

جدید شاعری کے ایک اور بہت ہی خاص اور اہم موضوع "انا" کے بارے میں کہتے ہیں:

"میں نے احساسِ انا کو وقت کے دریا پہ گویا
پل بنا کر رکھ دیا تھا
اور تم ساحل سے دریا کے نظارے میں عبث مصروف ہو
ذات کے اندھے کنویں میں جھانک کر تم کانپتے ہو خوف سے

☆ ☆ ☆

تبصرہ

نام کتاب: علی جواد زیدی ۔۔ حیات، شخصیت اور فن
مصنف: ڈاکٹر شیخ عبدالرحمن انصاری عزم (ایک تحقیقی جائزہ)

مبصر: ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

ڈاکٹر شیخ عبدالرحمن عزم کی شخصیت کافی ہمہ جہت رہی ہے ۔ وہ اردو ادب، ریاضیات کے طالب علم رہے اور انجینیرنگ کی ڈگری بھی لی ہے ۔ پھر محکمہ آبرسانی (Irrigation) میں چیف انجینیر بھی رہے اور اردو میں پی ۔ ایچ ۔ ڈی بھی کیا۔

ظاہر ہے انھوں نے جب کسی ادیب پر پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے لیے مقالہ لکھنا چاہا تو ان کے گائیڈ ڈاکٹر مغنی کے مشورے پر اپنے سے زیادہ کثیر جہتی شخصیت کا انتخاب کیا۔ وہ شخصیت علی جواد زیدی کی ہے ۔

علی جواد زیدہ بھی ایک شخصیت نہیں بلکہ ایک ادارہ ہیں شاعر وہ ہیں، سیاست داں وہ ہیں، تنقید نگار وہ ہیں، خاکے انھوں نے لکھے ہیں اور تحقیق میں شاید اپنا جواب نہیں رکھتے ۔ اس کے علاوہ ان کے کئی مضامین ہیں اور کئی موضوعات پر، تبصرے ہیں، اور کیا کیا کچھ ہے جو مختلف رسالوں میں شائع ہوچکے ہیں ۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے لیکن وہ لاپتہ ہیں ۔ ناول بھی لکھی لیکن غالبا تکمیل نہ کرپائے ۔

علی جواد زیدی تحقیق میں اتنے ماہر ہیں کہ جانے کہاں سے مواد حاصل کرتے ہیں اور

پھر ایک کتاب تیار ہو جاتی ہے۔ جو معرکتہ الارا ہوتی ہے۔ پچھلی تحقیقات میں جو سقم رہ گئے تھے انھیں بڑی کاوش سے دور کرتے ہیں۔

اس طرح زیدی اب تک کوئی ۳۰ کتابوں کے مصنف اور مولف بن چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی (۳۸) کتابوں پر مقدمے اور ۲۰ کتابوں پر تبصرے لکھے۔ ان کے جملہ مضامین کوئی ۱۵۰ ہیں جو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔

عزم صاحب نے بڑی محنت اور بڑے عزم کے ساتھ کام کیا۔ اپنی تحقیق میں انھوں نے نہ صرف زیدی سے انٹرویو لیا بلکہ ان کی ساری کتابیں، وہ بھی جو ابھی زیر طبع ہیں پڑھ ڈالیں۔ سبھی مضامین چھان ڈالے۔ اور زیدی پر جو کتابیں لکھی گئی وہ کچھ کم نہیں ہیں۔ ان سب کو انھوں نے چھان ڈالا ہے اور یہ کتاب قارئین کے سامنے پیش ہے۔

علی جواد زیدی کی حیات کے بارے میں بڑی جستجو سے مواد حاصل کیا ہے۔ ان کے عہد کا، جو ملک کی آزادی کی تحریک کا بڑا دھماکو عہد رہا ہے، بڑی کوششوں سے جائزہ لیا ہے۔

پھر علی جواد زیدی کی شاعری، تنقید و تحقیق، تدوین اور تالیف کا بھی تفصیلی محاسبہ کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں عزم صاحب نے ان کتابوں کا حوالہ دیا ہے جن کا انھوں نے اس مقالے کے لیے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ یہ کتابیں ۵۲ ہیں۔ رسائل، اخبارات اور خطوط کی فہرست ۴۰ تک جاتی ہے۔

محنت اور کاوش کا اندازہ کیجیے۔ پھر کتاب پڑھیے تو آپ کو عزم کی پختہ ادبی حیثیت کا قائل ہونا پڑے گا۔

عزم صاحب نے انجمن ترقی پسند مصنفین میں زیدی کی سرگرمیوں، اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں ان کی تگ و دو و کانگریس کی تحریک میں ان کے حصے پر کافی محنت سے مواد اکٹھا کیا ہے اور سپرد قلم کیا ہے۔

زیدی پر بہتوں نے اور اچھے اچھوں نے لکھا ہے لیکن عزم کی کتاب سب سے الگ اور افضل ہے۔

ان کی پیش رووں نے زیدی کے ایک یا دو پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے لیکن عزم نے

ان کی پوری شخصیت کا احاطہ کیا ہے اور ان کی کرشماتی شخصیت کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

اس کتاب کی ایک متاثر کن صفت یہ ہے کہ عزم صاحب نے علی جواد زیدی کی تصنیفات اور تالیفات کا ایک مختصر جائزہ بھی پیش کیا ہے اور پڑھنے والوں کی تشنگی بڑھادی ہے کہ وہ ان کتابوں کو حاصل کریں اور پڑھیں۔ کیوں کہ ان کتابوں کی اہمیت بھی بتادی ہے اور ان حقایق پر سے پردہ اٹھایا ہے جو ان کتابوں میں مذکور ہیں اور جنھیں ہر پڑھنے والا پڑھنے کے لیے ترسے گا۔

پھر زیدی نے ہندی میں دو کتابیں لکھی ہیں۔ انگریزی میں ۱۰ کتابیں تحریر کی ہیں۔ وہ سنسکرت سے بھی واقف ہیں۔ اور اس سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔

علی جواد زیدی کا ترقی پسند تحریک سے تعلق رہا ہے اور اس کے آتار چڑھاؤ میں شریک رہے ہیں لیکن عزم صاحب نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی ساتویں کانفرنس (حیدرآباد مئی ۵۶ء) کو "آخری کانفرنس" کہا ہے۔

میں عزم صاحب سے معذرت کے ساتھ یہ گستاخی کررہا ہوں کہ ادب کی تاریخ میں بہت سی تحریکیں اور تصورات پروان چڑھے۔ کچھ ختم ہوگئے اور کچھ اپنے رحجانات ادب پر مستقل طور پر مرتسم کردیے۔

تخلیقی ادب سماج کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے۔ اور ان سب ہواؤں سے جو سماج پر چلتی ہیں اثر لیتا ہے رد بھی کرتا ہے اور قبول بھی۔

اور یہ روایات جاری ہیں۔

پھر ہر ادبی تحریک نے اچھے اور کمزور دونوں ہی طرح کے ادب اور ادیب پیدا کئے ہیں۔ لیکن ہم اچھے ادیبوں کی تخلیقات کو لے کر جائزہ لیتے ہیں۔

آزادی کی تحریک میں ترقی پسند ادبی تحریک کا ایک بڑا حصہ ہے اور یہ رحجان آج بھی زندہ ہے اور تحریک اور تنظیم بھی۔ لیکن اس کی ہئیت میں تبدیلی آئی ہے اور یہ لازمی امر ہے۔

آج ترقی پسندی اپنے وسیع تر معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ انسان دوستی، سماج کا بھلائی کے راستے ارتقاء، کرب کا اظہار اور طرب کے حصول کے لیے سمت کی نشان دہی یہ ادیب کے فرائض میں داخل ہوگئے ہیں۔ اور یہ سب ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔

آج ہم ترقی پسندوں سے بھی ایک حد تک مشکوک ۔ انقلابی ادیبوں کی تحریک بھی دیکھ رہے ہیں ۔ دلت ادب پیدا ہورہا ہے ۔ جو سماج کے پچھڑے ہوئے طبقات کی بیداری کا مظہر ہے ۔

غرض یہ سب دروازے سماجی کشمکش نے کھول دیے ہیں ۔

قصہ مختصر ۔ مرم صاحب نے جو ہماری انجمن ترقی اردو کی ضلع نلگنڈہ کی شاخ کے صدر بھی ہیں ۔ بہت محنت سے یہ کتاب لکھی ہے ۔ اور یہ بھی ایک نیک شگون ہے کہ انجمن کے کل ہند جنرل سکریٹری ۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی موجودگی میں ۔ انجمن کی آندھراپردیش شاخ کے ۲۶ ویں کنونشن میں ۱۴ / نومبر کو اس کی اجرائی عمل میں آئی ۔

کتاب قارئین کے ہاتھ میں ہے ۔ وہ خود فیصلہ کریں ۔

نام کتاب : حرف تنہا مصنف : رمیش تنہا

ضخامت : ۱۰۶ صفحات قیمت : ۱۰۰روپے

ناشر : ودیا پرکاش۔ ای۔۷۷۔ مہانسرودوا پارک۔ شابورہ۔ دہلی ۱۱۰۰۳۲

تبصرہ نگار : ابوالفیض سحر

" حرف تنہا " حال میں ہی منظر عام پر آئے شعری مجموعوں میں ایک خاص لب و لہجے اور ایک خاص نہج کے حسی و بصری پیکروں کا مجموعہ ہے جو ایک سنجیدہ کیفیت احساس و اظہار کے ساتھ، جدید مزاج و فکر کے شاعر رمیش تنہا کا نقش اول ہے۔ رمیش تنہا نے جہاں نئی شعری جمالیات سے استفادہ کیا ہے وہیں نئی غزل کی اشاریت اور معنویت کی نئی فضاؤں اور سمتوں سے بھی رشتہ جوڑا ہے۔ اور بہ حیثیتِ مجموعی فکر و فن کے نئے رنگ و آہنگ کی نئی آواز بن کر نمایا ہوئے ہیں۔

" حرف تنہا " کے انتساب نے بھی متوجہ کیا۔ خوب ہے۔ یکتا اور تنہا سا۔ اخلاص و محبت کے پیوستہ بنیم تووں کی ادب نواز ٹھنڈک میں۔ رمیش تنہا کو ودیعت ہوئی میراث اور اس کی قدر و قیمت نے ایک احساسِ جمال کے ساتھ تفکر پوش نظری رجحان بن کر ان کی کردار سازی کی ہے۔

انتساب / والد محترم / پنڈت بخشی رام کوشک (مرحوم) / اور والدہ محترمہ / شریمتی ودیاوتی (مرحومہ) / کے نام / جو شاعری (کویتا) کو اننت مینہ کا پھل / ملتے تھے /اور / اپنے بچوں میں یہ جوہر دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔

شعر تو سبھی شاعر کہتے ہیں لیکن شعر کی کسوٹی پر پورا اترنے اور نکھرنے والے شعر کہنے کا سلیقہ اور ملکہ بہت کم شاعروں کے حصہ میں آتا ہے۔ رمیش تنہا کو شعر کہنے کا سلیقہ بھی ہے اور ملکہ بھی۔ نئے تناظر اور نئی معنویت رمیش تنہا کی شاعری کا ایک روشن پہلو ہے۔ جدید فنکارانہ طرز احساس کی غماز شعریت کی چند مثالیں:

کبھی بادل تو کبھی دودِ پریشاں کہہ کر
بحر و کہسار و بیاباں نہ اڑاتا ہے مجھے

گھٹن ہی شہر کا کردار بن گئی تھی وہاں
ہوا کا نام بھی لیتے تھے لوگ ڈرتے ہوئے

رمیش تنہا کی شعریات کی پہچان بھی اچھوتے اور تازہ تازہ، شعری پیکروں سے عبارت ہے جس میں فکر کی آنچ بھی ہے اور فن کی رچائیت بھی۔ جمالیات کے نئے اوراق پر رقم ان نئی عبارتوں میں نئے تجربات اور مشاہدات و محسوسات کی کبھی گرم اور کبھی نیم گرم سانسیں اور دھڑکنیں ایک سنجیدہ اور شائستہ لہجے میں سنائی دیتی ہیں۔ اس قبیل کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں انہیں سے ان کے جدید لب و لہجے سے تعارف بھی ہوتا ہے جیسے ؂

چپے چپے پر ہے پہرہ دھوپ کا ہر کرن جیسے کہ نیزہ دھوپ کا
دیکھ کر گستاخ سائے آس پاس تمتما اٹھا ہے چہرہ دھوپ کا
برف مٹی برف مدفن برف جسم کیا کرے گا اس پہ کتبہ دھوپ کا
روشنائی کوئی تو ہو جس سے تجھ کو ہر اک زبان میں لکھوں
اندھیرے چیخ رہے ہیں بڑی اذیت سے حصار چیر کے شب کا نکل گیا سورج

فکر و احساس کی تازگی اور شعری رویوں کی تازہ کاری فنکار کی عصری حسیت کی بھی پہچان ہوتی ہے۔ اس زاویہ نگاہ سے جب ہم رمیش تنہا کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایسی مثالیں بھی مل جاتی ہیں ؂

آئینے آج کی تہذیب کے سب پتھر ہیں
پھر سے ڈھونڈو مرے ماضی کے حوالو مجھ کو
آیا ہے پلک پر یہ احساس سے اٹھ کر
یہ سیپ کا موتی ہے یہ پانی تو نہیں ہے
مرے آگے سے ہٹا بھی لو یہ اپنا سورج
روشنی مانگ کے ہوتا ہے درخشاں کوئی ؟

ایسا لگتا ہے کہ رمیش تنہا کا میلان سخن کا میدان، بنیادی طور پر غزل ہی ہے مگر انھوں نے دیگر اصناف شعر میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اچھے نقش بنائے ہیں جن میں حسن

بھی ہے اور معنویت بھی۔

زیر نظر مجموعے میں کچھ نظمیں بھی ہیں، قطعات، رباعیات اور دوہے بھی۔ نظموں میں بھی رمیش تنہا کے مزاج کی گہری سنجیدگی نمایاں ہوتی ہے جو کبھی فلسفیانہ روش اختیار کرجاتی ہے تو کبھی نفسیاتی انداز فکر کا پیراہن اوڑھ لیتی ہے اس سے شاعر کے سوچتے ہوئے ذہن کا پتہ مل جاتا ہے۔

"سنبلیِ ہستی" ان کی ایک خوبصورت نظم ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

اگر فقط خالی خالی آنکھوں سے
ہم خلا کی طرف
یونہی دیکھتے رہیں گے
اگر یونہی اپنے دست و بازو
سدا سے کاہل بنے ہوئے سے
جہاں پڑے ہیں پڑے رہیں گے
تو یہ اندھیرے نہیں چھٹیں گے
یہ غم کے بادل نہیں چھٹیں گے

ایک اور نظم "لگن" کا آخری بند، جو پنڈت جواہر لال نہرو کی تصویر دیکھ کر شاعر کے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے اور ایک گہری تاثر پذیری اور عقیدت کا مظہر ہے، یوں ہے

وہ مگر چلتا رہا / اس کو اب رکنا نہ تھا / اس کی آنکھوں میں / بشارت تھی نئی دنیاؤں کی / دور سے اس کو بلاتا تھا کوئی / اس نے دیکھے تھے سنہرے خواب / اک پھولوں بھری / مضمون بھری / وادی کے / وہ چلتا رہا / چلتا رہا۔

توجہ اپنی طرف منعطف کرانی والی منظومات کے سلسلے کی ایک اور کڑی ہے وہ نظم بھی جس کا عنوان ہے "اہل وطن کے نام" اس کا ایک حصہ جو اردو کے اس مزاج کے عین مطابق ہے بلکہ اس کا نمائندہ ہے جو آفاقی خلوص و محبت اور انسان دوستی کا پیغام دیتا ہے۔

احساس مساوات کی نزہت باٹیں   اخلاص و مدارات کی دولت باٹیں

باٹیں گے تو یہ اور زیادہ ہوگی   دل کھول کے آپس میں محبت باٹیں

" حرف تنہا " کا آخری حصہ ، دوہوں پر مشتمل ہے ۔ رمیش تنہا نے غزلیں خوب کہی ہیں، نظمیں بھی خاصی اچھی ہیں ۔ پھر قطعات اور رباعیوں کے بعد دوہے بھی کافی کہے ہیں ۔ ان کے دوہوں میں ایسی مثالیں بھی کافی مل جاتی ہیں جن میں احساسات و تجربات کے فرازوں میں کھڑے انسان کے ایک خاص مزاج اور کیفیت کے شعر اپنے مخصوص فضا کے بالوں کے ساتھ موجود ہیں جیسے ؎

رام چندر اور جانکی لچھمن اور ہنومان
ان کا پریم اہنسہ تھا ان کا تیاگ مہان

○

دیکھوں تو مکھڑا ترا گھونگٹ کے پٹ کھول
میں بھی رکھتا ہوں زباں تو بھی تو کچھ بول

○

درپن کو جھوٹا کہے ہے کتنا ہے نادان
انسان کو بھی ہے کہاں خود اپنی پہچان

اور اب آخر میں بھی وہی بات کہوں گا جس کی طرف ابتدائی حصے میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ انھیں اردو شاعری ہی سے نہیں ، اردو زبان اور اردو تہذیب سے فطری لگاؤ کے ساتھ سچا عشق بھی ہے جس کی مبارک روایت انھیں ان کے اسلاف سے بھی ملی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ضمیر اور خمیر سے آج بھی یہی آواز اٹھ رہی ہے

جو میں اردو زبان میں لکھوں   ہو وہی حرف معتبر تنہا

مجھے امید ہے کہ رمیش تنہا جیسے کھری سوچ و فکر رکھنے والے شاعر کا مجموعہ کلام " حرف تنہا " اردو کے ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائیگا ۔

● ☆ ●

تبصرہ

نام کتاب : دل کا موسم (شعری مجموعہ) ◆ نام شاعر : مختار احسن انصاری

مبصر : ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد

روایتیں معتبر بھی ہوتی ہیں اور غیر معتبر بھی، اس لئے ان کا احترام بھی ضروری ہے اور ان سے انحراف بھی مستحسن ہے۔ تقلید اگر جامد بن جائے تو زندگی کی رنگارنگی میں اضافہ نہ ہوگا۔ اجتہاد اگر آئے دن کا معمول ہو جائے تو وہ بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی، جن پر ہم کھڑے ہیں۔ زندگی ہو یا ادب دونوں کی ترقی کا راستہ کہیں درمیان سے نکلتا ہے۔ نئی جہتوں اور نئے امکانات کی تلاش میں اگر ہمارا رشتہ ماضی کی صالح روایات سے ٹوٹ جائے تو ہمارا وجود ہوا میں معلق ہو جائیگا اور اگر ہم صرف پرانی روایات ہی کی پاسداری کرتے رہیں تو زندگی اور ادب کی قوتِ نمو ختم ہو جائے گی اور نئے پھول کھل نہ سکیں گے۔ مختار احسن انصاری کا مجموعہ کلام "دل کا موسم" خیر الامور اوسطھا کی بہترین مثال ہے۔

مختار احسن انصاری کا زیر نظر مجموعۂ کلام میں نے تفصیل کے ساتھ پڑھا ہے۔ باوجود اس کے کہ ان کی غزلوں کی تخلیق کی تاریخی ترتیب کا مجھے علم نہیں ہے مگر میں بڑے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ان کا فنی اور فکری شعور ارتقا پذیر ہے۔ ان کی تشکیل فکر میں جو موج تہہ نشین ہے وہ مذہب اور اخلاق کی اعلیٰ وارفع قدروں کی ہے جس میں گردو پیش کے واقعات کی لہریں آکر مل گئی ہیں۔ وہ حُسن کے اداشناس اور کاروبار شوق کے سفر آشنا ہیں۔ مگر ان کا تخلیقی رویہ روایتی معاملہ بندی سے گریز کر کے دور حاضر کی نفسیات کے پس منظر میں عشق کو مہذب بھی بناتا ہے۔ ان کے احساسات کوئی عالم بالا کی چیز نہیں ہیں بلکہ اسی

زندگی کی سطح پر ابھرنے والی لہریں ہیں۔ غزل کی ریزہ خیالی جا بجا ان کے مذہبی معتقدات جو ان کی گھٹی میں رچ بس گئے ہیں، کا راز فاش کرتی ہے اور اس طرح کے اشعار ہم کو دے جاتی ہے جو بذات خود ایک سعادت سے کم نہیں ہیں۔

اگر چہ داغؔ ہوں، غالبؔ ہوں، میرؔ و ذوقؔ بھی ہوں — مگر میں ہند میں حسانؓ بن کے رہتا ہوں

وہ لوگ کیا ہوئے کہیں ان کا پتہ نہیں — مسجد کو دوڑتے تھے کبھی جو اذان پر

مختار احسن انصاری کے کلام میں اخلاق و معارف اور بصائر و تاملات کے جو پہلو پیدا ہوئے ہیں ان میں انہیں صالح روایات کا دل دھڑک رہا ہے جو صدیوں کے نشیب و فراز کو طے کر کے آج بھی ہمارے معاشرہ کا معتبر ورثہ ہیں۔ انسانی ہمدردی دنیا کے حسن میں اضافہ کرنے کا جذبہ، کارِ خیر اور دور تک روشنی پھیلانے کا عزم اپنی تہذیبی اقدار کا احترام یہ ایسے جذبات و احساسات ہیں جو رنگ و نسل، مذہب و ملت اور جغرافیائی خدبندیوں سے بالاتر ہو کر تمام عالمِ انسانیت کی میراث تصور کئے جاتے ہیں۔ ان جذبات و احساسات کا خمیر چاہے مذہب کے حوالے سے اٹھا ہو، چاہے تہذیب و تمدن کے حوالے سے نہ تو ان کی آفاقیت میں شبہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ان پر ایمان لائے بغیر رہا جا سکتا ہے۔ کون کافر ہے جو ان اشعار کی موضوعاتی کشش سے انکار کرے۔

پھر گھنے پیڑ کے سائے کی تمنا کرنا — دھوپ میں جلتا ہے کس طرح شجر دیکھ تو لے

بزرگوں کی اپنی صداقت بھی لاتے — خلوص و محبت، شجاعت بھی لاتے

تحریر کریں ہم نئی تاریخِ محبت — اب صفحۂ نفرت کا ہر اک لفظ مٹا دیں

''حدیثِ حسن'' ہماری غزلوں کا طرۂ امتیاز رہی ہے مگر مختلف شعراء کا نظریۂ عشق مختلف رہا ہے۔ یہاں پاک دامنی اور پاکبازی کی بھی جلوہ فرمائی رہی ہے اور عیاشانہ اور ہوس کارانہ طرز فکر کا بھی اظہار ہوا ہے۔ یہاں میرؔ کے تہذیبی عوامل بھی رہے ہیں اور داغؔ کی بے باکی شوخی اور جسمانی محبت کا بھی اعلان ہوا ہے۔ محبت کرنا نہ تو کوئی الہامی بات ہے اور نہ کوئی غیر فطری عمل اور غزل کا شاعر تو چاہے عملی زندگی میں اس سے محروم رہا ہو مگر بغیر عشقیہ جذبات کے اظہار کے غزل نہ تو ''اردو شاعری کی آبرو بن سکتی ہے'' اور نہ ''نیم وحشی

صنفِ سخن''۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مختار احسن انصاری اپنی تمناؤں کی معراج پر پہنچ چکے ہیں مگر میں بڑے اعتماد سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ ان کی غزلوں میں کہیں کہیں پر روایت ذاتی تجربات میں ڈھل کر بہت ہی خوبصورت اور دِل نشین بن گئی ہیں۔ ماضی کے مقدس آتش خانوں کی آنچ جب تجربات اور مشاہدات کی دھوپ سے ملتی ہے تو حسن و عشق کی ہم آہنگی میں زندگی کے جو صحت مند عناصر مضمر ہوتے ہیں وہ اس قوس و قزح کے مانند ہوتے ہیں جو دھوپ کی بارش میں طلوع ہوتی ہے۔ ذرا ان اشعار کو دیکھئے کیا یہ محض روایت کے احترام میں کہے گئے ہیں یا تجربات کی وادیوں میں سینے کے بل چل کر ان کی تخلیق کی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

اک ناگ محوِ رقص تھا صندل کی شاخ پر شہنائیاں وہاں تھیں یہاں رات آخری

آؤ گلے مل لو اب ہم سے دل کی مبارکباد تو لو ہاں تم جیتے مان گئے ہم، آج ہماری مات ہوئی

جھکا کے گردن و بازو بہت آہستہ چلتا ہے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب گھر سے نکلتا ہے

ذات اور ماورائے ذات دونوں پر ان کی نگاہیں ہیں اور وہ عہد حاضر کے کھردرے اور سنجیدہ مسائل کو غزل کے نازک فنی آبگینے میں اس طرح ڈھالتے ہیں کہ جگ بیتی آپ بیتی اور ایک دور کی حقیقت ہر دور کی حقیقت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ عہدِ حاضر کی معتبر دستاویز سیاست دانوں کے اقوال کے بجائے شعراء کے اشعار سے مرتب ہو تو زیادہ صحیح اور حقیقت پر مبنی ہوگی، مختار احسن انصاری نے اپنے کلام کی تہ داری سے بہت سے ایسے مسائل اور واقعات کی طرف اشارہ کئے ہیں جن سے ہمارا دور معنون و منسوب رہا ہے۔

ہم پیالہ قاتل و منصف نظر آتے ہیں اب احسن اپنا اب یقیناً فیصلہ ہو جائے گا

الزام کس کو دیتا وہاں اپنے قتل کا سب زیرِ آستین تھے خنجر لئے ہوئے

گواہ اپنے بیانوں سے پھر گئے ورنہ میں اپنے جرم کا اقرار کرنے والا تھا

وہ اک جنازہ جس پہ ہے اردو لکھا ہوا وہ جا رہے ہیں قوم کے رہبر لئے ہوئے

مختار احسن انصاری سرخیٔ لہو کو رنگ حنا اور نالۂ سحر گاہی کو نغمۂ شب میں تبدیل کرنے کا ہنر اچھی طرح جانتے ہیں۔ ماحول جب ''جنت آثار'' ہو تو غزل کہنا آسان ہے مگر

م نما گر دو پیش میں نغمہ سرائی اور غزل خوانی کرنا اچھے فنکاروں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ مختار احسن انصاری سرکاری ملازم ہیں اور ملازمت کے جو ضابطے ہیں ان کے پابند رہتے ہوئے سرکار کے ظلم وجور کو محبوب کے جور و ستم میں بدل لینے کا گر، فن کے حوالہ سے خاطر خواہ جانتے ہیں۔ جستجو و آرزو، تلاش و تفتیش اور اثبات و تحقیق ان کی ملازمت نے ان کو سکھلایا ہے اور یہی چیزیں جب اشعار کے پیکر میں ڈھل جاتی ہیں تو غمِ دیگراں، غمِ جاناں میں تبدیل ہو جاتا ہے اور کا کلِ ہستی کا پیچ و تاب زلفوں کے پیچ و خم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مختار احسن انصاری کی پذیرائی ادبی حلقوں میں ہو گی یہ میرا اعتقاد بھی ہے اور پیش گوئی بھی۔

تحقیقات

مصنف: محمد نسیم الدین فریس   مبصر: علیم صبا نویدی

گذشتہ دہائی میں سرزمین دکن سے ابھرنے والے باصلاحیت محققوں اور نقادوں میں ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس کا نام سرفہرست ہے۔ نسیم الدین فریس کو اپنے ہم عصر ادیبوں میں اس لیے بھی فوقیت اور اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے دکنی اور دکنیات کو بطور خاص اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔

محمد نسیم الدین نے ایک طرف جامعہ عثمانیہ کے قابل اساتذہ سے فیض حاصل کر کے ایم۔ اے کی سند اور طلائی تمغے حاصل کیے ہیں تو دوسری طرف مرکزی جامعہ حیدرآباد سے پروفیسر گیان چند جین جیسے مشہور محقق کی نگرانی میں "دکنی ادب کی مخصوص صوفیانہ شعری اصناف" کے موضوع پر مقالہ سپرد قلم کر کے ماسٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ حال ہی میں انھوں نے "۱۸ویں صدی کی دکنی شاعری" کے زیر عنوان مقالہ سپرد قلم کر کے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ہے۔

"تحقیقات" نسیم الدین فریس کی پہلی کتاب ہے جو آندھراپردیش اردو اکیڈمی کی مالی امداد سے منظر عام پر آئی ہے۔ اس کتاب کے بیشتر مضامین مختلف اوقات میں ہندو پاک کے موقر ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ چند مضامین ایسے بھی ہیں جو پہلی بار اسی کتاب کے ذریعہ منظر عام پر آرہے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر سارے مضامین دکنی شعر و ادب کے تنقیدی اور تحقیقی جائزے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پہلا مضمون فن ترقیم میں غواصی کی ایک غزل سے متعلق ہے۔ نسیم الدین فریس اطلاع دیتے ہیں کہ فن ترقیم میں غواصی کی یہ غزل پہلا معلوم نمونہ ہے جس میں شاعر نے اصول ترقیم کے مطابق اشعار میں الفاظ کے بجائے ہندسے اور اعداد استعمال

مبصر: 26 امیر النساء بیگم اسٹریٹ، ماونٹ روڈ، چنائی۔ 600002

کیے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں قیمتوں کا اظہار کیا گیا ہے اور حروف یا الفاظ مخفی رکھے گئے ہیں اور جب ہم قیمتوں کی مدد سے حقیقی لفظوں تک پہنچتے ہیں تو غزل کی معنویت اور تہہ داری سامنے آتی ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر لکھتے ہیں:

"فن ترقیم میں غواصی کی ایک غزل جو اس کے مطبوعہ دیوان میں شامل ہے۔ محمد بن عمر (مرتب دیوان) اور ڈاکٹر زور (مقدمہ نگار) دونوں کے لیے معمہ بنی رہی ۔۔۔۔ لیکن فریس کی دور بین نظر نے نہ صرف اس غزل کے متن کی تشکیل جدید کی بلکہ اسے ایک بامعنی غزل بھی بنادیا۔ اس غزل سے غواصی کے کمال فن اور فریس کی دقت نظر دونوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔" (تحقیقات صفحہ ۹)

دوسرے مضمون میں دکنی چکی ناموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے مضمون میں دکنی شاعری میں "سی حرفی کی روایت" سے بحث کی گئی ہے۔ اپنے موضوع پر یہ ایک بھرپور مقالہ ہے۔ بقول پروفیسر گیان چند "اب تک اہل اردو یہ سمجھتے تھے کہ سی حرفی دکنی، پنجابی یا قدیم ہندی کی صنف ہے۔ نسیم الدین کچھ اور پیچھے جاکر یہ چونکا دینے والا انکشاف کرتے ہیں کہ یہ قدیم عبرانی اور عربی شاعری میں بھی پائی جاتی تھی۔ اس کے لیے وہ کیسے کیسے غیر متوقع اور غیر روایتی ماخذ سے استفادہ کرتے ہیں۔" (سب رس مئی ۹۴، صفحہ ۳۵)

تحقیقات کے آخری تین مضامین "دکنی ادب کی چند متروک اصناف" "ایک نایاب چرخہ نامہ" اور "شاہ علی جیوگام دھنی اور ان کی جکریاں" ہیں۔ ان مضامین کے مطالعہ سے بھی نسیم الدین کی تحقیقی ژرف نگاہی اور تنقیدی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ خصوصا دکنی ادب کی متروک اصناف اس سلسلے میں خاصے کی چیز ہے۔ محمد نسیم الدین کو دکنی زبان و ادب پر خاصہ درک حاصل ہے۔ ان کا تحقیقی استدلال انتہائی سادہ اور موثر ہوتا ہے۔ وہ تحقیق جیسے خشک موضوع کو دلچسپ اور پر اثر بنانے کا ہنر جاتے ہیں۔ وہ اپنا تحقیقی مواد صرف مطبوعہ کتابوں یا رسائل و جرائد سے ہی حاصل نہیں کرتے بلکہ قلمی بیاضوں اور مخطوطات کے سمندر کی غواصی کے ذریعہ بھی در نایاب یکجا کرتے ہیں۔ تحقیقات کے مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد انورالدین رقم طراز ہیں:

"یہ مقالات نہایت مبسوط وقیع اور عالمانہ ہیں ان سے مصنف کی دقیقہ سنجی،

ژرف نگاہی مطالعہ کی وسعت اور مشاہدہ کی باریکی کا پتہ چلتا ہے ۔ زبان کی قدامت ۔ اسلوب کی غرابت اور مخطوطات کی قرات کے دشوار گزار مراحل دکنی تحقیق کا لازمہ ہیں ۔ زیر بحث مجموعہ مضامین کے مصنف نے نہایت حوصلے اور جی داری سے تحقیق کی یہ منازل ہفت خواں طے کی ہیں ۔ تحقیقات کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ مصنف نے اصل مخطوطات تک رسائی حاصل کی ہے اور نہایت تفحص و احتیاط اور صبر و تحمل کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ان مضامین کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے سائنٹفک طرز استدلال اور معروضی نقطہ نظر کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ۔ "(فکر و نظر ۔ ص ۷۷ ۔ ۷۰)

غرض "تحقیقات" دکنیات کے باب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے ۔ میں اپنی بات کو پروفیسر گیان چند کے الفاظ پر ختم کرتا ہوں :

"دور حاضر کے ادیب اور قاری دکنی ادب سے ایسی مغائرت محسوس کرتے ہیں کہ دکنی سے متعلق کسی کتاب یا مضمون کو پڑھنے والے شمال میں تو درکنار دکن میں بھی معدودے چند ہیں ۔ دکنی محققین کم ہوتے جارہے ہیں معتبر محققین اور بھی کم ۔ ضرورت ہے کہ بزرگوں کے اٹھتے جانے کے ساتھ خوردوں کی نئی نسل ان کی جگہ لینے کے لئے اگتی جائے لیکن خلا زیادہ ہے پر کرنے والے کم ۔

(سب رس ۔ حیدرآباد ۔ مئی ۹۴ ، صفحہ ۳۹)

☆ ☆ ☆